پیش لفظ

مختصر تعارف تاریخ ہزارہ

یہ کتاب تاریخ ہزارہ کی جلد اوّل ہے، جو ترکوں کے اولین جلیل القدر مسلمان حکمران سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے قبل کے ہندو بُدھ دور سے لے کر ترکوں کے زوال اور درانیوں کی پیشقدمی تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ دَور نہ صرف ہزارہ قدیم بلکہ تمام برِصغیر ہندو پاکستان میں اسلامی تہذیب کے غلبے کا دور تھا، مگر بدقسمتی سے علاقائی تواریخ مرتب کرنے والے مصنفین ہی میں سے کسی نے اس دور کی تاریخ مرتب کرنے پر توجہ نہ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف عوام بلکہ کافی حد تک تعلیم یافتہ حضرات بھی اس دور کو تاریکی کا دور سمجھنے لگے جو درحقیقت مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا درخشندہ دور تھا۔

اس کتاب میں تاریکی کے ان پردوں کو چاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پہلی بار ترکوں کے عہد کی سرگزشت ایک تاریخی تحقیق کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ اس دور میں اہل ہزارہ کی تمام قدیم اقوام مثلاً گوجر، آوان، ڈھونڈ، کرڑال، بمبہ، دلازاک، تنولی، سواتی، ترین اور گکھڑ کی اصل اور ان کی آبادی پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

حسن اتفاق سے یہی اقوام پنجاب اور سرحد کے دیگر علاقوں میں بھی آباد ہیں، لہٰذا اس کتاب کا مطالعہ سب کے لئے نافع ہوگا جو اقوام ترکوں کے زوال کے بعد یہاں وارد ہوئیں مثلاً علی زئی، اتمان زئی، طاہر خیلی اور مشوانی وغیرہ ان کے حالات انشاء اللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے جو سکھوں اور انگریزوں کے عہد بلکہ دورِ جدید تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔

انگریزوں کے عہد سے قبل میدانِ ہزارہ قارلق چوراسی دیہات پر مشتمل محض ایک پرگنہ تھا۔ ترکوں کے عہد میں یہ پرگنہ اس ولایتِ پکھلی کا ایک حصہ تھا جو راولپنڈی، دریائے سندھ گلگت اور کشمیر میں بھولیاس کی گھاٹی تک کے تمام درمیانی علاقوں پر مشتمل تھی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اس ولایت کو پکھلی سرکار کے نام سے موسوم کیا گیا اور پرگنہ ہزارہ قارلق کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ فی الحال سرکار پکھلی کا کچھ علاقہ آزاد کشمیر میں اور زیادہ تر ضلع ہزارہ میں واقع ہے اب پکھلی صرف اس میدان کو پکارا جاتا ہے جو تحصیل مانسہرہ کے وسط میں واقع ہے۔ اور جو یہ ضلع ہزارہ کا ایک حصہ ہے۔ اس بنا پر مغالطے سے بچنے اور کتاب کو عام فہم بنانے کے لئے اس کتاب کا نام تاریخ ہزارہ تجویز کیا گیا ہے۔

آخری باب تیموری ترکوں کی دورِ غلامی کے حالات قلمبند کرنے کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

محمد ارشاد

ہری پور ہزارہ

جنوری ۱۹۷۶ء

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	تمہید	۱۳
۲	ولایت پکھلی	۲۳
	ہزارہ کی وجہ تسمیہ	۲۰
۳	قدیم تہذیبیں اور سلطنتیں	۳۲
	آریائی دور	۳۲
	ایرانی دور	۳۳
	یونانی دور	۳۴
	سنتھین یا ساکا دور	۳۶
	کشن دور	۳۷
	سفید ہن یا ہیطال	۳۸
	ترکی شاہیہ کابل	۳۹
	ہندو شاہیہ گندھارا	۳۹
۵	سیاسی اور معاشرتی زندگی	۴۴
۶	مذہبی زندگی	۵۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	خدا کے نام	۴۵
	جنت اور جہنم	۴۶
	فرشتے اور شیطان	۴۷
	ہندو علماؤ صوفیاء	۴۷
۸	باشندے	۵۲
	گوجر	۵۲
	آوان یا اعوان	۵۹
	دلازاک	۶۴
	ڈھونڈا اور سراڑہ	۷۵
	کرڑال	۷۸
	بمبہ	۸۱
۹	ترک اور مغل	۸۵
۱۰	سلطان محمود غزنوی کے حملے	۹۵
۱۱	سلطان محمد غوری کے حملے	۱۰۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۱	ترکوں کے مشہور شاہی خاندان	۱۰۴
	غزنوی خاندان	۱۰۴
	غوری خاندان	۱۰۵
	خاندانِ غلامان	۱۰۷
	خلجی خاندان	۱۰۸
	تغلق خاندان	۱۰۹
	مغلیہ خاندان	۱۱۰
۱۲	خطِ تاریخ (پچھلی)	۱۱۳
۱۳	ترکی فتوحات کے اسباب	۱۱۵
۱۴	اسلامی تہذیب کا غلبہ	
	اشاعتِ اسلام	
	قانون	۱۱۸
۱۵	صاحبقران امیر تیمور کورگان کا حملہ	۱۲۰
	تیموری حملے کے اسباب	۱۲۳
	حالات ۔ نتائج ۔ نظامِ حکومت	۱۲۶
	شخصیت و کردار	۱۲۷
۱۶	قرلق ترکوں کی آبادکاری	۱۳۱
۱۷	امیر تیمور سے ابوسعید سلطان تک	۱۴۳
۱۸	تیموریوں کا زوال	۱۴۴
۱۹	تنولی	۱۴۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	تنولیوں کی اصل	۱۴۸
	تنولیوں کی آمد	۱۵۰
۲۰	سلطان شہاب الدین بابر	۱۶۱
۲۱	سلطان فقیر الدین دریا شاہ	۱۶۵
۲۲	سلطان غیاث الدین عبداللہ شاہ	۱۷۱
	میرزا حیدر ترک کا حملہ	۱۷۲
	کجو خان یوسف زئی	۱۷۴
	دلازاکوں کی آمد	۱۷۶
۲۳	سلطان محمود کلاں	۱۷۷
	غازی چک کا حملہ	۱۷۷
	سلطنتِ مغلیہ سے الحاق	۱۸۰
۲۴	سلطان نصیر الدین حسین خان	۱۸۲
	اکبری فوج کا حملہ	۱۸۴
	پچھلی سرکار کی تشکیل	۱۸۷
	تحریکِ روشنائی	۱۹۳
	حسن بیگ بدخشی کا انجام	۱۹۵
۲۵	سلطان شادمان خان	۱۹۷
	مہمات بلخ و بدخشان	۱۹۸
	سرحدی بغاوت	۲۰۲
۲۶	سلطان محمود خورد	۲۰۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی	۲۰۵
	سرحدی شورش	۲۰۸
	چھاچھل پر یوسف زئیوں کا حملہ	۲۱۰
	شہنشاہ کی آمد	۲۱۳
	سلطان محمود کی گم شدگی	۲۱۶
۲۷	ہزارہ قارلق کی تقسیم	۲۱۸
۲۸	دیوان راجہ فقیر محمد (المعروف دیوان راجہ بابا)	۲۲۳
۲۹	ترکوں کا زوال	۲۳۷
	خانہ جنگی	۲۳۸
	سلطان مقرب خان کی شورش	۲۴۰
	قبائلی یلغار	۲۴۲
۳۰	گکھڑ	۲۴۶
	گکھڑوں کی اصل	
	فہرست خانوادہ ہائے گکھڑاں	۲۵۲
	ہزارہ قارلق میں گکھڑوں کی آبادکاری	۲۵۴
۳۱	سید جلال بابا	۲۵۸
۳۲	سواتی	۲۶۳
	سواتیوں کی اصل	۲۶۳
	پکھلی میں سواتیوں کی آمد	۲۶۸
۳۳	ترین	۲۷۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	ترینوں کی اصل	۲۷۳
	ہزارہ قارلق میں ترینوں کی آبادکاری	۲۷۸
۳۴	درانیوں کا غلبہ	۲۸۴
۳۵	حضرت میاں کنگال صاحب	۲۹۱
۳۶	مشہور شہر اور قلعے	۲۹۴
	گلی باغ	۲۹۴
	بیدادی	۲۹۹
	چھاچھل یا چھالجل	۳۰۰
	دربند	۳۰۱
	شیروان	۳۰۲
	مانگلی	۳۰۳
	کوڑمنگ	۳۰۶
	دھتوڑ	۳۰۷
	مانکرائے	۳۱۱
	فتاغان	۳۱۵
۳۷	مشہور شاہراہیں	۳۱۷
۳۸	صنعت و حرفت	۳۲۰
	کیل سازی	۳۲۰
	شکر بازی	۳۲۱
	جندر اور پیکو بیلنا	۳۲۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	لُنگی سازی	۳۲۱
	فرنیچر سازی	۳۲۲
	پُھلکاری	۳۲۲
۳۹	لباس	۳۲۴
۴۰	رسم و رواج	۳۲۸
۴۱	عمارات	۳۳۰
۴۲	تفریحات	۳۳۱
۴۳	معاشرتی گروہ بندی	۳۳۲
۴۴	خطبہ و سکہ	۳۳۴
۴۵	ترک دُور غلامی میں	۳۳۷
	ترکی پٹی مانکرائے	۳۴۱
	پھر ہاڑی	۳۴۶
	نڑ توپہ	۳۵۳
	موہار کلاں	۳۵۵
	بانڈہ پھگواڑیاں	۳۵۸
	بجالی	۳۶۲
	گیروال	۳۶۵
۴۶	ہجرت کشمیر	۳۶۹
۴۷	مصنف کا شجرہ نسب	۳۷۱
۴۸	شجرہ نسب سلاطین پکھلی	۳۷۱
۴۹	شجرہ نسب خانوادہائے سلاطین پکھلی	۳۷۱
۵۰	نقشہ جات	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	نقشہ ولایت پکھلی	۱۶
	نقشہ توران	۴۰
	نقشہ پکھلی و علاقہ یوسف زئی	۱۷/۲۴
	نقشہ مانگلی	۲۴۹
	نقشہ گلی باغ	۲۴۰
	خاکہ تاریخ	۳۰
	خط تاریخ (پکھلی)	۱۱۳
	نقشہ مشرقِ وسطیٰ ساتویں صدی (ق م)	۲۹
۵۳	**تصاویر:**	
	عدالت قلعہ گلی باغ	۱
	تصویر مصنف	۹
	امیر تیمور دربار میں	
	سلطان محمود خورد کی قبر	۲۰۴
	دیوان راجہ بابا کی قبر	۲۲۲
	ترکانِ تیموری کا ایک گروہ قلعہ گلی باغ کے احاطے میں	۳۳۶
	ترکانِ تیموری کا ایک نمائندہ وفد قلعہ کی عدالت کے سامنے	۳۶۸

تمہید

علم تاریخ کی اہمیت اور اس کی افادیت کو علامہ اقبال مرحوم نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار میں بیان فرمایا ہے ؎

چیست تاریخ اے زِ خود بیگانہ
داستانے ؟ قِصّہ ؟ افسانہ
ایں ترا از خویشتن آگاہ کند
کارسازِ راہ و مرد و راہ کند
ضبط کُن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضیِ تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن از خوابی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

ان اشعار میں اس حقیقت کی واضح نشان دہی کردی گئی ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی میں علم تاریخ کو کتنا بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخ انسان کی اس سرگزشت کا نام ہے جو ہمیں عبرت کا درس دیتی ہے، جو کچھ پایا وہ کیسے پایا، جو کچھ کھویا کیونکر کھویا۔ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سے پردے اٹھاتی ہے اور ذہنوں میں وہ بصیرت پیدا کرتی ہے جس سے انسان زندگی کی صراطِ مستقیم کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ قومی وجود اور تہذیب

کی بقا کا دار و مدار بڑی حد تک تاریخ کی حقیقت پسندانہ تعبیر اور منصفانہ پیش کش پر ہے۔ جو قوم ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے، وہ بہت جلد کسی دوسری غالب قوم کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر اپنے وجود کو خطرے میں ڈال دیتی ہے؛ لہٰذا ہر باشعور گروہ کی یہ قدرتی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی سرگزشت کو نہایت محفوظ طریقے سے اپنی نئی نسل کے سامنے پیش کرے تاکہ نئی نسل ماضی کے تجربات کی روشنی میں نہ صرف اپنے حال کو سمجھ سکے، بلکہ مستقبل کی تعمیر کے لئے مناسب لائحہ عمل بھی اختیار کر سکے۔

انگریز اور ہندو ہماری شاندار تاریخ سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ہمارے اسلاف نے یہاں تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے کتنے سنہری کارنامے سرانجام دیئے ہیں، لیکن ان متعصب مصنفین کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی کہ اگر عہدِ اسلام کے کارناموں کو ان کی اصلی شکل میں نئی نسل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کی تمام تر ہمدردیاں لنڈن اور دار دھا کی بجائے مدینہ اور بخارا جیسے اسلامی مراکز سے ہوں گی، ان کی ساری وفاداریاں "مادرِ وطن" کی بجائے "دینِ حق" کے ساتھ ہوں گی اور اس طرح غلبۂ اسلام کا خطرہ بدستور باقی رہے گا۔ چنانچہ متعصب مؤرخین نے ہماری تاریخ کا ایک مسخ شدہ چہرہ ہی نئی نسل کے سامنے پیش کیا۔ قومی تاریخ کے وہ اہم خد و خال جو کسی کے چھپائے نہ چھپ سکتے تھے، بہر حال سامنے آ کر رہے، لیکن علاقائی تواریخ پر پردہ ڈالنے کی کوششیں نسبتاً زیادہ کامیاب رہیں۔ ہزارہ قدیم ہی کی تاریخ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ کیا آپ کو سکھوں اور انگریزوں کے دورِ غلامی سے قبل کے سینکڑوں سالہ ترکوں کے عہدِ اسلام پر آج ایک کتاب بھی دستیاب ہوتی ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جو مؤرخ بھی قلم اٹھاتا ہے، وہ صرف دورِ غلامی ہی کی تاریخ مرتب کرتا ہے اور ترکوں کے اس پُرشکوہ دور کو نظر انداز کر دیتا ہے جو درحقیقت مسلمانوں کی عظمت اور غلبۂ اسلام کا واحد دور ہے۔ اگر اس شاندار دور کو اسی طرح نظر انداز کیا جاتا رہا تو پھر ہماری تاریخ صرف دورِ غلامی ہی کی تاریخ باقی رہ جائے گی۔ اگر انگریز اور ہندو ترکوں کے عہد پر تاریکی کے پردے ڈالتے رہے، تو وہ ان کی سیاسی حکمتِ عملی کا تقاضا تھا؛ لیکن سوال یہ ہے کہ آج ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی ان تاریکی کے پردوں کو چاک کرنے کی فکر کیوں نہ کریں۔ اس تغافل کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عہدِ اسلام پر پہلے سے موجود کوئی تاریخی تحقیق میسر نہیں اور ہمارے سہل پسند مصنفین از سرِ نو تحقیق و مطالعہ کی دشواریوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔

یہ حقیقت کسی بھی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں کہ کشمیر، ہزارہ قدیم اور گندھارا میں اسلام کا تعارف سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد شروع ہوا۔ قبل ازیں یہاں آرین، ایرانی، یونانی، ستھین، کشن، ہن اور پارتھین

باشندے ہزاروں برس تک حکمرانی کرنے کے بعد ہندی تہذیب اختیار کر چکے تھے۔ ۱۰۰۰ء سے ۱۳۹۸ء تک ترکی النسل حکمران غزنی، لاہور اور دہلی کے مراکز سے شمالی ہند بشمولِ ہزارہ قدیم پر حکمرانی کرتے رہے۔ تیموری حملے یعنی ۱۳۹۸ء سے اٹھارویں صدی تک ترکوں کا ایک ہی قبیلہ تین سو پانچ برس تک مسلسل یہاں حکمران رہا۔ مغل دور ترکوں ہی کا دورِ حکومت تھا۔ ہندوستان کی تاریخ اسلام کا یہی وہ شاندار عہد ہے جس میں برصغیر کے تمام اہم مقامات سے شرک اور بت پرستی کا غلبہ ختم ہوا اور اسلامی تہذیب کو بے مثل فروغ حاصل ہوا۔ اسی پرشکوہ دور میں توران کی مردم خیز سرزمین سے آنے والے ترک حملہ آوروں کے مجاہدانہ کارناموں اور مسلمان علما و صوفیا کی تبلیغی سرگرمیوں کی بدولت یہاں دینِ حق کو غلبہ حاصل ہوا۔ یہ اسی دور کے کارناموں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی دنیا بھر میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد برصغیر ہند و پاکستان ہی میں پائی جاتی ہے اور یہیں سے احیائے دین کی مایہ ناز تحریکیں بار بار اٹھتی رہی ہیں؛ لہٰذا ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کی قابلِ فخر تاریخ صرف ترکوں کے عہد کی تاریخ ہی ہو سکتی ہے۔

اس تاریخی پس منظر کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ارادہ کیا کہ انشاء اللہ میں اپنے علمِ تاریخ کو بروئے کار لا کر تاریخی کے پردوں کو چاک کر دوں گا اور نئی نسل کے سامنے تاریخ کا ایک ایسا آئینہ پیش کر دوں گا، جس میں وہ اپنے ماضی کی ایک جھلک دیکھ سکے گی۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر میں نے ترکوں کے حالات باقی اقوام کے حالات سے کیوں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس سوال کا جواب اس کتاب کے مطالعہ سے خود بخود مل جائے گا۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ مورخین انہی اقوام یا قبائل کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کر سکتے ہیں جن کا کسی خاص عہد میں نمایاں سیاسی کردار مل سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ترکوں کے عہد میں ترکوں ہی کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں؛ البتہ اس عہد کے سیاسی فریم ورک کے اندر رہتے ہوئے اس دور کی تمام اقوام کی اصل، ہزارہ قدیم میں ان کی آمد اور جتنے کچھ حالات مہیا ہو سکتے تھے، قلمبند کر دیئے گئے ہیں۔ کئی برس کے تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس سے زیادہ مستند حالات مہیا کرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کتاب کو دو جلدوں میں مرتب کرنا شروع کیا۔ دوسری جلد میں، جو دراصل کے عہد سے انگریزوں کے عہد تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔ تمام اقوام کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اکثر اقوام نے کچھ نہ کچھ سیاسی کردار ادا کیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہزارہ قدیم میں ترکوں کے زمانے کی تاریخ محض زبانی روایات اور قیاسات پر مبنی نہیں، بلکہ اس کے ثبوت میں عظیم ترک شہنشاہوں کی خود نوشتوں اور متعدد معتبر کتبِ تاریخ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ترکوں کی اصل، ہزارہ میں ان کی آمد اور ان کے عروج و زوال کے مستند حالات توزکِ جہانگیری، توزکِ بابری، آئینِ اکبری، اکبر نامہ، توزکِ تیموری، شاہجہان نامہ، عالمگیر نامہ، سیر المتاخرین، مآثر الامراء اور اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جیسی بلند پایہ کتبِ تاریخ کے علاوہ ہزارہ گزیٹر اور تاریخ ہزارہ میں بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں؛ لہٰذا آئندہ صفحات میں جو تاریخی مواد پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ شاید سلاطینِ پکھلی کی اولاد کا ایک فرد محض اپنے قومی یا نسلی عصبیت کے جذبے سے مغلوب ہو کر داستان گوئی پر اتر آیا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ میری پیش کردہ معلومات کو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں جن کے حوالہ جات موزوں مقامات پر دیئے گئے ہیں۔

چونکہ ہزارہ قدیم کی تاریخ پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی تحقیق ہے؛ لہٰذا قدرتی طور پر مجھے معلومات کی فراہمی اور مواد کی ترتیب کے سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے زیرِ نظر عہد میں بعض قابلِ ذکر افغان، گکھڑ، راجپوت اور آوان سرداروں کے نام ملے، مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ہزارہ قدیم کے باشندے نہ تھے، بلکہ وہ مغربی پاکستان کے دوسرے حصوں کے رہنے والے تھے؛ لہٰذا تاریخ ہزارہ میں ان کا تذکرہ بے محل نظر آتا ہے۔ اتفاق سے شمالی پاکستان کی اکثر اقوام کے افراد ہزارہ قدیم میں سکونت پذیر تھے، اس لئے مجھے ان تمام اقوام کی اصل اور ان کے وہ حالات جو ہزارہ سے متعلق تھے، بیان کرنے پڑے، اس طرح یہ کتاب نہ صرف اہلِ ہزارہ بلکہ تقریباً تمام اہلِ پاکستان کے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے سودمند ہو گئی ہے۔

ترکوں کے عہد اور اسلامی تہذیب کے غلبے کو سمجھنے کے لئے زمانہ قبل از اسلام کے تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری تھا، اس لئے مختصر طور پر آریائی دور سے ہندو شاہیہ گندھارا کے دور تک شمال کی طرف سے آنے والی تمام اقوام کی اصل اور ان کی آمد کے حالات پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ترکوں کے زوال کے بعد درانی، سکھ اور انگریز یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آئے اور ان میں سے ہر ایک نے ترکوں کی بقیۃ السیف آبادی کو کچلنے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو بالعموم اور ترک مسلمانوں کو بالخصوص اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ عین ممکن تھا کہ ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں کی طرح ہزارہ پر قابض ہوتے تو انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اب ترک اتنے پس چکے ہیں کہ ان میں مزاحمت کی

نقشہ ولایتِ پکھلی

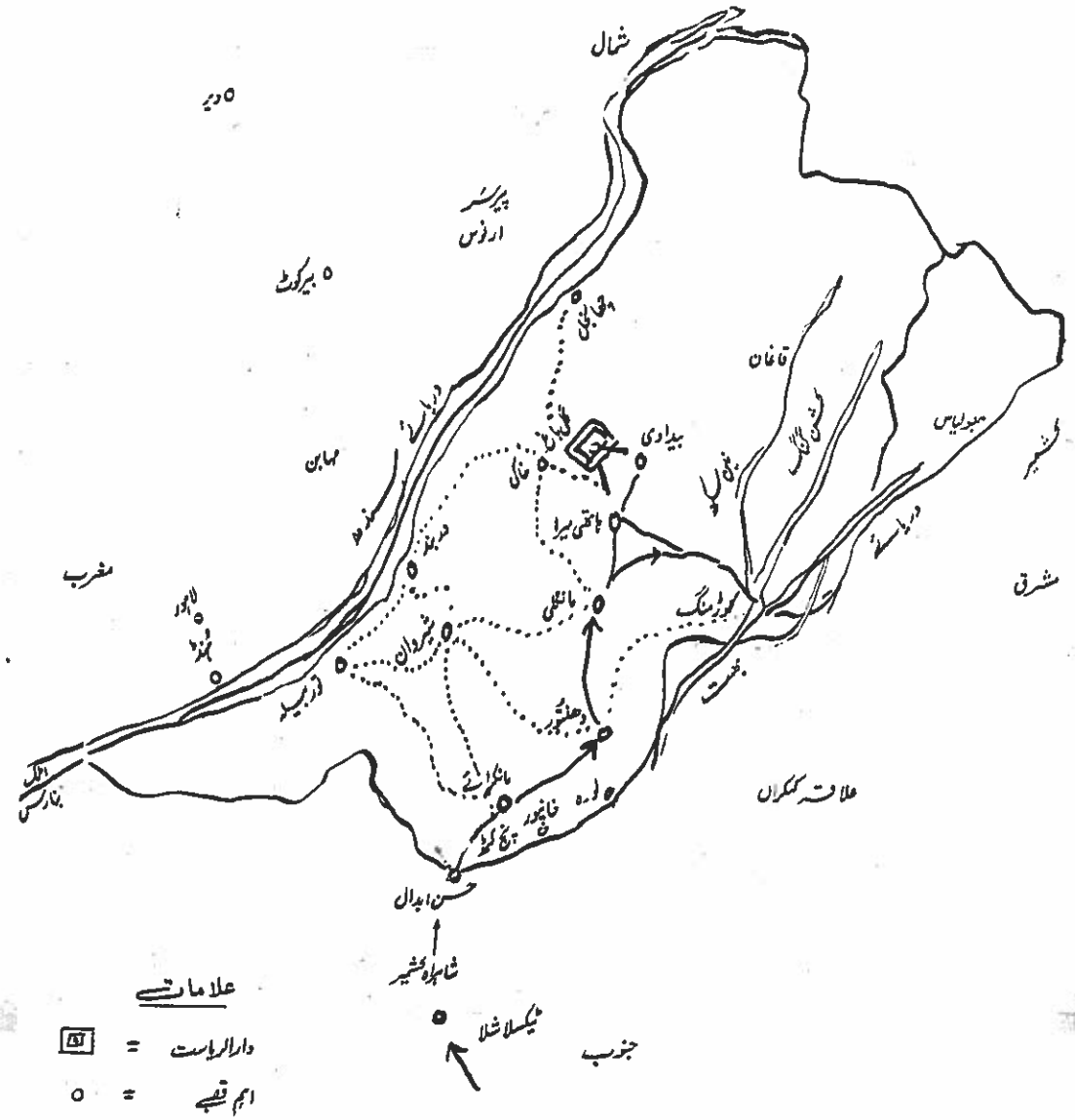

علامات

دارالریاست	=	⊡
اہم قصبے	=	○
شاہراہ کشمیر	=	←——
دیگر شاہراہیں	=	·····▪

قدیم و جدید نام

کتور	گلگت	اٹک بنارس	اٹک
قاغان	کاغان	کمکران	گکھڑاں
نین سکھ	کنہار	تربیلہ	تربیلہ
دھتور یا دھنتور	دھبتوڑ	پنج کٹھ	پنج کٹھا
دریائے بہت	دریائے جہلم	ٹیکشا شلا	ٹیکسلا
بھولیاس	بھلیاسہ		

سکت باقی نہیں رہی، لہٰذا انہوں نے ترکوں کے پاس محدود زمینداریوں کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں رہا؛ لیکن اپنی بدحالی کے باوجود انہوں نے اپنا شجرہ نسب محفوظ رکھا۔ مجھے محمد یونس خان ولد باز خان ساکن گھیروال تحصیل مانسہرہ، محمد سعید خان ساکن بحالی، میاں داد خان ولد خادی خان ساکن موہار کلاں تحصیل ایبٹ آباد، شمس الدین ولد محمد بخش سکنہ سنواڑیاں علاقہ مظفر آباد، سمندر خان ولد راجولی خان ساکن پھر ہاڑی نے سلاطین پکھلی اور اُن کی اولاد کے شجرے دکھائے۔ ان حضرات نے برسوں کے انقلابی تغیرات کے باوجود اپنے خاندانی شجروں کو محفوظ رکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے میلوں دُور رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو جانتے تک بھی نہیں؛ لہٰذا یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے یا ان کے قریبی بزرگوں میں سے کسی نے دوسروں سے مل کر ایک جعلی شجرۂ نسب مرتب کر ڈالا ہو۔ میں نے ان حضرات کے پیش کردہ شجروں کا بعض دیہات کی صورت، دیہوں اور شجرہ نسب مالکان دیہہ سے مقابلہ و موازنہ کیا جس سے ان کی صحت اور بھی تسلی بخش پائی گئی۔ اس کے بعد تاریخی کتب میں بیان کئے گئے شجروں سے بھی ان کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا اور پھر پورے اطمینان کے ساتھ مختلف خانوادہائے سلاطین پکھلی کا شجرہ نسب اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قدیم ترکوں میں سے جس ایک نام کو ابوالفضل جیسا محقق بھی نہ دریافت کرسکا، وہ بھی ہمارے خاندانی شجرہ نسب میں درج کیا ہوا ہے۔

البتہ ترکوں کے مختلف شجروں کے درمیان مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے ایک خامی نظر سے گزری ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض شجرہ نویسوں نے بعض ترک سلاطین کے اصل ناموں اور ان کے القابات میں تمیز نہیں کی، اور انہیں دو مختلف افراد لکھ دیا؛ مثلاً سلطان نصیر الدین حسین خان کو "سلطان نصیر الدین" اور "حسین خان" دو مختلف بھائیوں کے طور پر درج کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح شہاب الدین بابر کو بھی دو بھائیوں کے طور پر درج کر دیا گیا ہے۔ ترکوں کے عہد کے مستند تاریخی ریکارڈ سے مقابلہ و موازنہ کرنے کے بعد اس خامی کو آسانی سے دُور کر دیا گیا ہے۔ امیر تیمور کے اسلاف کے ناموں کے ہجوں میں بھی چند غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان غلطیوں کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں عرصۂ دراز تک قیام کرنے کے بعد ترک ترکی زبان بھول گئے تھے۔ بعض شجرہ نویس ترکی اور مغولی زبان کے بعض الفاظ میں امتیاز نہیں کرسکے۔

ہم عموماً ایک صدی میں ابن خلدون کے نظریے کے مطابق چار پشتیں شمار کرتے ہیں، لیکن یہ ایک لچکدار نظریہ ہے جس میں کمی یا بیشی ممکن ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ چار پشت فیصدی کا حساب

زمانہ قدیم کے لوگوں پر چسپاں کرنا درست نہ ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید سائنسی تحقیقات کے علاوہ احادیث اور اسرائیلی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً نوح علیہ السلام کی عمر نو سو برس بیان کی گئی ہے اور مشہور روایت کے مطابق ترک بن یافث کی عمر دو سو چالیس برس بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا آخر الزمان کے انسانوں کی اوسط عمروں کا حساب زمانہ قدیم کے انسانوں کی اوسط عمروں سے بہت مختلف ہوگا۔

جیسا کہ آئندہ اوراق سے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ موجودہ ضلع ہزارہ انگریزوں کا بنایا ہوا ایک جدید ضلع ہے۔ سکھوں کے عہد تک اس کا پورا نام ہزارہ قارلق تھا اور اس سے مراد تحصیل ہری پور کا وہ وسیع میدان تھا جو اٹک تک پھیلا ہوا ہے۔ ترکوں کے عہد میں یہ میدانِ ہزارہ قارلق اس وسیع ولایت پکھلی کا ایک حصہ تھا جو کشمیر، راولپنڈی، اٹک اور گلگت کے تمام درمیانی علاقوں پر مشتمل تھی۔ شہنشاہِ اکبر کے زمانے سے قبل ولایت پکھلی ایک آزاد ریاست تھی۔ اکبری دور میں میدانِ ہزارہ قارلق کو بقیہ ولایت پکھلی سے علیحدہ کر کے اٹک کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور اس میدان پر آئین اکبری کا اطلاق ہوا۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا نام تاریخ پکھلی ہونا چاہیئے تھا جس کا دار الریاست گل باغ (تحصیل مانسہرہ) تھا، لیکن آج کل معاملہ اس کے برعکس یہ ہے کہ ہزارہ ایک ضلع کا نام ہے اور میدانِ پکھلی خاص اس ضلع کا ایک حصہ ہے۔ اب لوگ ہزارہ کو صوبہ سرحد کا ایک ضلع اور پکھلی کو اس ضلع کا ایک حصہ ہی سمجھتے ہیں؛ لہٰذا مغالطے سے بچنے کے لئے اس کتاب کا نام تاریخ ہزارہ ہی رکھنا موزوں سمجھا گیا ہے۔

علاقائی تاریخ کو عہد وار طریقے chronological order سے ترتیب دینا نہ تو اتنا آسان ہے اور نہ ہی کچھ زیادہ سود مند ہے، اس لئے میں نے عہد وار طریقے کے علاوہ عنوانی طریقہ Topical order سے بھی نفع اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح توقع ہے کہ دونوں طریقوں کے فوائد حاصل کئے جا سکیں گے۔ ترکوں کے عہد کے سیاسی خاکے کے اندر رہتے ہوئے اس زمانے کی سیاسی، معاشی اور عمرانی زندگی کے اہم خد و خال بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی پیش کش سے تحقیق و مطالعہ کی مزید راہیں کھل جائیں گی۔

میں ان تمام حضرات کا تہِ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی طرح بھی مجھ سے تعاون کیا۔ مجھے اپنی معلومات کا ہر لحاظ سے مکمل ہونے کا کوئی دعویٰ بھی نہیں، اگرچہ اپنی حد تک میں نے مستند تاریخی ریکارڈ مرتب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تنقیدات کے ساتھ ساتھ مجھے

پنی مفید معلومات اور قیمتی مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع دیں، تاکہ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن کو زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جا سکے۔

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا
فَانْظُرُوْا بَعْدَنَا إِلَى الْآثَارِ

ترجمہ: یہ ہماری نشانیاں ہیں، جن کے ذریعے آپ ہماری شخصیتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ پس جب ہم دُنیا سے رخصت ہو جائیں، تو ہماری ان نشانیوں کو ملاحظہ کر لینا۔

محمد ارشاد

ہزارہ کی وجہ تسمیہ

تمام معتبر کتب تاریخ بشمول ہزارہ گزیٹیر و تاریخ ہزارہ مرتبہ کیپٹن ویس کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے نوّے ہزار ہزارجات کے ساتھ تین اطراف سے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ہزارہ منگ ایک پلٹن کا نام ہوا کرتا تھا جس میں بالعموم ایک ہزار جوان ہوا کرتے تھے۔ امیر تیمور ترک تھا اور اس کے ہزارجات میں ترکوں اور مغلوں کے تمام الوس و قبائل سے سپاہی بھرتی کئے جاتے تھے۔ تمام معتبر قبیلوں کی اپنی اپنی ہزارہ منگ ہوا کرتی تھی جو اُسی قبیلے کے معروف نام سے پکاری جاتی تھی، صدیوں تک تاتاری افواج کی یہی ترتیب قائم رہی۔ ہندوستان سے واپسی پر امیر تیمور نے اپنی سرحدی پالیسی کے تحت اپنے ہم قوم قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو ولایت پکھلی بالخصوص شاہراہِ کشمیر کی حفاظت کے لئے پکھلی خاص میں متعین کر دیا اور میدانِ ہزارہ قُرلق کو جاگیر کے طور پر قُرلق ترکوں کی اس ہزارہ منگ کو عطا کر دیا۔ اسی ہزارہ قارلق کا نام ہزارہ کی اصل وجہ تسمیہ ہے۔ امیر تیمور کے حملے یعنی ۱۳۹۸ کے بعد ۱۸۵۰ء بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی تحصیل ہری پور کے وسیع میدان کا نام ہزارہ قارلق ہی مشہور و معروف تھا۔

بعض کتبِ تاریخ میں قرلق KARLUKE کے لفظ کو قارلُق، قرلُوق، قرلُوغ اور قارلُغ بھی لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ قرلق ہی ہے۔ قرلق قبیلہ ترکوں کے ان ابتدائی پانچ قبیلوں میں سے ایک ہے، جس کے وجود کا تاریخی ثبوت تیسری صدی عیسوی کے بعد مسلسل ملتا رہا ہے۔ تاریخِ فرشتہ، آئینِ اکبری، اکبر نامہ، سیر المتاخرین، اور توزکِ جہانگیری جیسی مستند و معتبر کتبِ تاریخ میں قرلق ترکوں کی آبادکاری کا تذکرہ موجود ہے۔ آئندہ اوراق میں ان کتب کے حوالجات پیش کئے جا رہے ہیں۔

تاریخ ہزارہ مرتبہ کیپٹن ویس میں لکھا ہے:

"وجہ تسمیہ اس میدان کی بر روایت مرجح و معتبر یہ ہے کہ امیر تیمور کی آمد میں جو آخیر ۱۳۹۸ء میں ہوئی، قوم ترک معروف ہزارہ قارلغ اس میدان گرد و نواح ہری پور پر قابض ہوئی تھی۔ ان کے نام سے یہ میدان بنام ہزارہ قارلغ (قرلق) مشہور ہوا۔"[1]

انگریزوں کے ابتدائی عہد تک ہزارہ قارلق ہی کا نام تاریخی اور سرکاری دستاویزات میں استعمال کیا جاتا رہا، لیکن انگریزوں کے پہلے بندوبست کے زمانے میں "قارلق" کا لفظ متروک کر دیا گیا اور صرف لفظ ہزارہ باقی رہنے دیا گیا۔ پھر جدید حد بندی ہوئی اور ہزارہ نام کا ایک نیا ضلع وجود میں آیا۔ اس سلسلے میں ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳ء کا بیان یہ ہے:[2]

"In a number of old deeds filed during the recent settlement by Turins, Gujjars, and Gokhars, the dates of which extend from the year 1650 A.D to 1805 A.D the district is spoken of as Hazara Karluke. It seems only natural that in latter years of the latter half of this name should be dropped and almost forgotten".

مندرجہ بالا اقتباس ثابت کرتا ہے کہ ۷۲-۱۸۷۰ء کے انگریزی بندوبست کے دوران میں بھی مختلف اقوام ہزارہ نے جو دستاویزات انگریزوں کو پیش کیں، ان میں بھی اس علاقے کا پورا نام یعنی ہزارہ قارلق درج تھا۔ انگریز ۴۹-۱۸۴۸ء میں ہزارہ پر قابض ہوئے اور کیپٹن ایبٹ اسی سال ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ اگرچہ ہزارہ گزیٹیر نے یہ نہیں تسلیم کیا کہ انگریزوں نے ہی لفظ قرلق یا قارلق کا استعمال متروک قرار دیا تھا لیکن قرائن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہی قارلق کا لفظ غائب کیا اور صرف ہزارہ کے نام سے ایک نیا ضلع قائم کیا جس کی حد بندی از سر نو کی گئی۔ انگریزوں کی آمد کے وقت تمام ولایت پکھلی، جس کا تذکرہ

---

[1] تاریخ ہزارہ، مرتبہ کیپٹن ویس ۱۸۷۲ء، صفحہ ۴۔

[2] ہزارہ گزیٹیر ۸۲-۱۸۸۳ء صفحہ ۲۰

آئندہ سطور میں کیا جا رہا ہے۔ تین ٹکڑوں میں تقسیم تھی اوّل پکھلی خاص بمعہ علاقہ مظفر آباد دو ہمٹوڑ۔ یہ ٹکڑا کشمیر سے متعلق تھا۔ دوم پرگنہ ہزارہ قارلق جو مغلیہ دور ہی سے اٹک کے ساتھ شامل تھا اور سوم پرگنہ فتح پور بابری جس میں علاقہ خان پور، دناہ اور رجوعیہ شامل تھے اور صوبہ لاہور سے متعلق تھے۔ انگریزوں کی عمل داری سے قبل ان تینوں ٹکڑوں پر سکھوں کی عملداری قائم تھی۔

قرلق ترکوں کی آبادکاری یعنی ۱۳۹۹ء سے قبل اس علاقہ کے مختلف نام مستعمل تھے، جن میں ابی ساریز، اُراشہ اور بال میک دیش زیادہ مشہور رہے ہیں۔ مختلف اَدوار میں ولایت پکھلی کے مختلف ٹکڑے سلطنتِ ٹیکسلا اور کشمیر کے ماتحت رہے۔ ہندو اور بُدھ ادوار میں ان کی سرحدات میں تغیرات رونما ہوتے رہے۔ ان تغیرات کے حالات آئندہ اوراق میں بیان کئے جا رہے ہیں۔

نقشہ ولایت پکھلی و علاقہ یوسف زئی

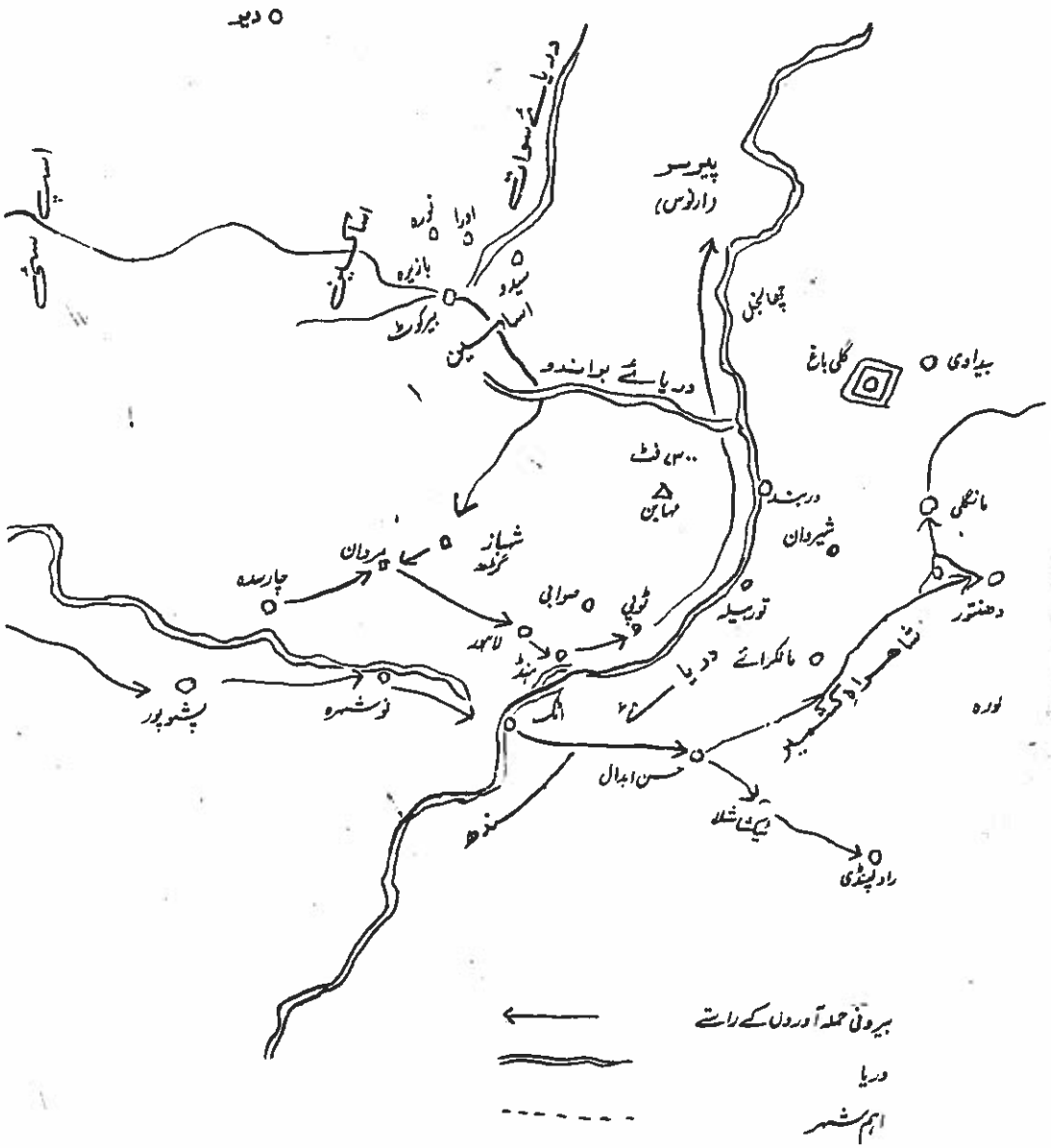

ولایتِ پکھلی

ہزارہ کی وجہ تسمیہ کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے کہ ترکوں کے عہد میں میدان ہزارہ قارلق سے مراد تحصیل ہری پور کا وہ میدان تھا جو اٹک کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ میدان ہزارہ قارلق اس وسیع ولایت پکھلی کا ایک حصہ تھا جو دریائے سندھ، کشمیر، راولپنڈی اور گلگت کے تمام درمیانی علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس ولایتِ پکھلی کا تذکرہ آئین اکبری، اکبر نامہ، سیر المتاخرین، توزک جہانگیری اور مآثر الامرا جیسی معتبر کتب میں موجود ہے۔ ان تمام کتب میں ولایتِ پکھلی کا حدود اربعہ مندرجہ ذیل بیان کیا گیا ہے:

مشرق میں کوہستان کشمیر (تا بحد بھولیاس) مغرب میں اٹک بنارس (قلعہ اٹک)

شمال میں کتور (گلگت) اور جنوب میں علاقہ گکھڑاں (راولپنڈی)

آئندہ اوراق میں ولایتِ پکھلی کے اس حدودِ اربعہ کے بارے میں وہ مستند حوالہ جات بیان کئے جا رہے ہیں جن سے ثابت ہو جائے گا کہ تیموری ترکوں کے عہد میں میدانِ ہزارہ قارلق ولایت پکھلی کا ایک حصہ تھا اور سیاسی تغیرات کے ساتھ ساتھ اس کی سرحدات میں ردو بدل ہوتا رہا۔

محل وقوع کے لحاظ سے ولایتِ پکھلی کو تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے شمال مغرب میں وہ پرآشوب پختون علاقہ تھا جو صدیوں تک سکندرِ اعظم، محمود غزنوی، محمد غوری، امیر تیمور اور بابر جیسے بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ بنا رہا۔ اس کے شمال مشرق میں کشمیر جنت نظیر کی وہ حسین وادی تھی جس کی کشش سے شاہ و گدا سبھی ادھر کھچے چلے آ رہے تھے۔ کشمیر جانے کا بہترین راستہ ولایتِ پکھلی ہی سے گزرتا تھا؛ لہٰذا اسی شاہراہِ کشمیر پر ولایت پکھلی کے تمام اہم شہر اور قصبے تعمیر کئے گئے تھے۔ اس ولایت کے جنوب مغرب میں پنجاب کی وہ زرخیز سرزمین تھی جو صدیوں تک حکمرانوں کی کش مکش کا مرکز بنی رہی۔ اس کے پہاڑ اور دریا زمانۂ دراز تک

دفاع کے ضامن بنے رہے اور اس طرح اس کے باشندے بالعموم ان تباہ کاریوں سے محفوظ رہے جو بسا اوقات وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگا کے میدانوں میں ہوتی رہیں۔

اس ولایت کا علاقہ دریائے بھت (جہلم) دریائے سندھ، دریائے کشن گنگ اور نین سکھ جیسے دریاؤں اور نالوں سے سیراب ہوتا تھا۔ اس میں وادیٔ نیلم اور وادیٔ قاغان (کاغان) جیسی وادیاں موجود تھیں۔ لُولُوسر اور سیف الملوک جیسی خوبصورت جھیلیں اس کے حُسن کو دوبالا کر رہی تھیں، اس میں جہاں ایک طرف موسیٰ کا مصلّیٰ (۱۳۳۷۰ فٹ بلند) اور میرا جانی (۹۱۹۳ فٹ بلند) جیسی فلک بوس چوٹیاں پائی جاتی تھیں۔ وہاں میدانِ ہزارہ قارلق، میدانِ اراشہ (رش) اور میدانِ پکھلی خاص جیسے خوشنما میدان بھی پائے جاتے تھے۔ اس کے شہر اور قصبے جن کا تذکرہ آئندہ اوراق میں کیا جا رہا ہے، حسن و لطافت اور معاشرتی ترقی سے لحاظ سے تمام سرحدی علاقے میں ممتاز تھے۔ غرضیکہ کسی علاقہ کی خوبصورتی کے لئے جس موزوں قدرتی ماحول کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے ولایت پکھلی کا مقدر بنا دیا تھا۔ ہندی زبان میں پکھال اور پکھلی پانی کے اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو کھال کا بنا ہوا ہوتا ہے اور جسے بیل یا گدھے پر لاد کر لے جایا جاتا ہے۔ عہدِ قدیم میں میدانِ پکھلی خاص، میدان رش اور میدانِ ہزارہ میں پانی کی بہتات تھی۔ ولایت پکھلی کے پہاڑوں میں بھی پانی کے چشمے بکثرت پائے جاتے تھے ـــــــ غالباً اسی وجہ سے اس ولایت کا نام پکھلی مشہور ہوا تھا۔

ہندوؤں اور بدھوں کے زمانے میں ولایت پکھلی پر مہاراجہ اشوک کشن خاندان کے مہاراجہ کنشک، پونچھ کے راجہ ابھی ساریز، ترکی شاہیہ کابل کے متعدد حکمران اور ہندو شاہیہ گندھارا کے کئی حکمران جن میں مہاراجہ جے پال سب سے زیادہ نامور تھا، حکمرانی کر چکے تھے۔ راجہ رسالو جس کے قصّے ابھی تک اس علاقے میں بیان ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ولایت پکھلی کا نامور حکمران تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملے سے چار سو برس قبل سے ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کے حکمران اس ولایت پر مسلسل حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے؛ چنانچہ اس دور میں یہ علاقہ بدھ مت اور ہندو دھرم کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ نسلی طور پر یہ تمام ہندو اور بُدھ حکمران تورانی النسل تھے اور انہی بیرونی حملہ آوروں کی اولاد تھے جو وقفے وقفے کے بعد یہاں حملہ آور ہوتی رہی تھیں۔

اسلام کا تعارف یہاں سلطان محمود غزنوی کے دَور سے ہوا۔ غزنوی ترکوں کی افواج اسی علاقے سے پیشقدمی کرتے ہوئے کشمیر کے چند پہاڑی قلعوں پر حملہ آور ہوتی تھیں، لیکن غزنوی یہاں آندھی کی طرح آتے اور بگولے کی طرح واپس چلے گئے اور ہندو راجے یہاں بدستور حکمرانی کرتے رہے۔ غزنویوں کے بعد غوریوں کا دور شروع

ہوا۔ مانکرائے کی صورت دیہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد غوری کے حملے یعنی ۱۱۹۲ء میں اس علاقے پر سربن سنگھ اور نتھا سنگھ نامی دو بھائی حکمران تھے۔ سربن سنگھ نے ایک فوج ہمراہ لے کر مارگلہ کے مقام پر پہنچ کر غوری فوج پر حملہ کر دیا ملیکن اُسے شکست ہوئی اور مارا گیا۔ بعد ازیں سلطان شہاب الدین محمد غوری کا ایک بیٹا (محمد غوری اپنے ترک غلاموں کو بیٹے کہا کرتا تھا) اصالت خان ایک فوج لے کر ولایت پکھلی پر حملہ آور ہوا۔ پکھلی خاص میں مان سنگھ نے غوری فوج کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی۔ اس وقت اس علاقے میں اسلام کا ابتدائی غلبہ قائم ہو گیا۔

محمد غوری کی شہادت کے بعد ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی قائم ہوئی۔ ہزارہ زیریں اس سلطنت کے ماتحت رہا لیکن بالائی ہزارہ کشمیر کے زیر نگیں ہو گیا۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو اس علاقے کی حفاظت کے لئے یہاں متعین کر دیا۔ اس سن کے بعد یہاں تیموریوں کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ تیموریوں کے ابتدائی دور میں ولایتِ پکھلی آئینی طور پر کابل کے تیموری شہزادے کے زیر نگیں رہی، لیکن توران میں جب تیموریوں کے مابین طویل خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس زمانے میں یعنی ۱۵۰۰ء بھگ ابوسعید سلطان کا ایک پوتا شہاب الدین بابر جو ظہیر الدین بابر کا چچیرا بھائی تھا، پکھلی میں وارد ہوا۔ اس تیموری شہزادے کی آمد کے بعد یہاں ترکوں کی ایک آزاد ریاست قائم ہو گئی جس کا دارالحکومت گلی باغ تحصیل مانسہرہ تھا۔ اس کے بعد مسلسل تین صدیوں تک یہاں ترکوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۷۱۳ء میں ترکوں کو زوال آیا اور طویل خانہ جنگی کے بعد یہاں درانی غالب ہوئے۔

اس زمانے کی خانہ جنگیوں میں ولایتِ پکھلی کے تمام اہم شہر تباہ و برباد ہو گئے۔ رفتہ رفتہ لوگ ان شہروں اور سلاطینِ پکھلی کے ناموں تک سے بھی ناآشنا ہوتے چلے گئے۔ آج اس ولایتِ پکھلی کا نام اور حدودِ اربعہ تک بھی اکثر اہلِ ہزارہ کو معلوم نہیں۔ آج ہمیں اس ولایت کے عظیم سلاطین کی قبروں تک کا بھی نام و نشان تک نہیں ملتا جو یہاں صدیوں تک حکمرانی کر گئے ہیں۔ ان سلاطین کی اولادیں آج پیکرِ بے بسی بن کر زبانِ حال سے پکار رہی ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ولایتِ پکھلی کے منسلکہ نقشہ سے اس کا قدیم حدود اربعہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے قدیم شہروں اور علاقوں کے نام آج تک اسی طرح موجود ہیں، لیکن ان کے ہجوں اور تلفظ میں کسی حد تک تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ وقت اور حالات کے تغیرات کے ساتھ ساتھ اس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ پرانے

زمانے میں پکھلی کی جنوب مغربی سرحدات گندھارا (وادی پشاور) اور ٹیکشا شلا (ٹیکسلا) کے مشہور تہذیبی مرکزوں سے ملتی جلتی تھیں اور انہی علاقوں کے تہذیبی اثرات یہاں بھی غالب ہوا کرتے تھے جس طرح پکھلی اور شہروں کے ناموں میں بجوں اور تلفظ کی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، اسی طرح گندھارا اور ٹیکشا شلا کے علاقوں اور شہروں کے ناموں کے بجے اور تلفظ بھی بدل گئے ہیں؛ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ولایت پکھلی کی ہندکو زبان میں کوئی نمایاں تغیر نہیں رونما ہوا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ولایتِ پکھلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کے مختلف حصوں پر کشمیر، پنجاب اور سرحد کی بالادستی قائم ہو گئی۔ دریائے سندھ کے اس پار سے متعدد پختون باشندے بھی اس ولایت میں داخل ہو گئے، لیکن ان تمام تغیرات کے باوجود ولایت پکھلی کے باشندے بھولیاسس سے میدانِ ہزارہ قارلق اور چھانجل کے علاقے سے مارگلہ کے علاقہ تک ہندکو ہی میں گفتگو کرتے ہیں اور اس طرح ابھی تک یہ قدیم ملک ایک لسانی وحدت بنا ہوا ہے۔ اگر جغرافیائی اور لسانی بنیاد پر آج بھی اس قدیم ولایت کو ایک انتظامی یونٹ بنا دیا جائے تو یہ پاکستان کا ایک عمدہ بن سکتا ہے۔

آئندہ اوراق کے مطالعہ اور قدیم تاریخ کا فہم حاصل کرنے کے لئے پکھلی، گندھارا اور ٹیکسلا کی مشہور اقوام اور شہروں کے قدیم و جدید نام مندرجہ ذیل سطور میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان مقابلہ و موازنہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان کتنی مماثلت پائی جاتی ہے:

	قدیم نام	جدید نام
ہندی:	کتور	گلگت
ترکی:	علاقہ گکھران	علاقہ گکھڑان۔ راولپنڈی
ترکی:	قاغان	کاغان
ہندی:	اٹک بنارس	اٹک
ترکی:	ہزارہ قارلق	ہزارہ
ہندی:	کنہار۔ نین سکھ	کنہار
ایرانی:	دریائے بھت	دریائے جہلم
ترکی:	دمنتور۔ دمتور	دھمتوڑ
ہندی:	دھرم توڑ	
سنسکرت:	پشوپور	پشاور
ساسانی:	پرشوار	
یونانی:	پسکاپور	
ترکی:	پشاور	
سنسکرت:	لاہور	لاہور (تحصیل ضوابی)
عربی:	الہوار	
ترکی:	لہاور	
سنسکرت:	مہابن	مہابن
ایرانی:	پیرسر	
یونانی:	ارنوس	

قدیم نام		جدید نام
عربی:	اوہند	ہُنڈ
سنسکرت:	ہنڈ	
سنسکرت:	ٹیکشاشلا	ٹیکلا
سنسکرت:	آریانہ	
سنسکرت:	گندھارا	وادیٔ کابل و پشاور
عربی:	القندہار	
ہندی:	گرجار	گجر۔ گوجر
ترکی:	کجور	
سنسکرت:	گوجار	
ایرانی:	اسپی	یوسف زئی
یونانی:	اسپ رسئی	
پختو:	ایسپ زئی	

(سنسکرت میں فارسی اُسپ کو اسو کہتے ہیں)

سنسکرت:	پکھت	پختون یا پٹھان،
یونانی (ہیروڈوٹس):	پکتوایک	
یونانی (سیلوکس):	پکٹیان	
پختو:	پختون، پختان	
ہندی:	پٹھان	
ایرانی:	(آہ وفغان) افغان	افغان
ساسانی:	ایغان	
ترکی:	اوغان	
چینی (ہیون سانگ)	اپوکین	

قدیم نام		جدید نام
ہندی:	گکھڑ۔ گنوکھڑ	گکھڑ
ترکی:	کہگر	
کشمیری:	گکڑو	
ہندی:	سوادی	سواتی یا صواتھی
ہندی:	سرواتی	
عربی:	حیطال	ابدال
آرمینی:	ہیپتال	
پختو: (ہندوکش کے علاقے میں)	اودال	
ہندی:	ہُن	
ارمڑی:	دل ساکا (بمعنی بڑی فوج)	دلازک
سنسکرت:	آوان (بمعنی محافظ)	اعوان (بمعنی معاون)
یونانی:	اپارٹی	آفریدی
پختو:	اپریدے	

خاکہ تاریخ

نمبر شمار	نام سلطنت	عہدِ حکومت	مقامی دارالحکومت	مشہور حکمران
۱	آریائی ہستیوں کی تعمیر	۱۵۰۰ ق۔م		
۲	مہاتما بدھ کی پیدائش اور بدھ مت کا آغاز	۵۶۸ ق۔م	کپل وستو۔ پٹنہ	
۳	ایرانی دور	۳۳۰-۵۵۰ ق۔م	پشاور۔ چارسدہ	۱۔ سائرس اول ۲۔ دارائے اعظم
۴	یونانی دور (مقدونیہ)	۳۰۵-۳۲۷ ق۔م		۱۔ سکندرِ اعظم۔ ۲۔ سیلوکس۔
۵	موریا (ہندی)	۱۹۰ تا ۳۱۳ ق۔م	پٹنہ	
۶	باختری یونانی	۹۰ تا ۱۹۰ ق۔م	ٹیکسلا	۱۔ ڈیمیٹریس۔ ۲۔ مینڈر
۷	ساکا ستھین (تورانی)	۵ تا ۹۷ ق۔م	ٹیکسلا	۱۔ ماؤس۔ ۲۔ آذیز
۸	پارتھین (تورانی۔ ایرانی)	۷ تا ۷۵ء ق۔م	ٹیکسلا	گونڈوفیز
۹	کشن خاندانی (ترکی)	۶۰ تا ۲۲۵ء	پشاور	کنشک وغیرہ
۱۰	ساسانی (ا)	۲۳۰ تا ۳۶۵ء	پشاور	۱۔ اردشیر۔ ۲۔ شاپور
۱۱	کیداری (ایرانی)	۳۶۵ء تا ۴۵۵ء	نامعلوم	کیدار
۱۲	ہن یا ہیطال (ترکی)	۴۵۰ء تا ۵۵۰ء	بلخ، کابل، سیالکوٹ	۱۔ تورمن ۲۔ مہرگل
۱۳	ساسانی (ب)	۵۶۸ء تا ۶۴۴ء	نامعلوم	۱۔ خسرو اول خسرو ثانی ۳۔ یزدگرد
۱۴	ترکی شاہیہ کابل (ترکی)	۶۵۰ء تا ۸۷۰ء	کابل	۱۔ سپالاپتی ۲۔ ستیبیل
۱۵	ہندو شاہیہ گندھارا (تاتاری)	۸۷۰ء تا ۱۰۲۱ء	ہنڈ۔ لاہور	۱۔ سمند۔ ۲۔ کملو۔ ۳۔ بھیم۔ ۴۔ جے پال۔ ۵۔ آنند پال
۱۶	غزنوی (ترک)	۱۰۰۱ء تا ۱۱۵۰ء	غزنی۔ لاہور	۱۔ سلطان محمود۔ ۲۔ سلطان مسعود

نمبر شمار	نامِ سلطنت	عہدِ حکومت	مقامی دار الحکومت	مشہور حکمران
۱۷	غوری (ترک)	۱۱۸۱ء تا ۱۲۰۶ء	غزنی - دہلی	سلطان محمد غوری
۱۸	خاندانِ غلامان (ترک)	۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء	دہلی - لاہور	۱- قطب الدین ایبک - ۲- بلبن - ۳- التمش
۱۹	خلجی (ترک)	۱۲۹۰ء تا ۱۳۳۰ء	دہلی - لاہور	۱- علاؤ الدین - ۲- جلال الدین
۲۰	تغلق (ترک)	۱۳۲۰ء تا ۱۳۹۸ء	دہلی - لاہور	۱- محمد - ۲- فیروز
۲۱	امیر تیمور کا حملہ	۱۳۹۸ء		
۲۲	سلطنتِ مغلیہ (ترک)	۱۵۸۹ء تا ۱۷۵۰ء	کابل (صوبہ)	۱- اکبر - ۲- جہانگیر - ۳- شاہجہان ۴- اورنگ زیب عالمگیر
۲۳	درانی (افغان)	(پچھلی سرکار و ہزارہ قارلق) ۱۷۵۰ء تا ۱۸۱۷ء	کابل، پشاور	۱- احمد شاہ ابدالی - ۲- تیمور

قدیم تہذیبیں اور سلطنتیں

آریائی دَور:

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آرین ایک نسل کا نام ہے اور اس نسل کے باشندے وسط ایشیا سے نکل کر ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان کی طرف آگے بڑھے۔ انہوں نے ہندوستان کے ان قدیم باشندوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ جو کول اور دراوڑ کہلاتے تھے۔ آرین وادیٔ کابل، وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگا کے میدانوں میں سکونت پذیر ہو گئے، لیکن آرین باشندوں کی اصل کے اس نظریہ کے برعکس بعض مورخین کا گمان یہ ہے کہ آریا لفظ دراصل اُر سے نکلا ہے۔ ان کی تحقیقات کے مطابق اُر کا شہر کلدانیوں نے آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے عراق میں آباد کیا تھا۔ اس شہر میں اُر (آتش) کی پوجا ہوا کرتی تھی۔ یہ شہر عرصہ دراز تک آباد رہا اور اسی شہر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جو لوگ اُر (آتش) کی پُوجا کرتے تھے، وہ آرین یا آریا کہلاتے؛ چنانچہ وسط ایشیا سے جو باشندے یہاں آئے، وہ اُر کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے آریا کہلانے لگے، بلکہ جن دیگر باشندوں نے یہ عقیدہ قبول کیا، وہ بھی آرین کہلائے۔

رفتہ رفتہ جب شہری سماج وجود میں آیا تو شمالی ہند میں آریائی تہذیب وجود میں آئی۔ پہلے ہندو دھرم اور پھر بُدھ مت آریائی تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بُدھ مت کشمیر، پکھلی، گندھارا وغیرہ سے آگے بڑھ کر توران تک پھیل گیا۔ رام چندر جی، شری کرشن جی مہاراج، منوجی مہاراج، چانکیہ اور شنکر آچاریا اس دور کی عظیم علمی شخصیتیں تھیں۔ سام وید، یجروید، الفروید اور رگِ وید اس دَور کی مشہور کتابیں ہیں۔ ٹیکسلا، پشاور، سوات، بامیان اور کابل جیسی علاقے کی کھدائیوں سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از اسلام میں یہ تمام علاقے ہندو دھرم اور بُدھ مت کے مرکز رہ چکے ہیں۔ آریائی دور کی مشہور زبان سنسکرت تھی۔ اصل آریائی دور ۱۵۰۰ ق۔م سے

۲۰۰ ق۔م تک کا ہے۔

بھگوت گیتا اور ویدوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریا لوگ توحید کے تصور سے ناآشنا نہ تھے۔ منو مہاراج نے منوسمرتی لکھ کر معاشرے کو چار مشہور ذاتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان ذاتوں میں سے برہمن ذات کو پوتر یعنی پاک ذات تصور کیا جاتا تھا، انہیں خصوصی مراعات اور حقوق حاصل تھے اور انہی کو مذہبی تعلیمات کا امین سمجھا جاتا تھا۔ دوسری ذات کھشتریوں کی تھی۔ یہ لوگ سپاہی اور سیاست دان ہوا کرتے تھے۔ حکمرانی ان کا موروثی پیشہ بن گیا۔ تیسری ذات میں درویش شامل تھے ——— یہ لوگ موروثی کاشتکار تھے۔ ہندوستان ابتدا ہی سے ایک زراعتی ملک تھا؛ چنانچہ عوام کی اکثریت ویش تھی۔ چوتھی ذات میں شودر شامل تھے۔ یہ کمین ذات تھی اور اس میں سوسائٹی کے گھٹیا افراد کو جن میں قدیم کول اور دراوڑ باشندے بھی تھے شامل کر لیا گیا تھا۔ چوتھی صدی قبل مسیح تک ہندو دھرم کا عروج رہا۔ یہاں تک کہ بدھ مت نے ترقی حاصل کر لی۔ اشوک کے زمانے میں بدھ مت اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ تقریباً چھ سو برس تک شمالی ہند میں بدھ مت مقبول رہا۔

مجموعی طور پر یہ شرک اور بت پرستی کا دور تھا۔ ذات پات کا تصور اسی دور کی پیداوار ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملے یعنی ۱۰۰۰ء تک وادیٔ کابل اور وادیٔ پشاور میں ہندو دھرم اور بدھ مت موجود تھے۔ ہندو شاہیہ گندھارا کے پال حکمرانوں کے زمانے میں ہندو دھرم نے ایک بار پھر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ شمال کی طرف سے اگرچہ سیتھین، پارتھین، ایرانی، یونانی اور ہن باشندے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے، لیکن ایک عرصہ تک یہاں سکونت پذیر ہونے کے بعد انہوں نے ہندی تہذیب کو اپنا لیا تھا۔

آرین باشندوں نے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقہ کا نام آریاورت رکھا۔ یہ علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ رفتہ رفتہ اس علاقے میں بڑے بڑے شہر تعمیر ہو گئے۔ رگ وید میں قدیم کول اور دراوڑ باشندوں کے بعض شہروں کے نام کے ساتھ پور کے لفظ کا اضافہ موجود ہے۔ پور کے معنی ایسے شہر کے ہیں یا قلعے کے ہیں جس کے گرد فصیل پائی جاتی ہو۔ آج تک نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ ہندوستان میں بھی ایسے شہر اور قصبے بکثرت موجود ہیں جن کے ناموں کے ساتھ پور کے لفظ کا اضافہ موجود ہے۔

ایرانی دور

۵۰۰ ق م میں سائرس اول نے بلوچستان اور افغانستان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہی ایرانی حکمران ہے جسے مولانا آزاد مرحوم اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قرآن کا ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم کے

بیان کے مطابق ذوالقرنین نے یاجوج اور ماجوج Ghogs & Meghogs اقوام کے تباہ کن حملوں سے اس زمانے کی مہذب دنیا کے دفاع کے لئے وہ دیوار تعمیر کی تھی جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ جدید تحقیقات بالخصوص مولانا آزاد کی قرآنی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج سے مراد شمال میں بسنے والی چینی اور روسی اقوام ہیں، ان اقوام میں تاتاری، منگول، ہن اور سیتھین وغیرہ سبھی اقوام شامل ہیں۔

دارائے اوّل کے دور میں گندھارا (وادیٔ پشاور) کا تمام علاقہ سلطنتِ ٹیکسلا کے وسیع علاقے سمیت ایران سلطنت میں شامل ہو چکا تھا؛ چنانچہ ہزارہ زیریں بھی جو اس زمانے میں سلطنتِ ٹیکسلا کا ایک حصہ تھا، ایران سلطنت میں شامل ہو گیا۔ چوتھی صدی کے وسط میں ایران کے بادشاہ شاپور نے کشن خاندان سے گندھارا اور ہزارہ زیریں کا علاقہ چھین لیا۔ اس طرح ایرانی غلبے کا مجموعی زمانہ تقریباً اڑھائی سو برس بنتا ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات میں ایرانی آتش کدوں کے کھنڈرات اب بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

ایرانی غلبے کی بدولت اس علاقے میں گبری اور دری زبانیں بولی جانے لگیں۔ پختو زبان میں زبانِ ایرانی کا ایک بڑا ذخیرہ اسی دور کی یاد دلاتا ہے۔ پشابور (پشاور) اور چارسدہ اس علاقے میں ایرانیوں کے دارالحکومت تھے۔ یوں تو اس علاقے میں ایرانیوں کے کئی حکمران گزرے ہیں، لیکن سائرس اور دارا سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایرانی دور میں مزدک اور زرتشت کے فلسفوں کی فکر ذہنوں پر غالب رہی۔ یہ دور آتش پرستی کا دور تھا۔ زمانۂ قدیم کی مہذب دنیا جس میں عراق (دار) یونان اور ایران شامل تھے، عرصۂ دراز تک آتش پرستی میں مبتلا رہ چکی تھی؛ چنانچہ گندھارا، ٹیکسلا اور پکھلی کے علاقوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ان غالب اقوام کے دینِ آتش پرستی کے اثرات ناگزیر تھے۔ قدیم ایرانیوں کے عقیدے کے مطابق اس کائنات کے دو خدا تھے۔ نیکی کے خدا کا نام یزداں اور بدی کے خدا کا نام اہرمن تھا۔ انسانی زندگی کو ان دونوں خداؤں کی باہمی کشمکش کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔

ایرانیوں کو مورخین نے آرین باشندے قرار دیا ہے۔ افغانستان، سرحد اور سلطنتِ ٹیکسلا کے علاقوں میں ایرانی النسل باشندوں کی اولادیں ابھی تک کثیر تعداد میں آباد ہیں، لیکن طویل تمدنی انقلابات کے بعد اب ان کی انفرادیت ختم ہو گئی ہے۔

یونانی دور

ایران فتح کرنے کے بعد سکندرِ اعظم نے ۳۲۶ء ق.م میں ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی۔ سوات، باجوڑ اور مہابن کے علاقے میں اساکین، اسپاسئی، اساسین اور تمام پکتوایک Paktuke (پختون) قبائل کو مطیع بنانے کے لئے اسے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ٹیکسلا کا راجہ امبھی Ambhi اطاعت کے لئے ہنڈ کے قریب اس کے حاضر ہوا؛ البتہ جہلم کے راجہ پورس نے اطاعت سے انکار کر دیا؛ لہٰذا سکندرِ اعظم نے اس پر چڑھائی کر دی۔ اگرچہ راجہ پورس شکست کھا کر گرفتار ہوا لیکن اس کے بہادرانہ جواب سے متاثر ہو کر سکندر نے مفتوحہ علاقہ اسے واپس کر دیا۔

پونچھ کے راجہ ابھی ساریز نے بھی سکندرِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی تھی؛ لہٰذا اس سے خوش ہو کر سکندرِ اعظم نے اسے ولایتِ پکھلی کا علاقہ بخش دیا۔ اسی بناء پر اس علاقے کا نام ابھی ساریز مشہور ہوا۔ سکندرِ اعظم کے بابل میں وفات پا جانے کے بعد اس کے یونانی جرنیلوں نے باختر Bactria کی یونانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس باختری یونانی سلطنت کی سرحدیں ہزارہ قدیم تک پہنچتی تھیں۔ یونانی مؤرخین نے اس زمانے کے حالات کو اپنی ڈائریوں میں محفوظ کر لیا؛ چنانچہ ہیرڈوٹس اور سیلوکس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پکٹیان یا پکتو ایک قبائل وادیٔ پشاور یعنی گندھارا میں مسکن پذیر تھے۔ اکثر مؤرخین کے نزدیک لفظِ پٹھان پکٹیان ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

چندر گپت موریا نے ہندوکش تک کا علاقہ یونانیوں سے چھین لیا اور شمالی ہند میں ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کر دی جو ہر لحاظ سے ملک کا دفاع کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اشوک کی موت یعنی ۲۳۲ ق.م تک تقریباً تمام شمالی ہند سلطنتِ موریا میں شامل ہو چکا تھا۔ مانسہرہ کے قریب پائی جانی والی اشوک کی چٹانیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس علاقے میں اشوک کی طرف سے اس کا بیٹا شہزادہ کنال اس کے وائسرائے کے طور پر حکمرانی کرتا تھا۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات میں اب بھی یادگار کنال موجود ہے۔ باختری یونانیوں کے ڈیمیٹرس Demetrius نے ۱۹۰ ق.م میں ایک بار پھر حملہ کر کے ٹیکسلا اور ہزارہ قدیم کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یونانی دور کا مشہور سیاسی مفکر چانکیہ تھا جو ٹیکسلا کے تاریخی شہر کا رہنے والا تھا۔ اس ہندی مفکر نے سیاست میں چالبازی اور مکر و فریب کی تمام صورتوں کو جائز قرار دے رکھا تھا۔ چندر گپت موریا نے اپنی سلطنت کے قیام اور استحکام کے لئے چانکیہ سے مشورے حاصل کئے تھے۔

سکندرِ اعظم کے بعد یہاں مشہور باختری یونانی حکمران سیلوکس، ڈیمیٹریس، مننڈر، ماؤس اور آذیز گزرے ہیں۔ یونانی اثرات کے تحت گندھارا آرٹ نے بہت ترقی کی۔ اس علاقے میں یونانی طب اور سکوں کی بھی ترویج ہوئی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ آفریدی دراصل یونانی Aparatai ہے۔ آفریدی اپنے آپ کو آپریدے

پکارتے ہیں۔ آفریدیوں میں یونانی خون کی آمیزش کا تذکرہ کرتے ہوئے سر اولف کیرو لکھتا ہے:

"A young Afridi might stand as a model for Appallo, while the Afridi elder can display the gravity of Zues".

یونانی دور آتش پرستی کے غلبے کا دور تھا۔ معاشرہ پر افلاطون اور ارسطو کے سیاسی اور سماجی فلسفوں کا رنگ غالب تھا۔ افلاطون کے سرگانہ معاشرے کے تصور نے استحصالی طبقوں کو جنم دیا۔ سائنسی اور پیشہ ورانہ علوم سے نفرت، کمین اور شریف کی مصنوعی تقسیم، حکمران طبقے کے لئے عورت اور جائداد کی اشتراکیت فکر افلاطون کے وہ بُرے نتائج تھے جو بالآخر یونانی معاشرہ کے زوال کا سبب بنے۔

ستھین یا ساکا دور:

ستھین باشندوں کا اصلی وطن پارتھیا، بلخ اور وادیٔ زرفشاں Sogdiana کے شمال میں تھا۔ یہ باشندے وادیٔ کابل کے راستے ہندوستان میں داخل ہوتے۔ قندھار کے ستھین حکمران ماؤس Mues نے سندھ کے اس پار حملہ کیا جس کے نتیجے میں ۹۰ ق م سے ۲۵ ق م تک یہاں ستھین راج قائم ہو گیا اور یونانی دور کا خاتمہ ہوا۔ ۲۵ء میں پارتھین حکمران گونڈوفیرز Gondophares نے آخری ستھین بادشاہ آذیز ثانی کو شکست دے کر سلطنتِ ٹیکسلا کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ٹیکسلا ہی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا، مگر اس کے بعد پارتھین داخلی انتشار کا شکار ہو گئے۔ ۵۰ء تک پارتھین راج بھی زوال پذیر ہو گیا۔

پختو زبان میں ساکا زبان کی بھی آمیزش موجود ہے۔ دُل ساکا دراصل آرمڑی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں بڑا لشکر۔ دُل ساکا ستھین قوم کی شاہی فوج کا نام تھا۔ لفظ دلازاک دُل ساکا ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے لسانیات میں س آسانی سے ذ کے ساتھ بدل سکتا ہے۔ قوم دلازاک کے عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں اس قوم کی اصل کی پوری وضاحت کی جائے گی۔ ستھین باشندے افغانستان اور سرحد کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ان علاقوں میں ستھین یا ساکا باشندوں کی آبادکاری کے کچھ [illegible] کو وہ حاصل ہوا اور کشن خاندان کے

لہ دی پٹھان مصنفہ سر اولف کیرو صفحہ ۴۴-۴۵

بدھ حکمرانوں کی حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ ستھین یا ساکا باشندے رفتہ رفتہ اپنے قدیم تمدن کو بھلا بیٹھے اور انہوں نے ہندی تہذیب کو اپنا لیا۔ دلازاکوں کے علاوہ آج مغربی پاکستان میں ایک بھی ایسا قبیلہ موجود نہیں جس کے متعلق وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہو کہ وہ ستھین یا ساکا قوم سے نسبی تعلق رکھتا ہے۔

کُشن دور:

کشن خاندان کے حکمران ترکی النسل تھے۔ مشہور روسی مستشرق بارتھولڈ Barthold ترکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے طبری اور ابن خرداد بہ کے حوالے سے Turkistan Down to Mongol Invasion (صفحہ ۹۶) میں لکھتا ہے کہ ترکستان میں کشنیا نام کا ایک مشہور ضلع تھا جس کا شہر کشنیا صوغد کے تمام شہروں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور بہت خوبصورت تھا، چونکہ کُشن خاندان کے حکمران ابتدائی زمانے میں اسی ضلع کے باشندے تھے، اس لئے ان کا لقب کشن شاہ مشہور ہوا تھا۔ ہن قوم کے حکمران بھی اس علاقے پر قابض ہونے کے بعد اپنے لئے یہی لقب استعمال کرتے رہے۔ مہاراجہ کنشک اس خاندان کا نامور حکمران تھا۔

تقریباً ۵۵ء میں بلخ کے کشن بادشاہ Kajula Kadphises نے پارتھین سے وادیٔ کابل کا علاقہ چھین لیا۔ بعدازاں اس کے بیٹے نے اپنی سلطنت کی حدود پنجاب، سندھ، پکھلی اور کشمیر تک وسیع کر لیں۔ ۱۰۵ء میں کشن راج یہاں مضبوطی سے قائم ہو چکا تھا۔ ۱۲۸ء میں کنشک تخت نشین ہوا۔ اس نے پشاور کو سرمائی دارالحکومت اور متھرا کو گرمائی دارالحکومت بنا لیا۔ کنشک نے اپنی فتوحات کا سلسلہ توران سے بنگال تک وسیع کر لیا۔ اسی کی کوششوں سے سرینگر میں بدھ علماء کی چوتھی کونسل کا اجتماع ہوا جس کے نتیجے میں بدھ ماہیان اور حنایان دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ گندھارا میں بُت گری کا آرٹ عروج پر پہنچ گیا۔ بدھ مت کی ترقی سے ہندو برہمن طبقے کی معاشرتی اجارہ داری پر کاری ضرب لگی، اس لئے انہوں نے بدھ مت کے خلاف منظم طریقے سے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ تا آنکہ ہندو راجپوت راجے ایک بار پھر پنجاب میں برسرِ اقتدار آ گئے۔

کشن حکمرانوں کا دوسرا نام یوچی yueh-chih قبائل بھی ہے۔ کابل کے ترکی شاہیہ حکمرانوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ کشن خاندان کے مہاراجہ کنشک کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے اس دعوے سے کشن حکمرانوں کے ترکی النسل ہونے کے تصور کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔

چوتھی صدی کے وسط میں ایران کے بادشاہ شاپور ثانی نے کشن خاندان سے گندھارا، ٹیکسلا اور ہزارہ قارلق کا علاقہ چھین لیا، مگر اس صدی کے آخر میں بلخ کے کشن حکمران کدارا نے حملہ کر کے ٹیکسلا اور ہزارہ قارلق کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر ۴۵۵ء میں ہُن قوم نے کشن خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ کشن اور بدھ مت کے عروج کا دور تھا۔ آج بدھ مت کا کوئی لٹریچر ہمارے پاس موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ بدھ کے دس اقوال یا ہدایات ہیں جو مختلف کتبوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ مہاتما بدھ کے بتوں کی پوجا اس کی وفات کے کئی سو سال بعد شروع ہوئی۔ کشن دور کے تہذیبی اثرات کے تحت ہی توران سے لے کر سلطنت ٹیکسلا تک کے تورانی النسل باشندوں بالخصوص ترکوں کی اکثریت نے بدھ مت قبول کر لیا تھا اور اسلام کی آمد تک ان کی اکثریت اسی کی پیروکار تھی۔

ہُن یا حیطال:

زمانہ قدیم میں ہُن منگولیا کے آوارز Avars کے ماتحت ہوا کرتے تھے اور ان کی زبان بھی مغولی تھی۔ ترک اور ہن اپنے سردار کے لئے خان اور بڑے خان کے لئے قاغان کا لقب استعمال کیا کرتے تھے۔ آرمینی مصنفین انہیں ہیپتال Hepthal اور عرب انہیں حیطال پکارتے تھے۔ ۴۵۵ء میں ہن قوم نے ہر طرف تباہی اور بربادی مچا دی۔ خوف کے مارے لوگ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور عرصہ دراز تک کوئی نیا شہر تعمیر نہ کیا جا سکا۔ ہزارہ قدیم کی بعض پہاڑی بستیاں اسی دور کی ہیں۔

ہن قوم کے غلبے کا زمانہ ۴۵۵ء سے ۵۵۶ء تک کا ہے۔ اس قوم کا مشہور حکمران تورامن تھا جس کا اثر مالوہ تک پہنچا۔ اس کے بعد مہرگل تخت نشین ہوا۔ مہرگل کا دارالحکومت سیالکوٹ تھا۔ ۵۵۰ء کے بعد اگرچہ ہُن قوم کو ترکوں اور ساسانیوں نے وسط ایشیا میں مسخر کر لیا تھا، لیکن پنجاب اور راجپوتانہ میں ان کا اثر دسویں صدی تک بھی قائم رہا۔ ہُن رفتہ رفتہ ہندی تہذیب کو اپناتے چلے، اس طرح چند صدیوں بعد ان کا اپنا الگ قومی وجود باقی نہ رہا۔ اس وقت افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں ہُن نام کا صرف ایک قبیلہ ہی لاتل پور کے علاقے میں آباد ہے اور لوگ انہیں جاٹ سمجھتے ہیں۔ سرحدی علاقے میں تورا اور مہرگل کے نام اسی دور کی یادگار ہیں۔

لہ انسائیکلوپیڈیا تاریخ اسلام، مرتبہ ولیم ایل لینگر، ترجمہ غلام رسول مہر صفحہ ۲۲۹

ہن اور گرجار دونوں ہندی تہذیب میں مدغم ہو کر کھشتری ذات میں داخل ہو گئے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی میں کشمیر ایک طاقت ور ریاست بن چکا تھا۔ کشمیریوں نے ۷۴۵ء میں قنوج کو شکست دے کر پنجاب کے بالائی علاقے پر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ ولایت پکھلی بھی کشمیر کے زیر نگیں ہو گئی۔ تقریباً دو سو برس تک یہاں کشمیریوں کا غلبہ قائم رہا اور اس کے بعد ترکی شاہیہ کی مضبوط حکومت قائم ہو گئی۔ ترکی شاہیہ کے حکمرانوں کا دارالحکومت کابل تھا اور ان کی مملکت کی سرحدیں کشمیر تک وسیع تھیں۔

ترکی شاہیہ کابل:

ترکی شاہیہ حکمرانوں کا ابتدائی دارالحکومت کابل تھا اور وہ بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ان حکمرانوں کا دعویٰ تھا کہ وہ کشن خاندان کے مشہور حکمران مہاراجہ کنشک کی اولاد میں سے ہیں۔ ترکی شاہیہ حکمرانوں کی سلطنت صوبہ سرحد، ٹیکسلا، ولایت پکھلی اور کشمیر تک وسیع تھی۔ ۸۷۵ء میں ساسانی جرنیل یعقوب بن لیث نے ترکی شاہیہ کے حکمران رتبیل کو شکست دی؛ لہٰذا اس نے اپنا دارالحکومت کابل سے لاہور منتقل کر دیا۔ ترکی شاہیہ کے آخری حکمران اپنے ہندو وزراء کے زیر اثر آ گئے۔ البیرونی لکھتا ہے کہ لگاترمن Lugaturman ترکی شاہیہ کا آخری حکمران تھا۔ اس کا ایک برہمن وزیر کلر نامی تھا۔ کلر نے لگاترمن کو دھوکے سے قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ کلر ہندو شاہیہ گندھارا کے حکمرانوں کا مورث اعلیٰ تھا۔ البیرونی ترکی شاہیہ کے حکمرانوں کو ترک بیان کرتا ہے۔ بعض مورخین نے ان کا لقب قابل شاہ بھی لکھا ہے۔

کشمیر میں شنکر ورمن Shankaravarman ترکی شاہیہ کا آخری حکمران تھا۔ ۱۰۲۱ء میں ہندو شاہیہ برہمن لالیا Lalliya نے شنکر ورمن سے اقتدار چھین کر کشمیر میں ترکی شاہیہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکی شاہیہ کابل کی حکمرانی کا زمانہ ۸۵۰ء سے ۱۰۲۱ء تک کا ہے، لیکن کشمیر میں ان کی حکمرانی ۱۰۲۱ء تک قائم رہی۔ اس زمانے میں ہزارہ کشمیر ہی کے تحت رہا۔ کابل کے بعد لاہور تحصیل صوابی اور ہنڈ اس زمانے کے مرکزی مقامات تھے۔

ہندو شاہیہ گندھارا:

جیسا کہ اوپر بیان کر دیا گیا ہے نویں صدی عیسوی میں ہندو شاہیہ گندھارا کے حکمرانوں کے مورث اعلیٰ کلر نے لگاترمن کو قید کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اس طرح یہاں ہندو شاہیہ گندھارا کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ مولانا

اکبر شاہ نجیب آبادی آئینۂ حقیقت نما میں لکھتے ہیں کہ ہندوشاہیہ کے حکمران نسلاً مغل تھے۔ ان حکمرانوں نے ہنڈیا کابل کی بجائے لاہور تحصیل صوابی ضلع مردان کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ کشمیر، پکھلی، ٹیکسلا، گندھارا اور وادیٔ کابل کا علاقہ تا بحد لمغان ہندوشاہیہ گندھارا کی سرحدی ریاست میں شامل تھا۔ ہندوشاہیہ کے حکمرانوں نے اپنے لئے پال کا لقب اختیار کیا ہوا تھا جس کے معنی محافظ یا نگہبان کے ہیں۔ بریکوٹ (سوات) کے مقام سے ایک کتبہ کھدائی کے دوران میں دستیاب ہوا ہے جس پر سنسکرت زبان میں یہ مرقوم تھا:

"مہد فرمانروائے اعلیٰ، شاہانِ عظمیٰ کے بلند مرتبہ شاہ اور مختارِ اعلیٰ سری جے پالا دیوا"

اس کتبے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعین مصر کی طرح زمانۂ قبل از اسلام کے ہندی حکمران بھی اپنے لئے ایسے ہی القابات استعمال کرتے تھے جن سے خدائی صفات کا اظہار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں وادیٔ پشاور کا نام گندھارا تھا۔ قبل ازیں اس علاقے کا قدیم نام آریانہ تھا۔ ہنڈ کو عرب مورخین نے اوہند لکھا ہے اور گندھارا کو انہوں نے القندھار لکھا ہے۔ لاہور تحصیل صوابی کو بعض مورخین نے غلطی سے لاہور پنجاب تصور کیا ہے۔ عرب لاہور کو الہور اور ترک لہاور پکارتے تھے۔ لاہور تحصیل صوابی کے قریب ہی مہابن ہے۔ اس دور میں یہاں ہندو دھرم دوبارہ مقبول ہو چکا تھا۔ ہزارہ کے رہنے والے تنولیوں اور سواتیوں کا قدیم مسکن یہی مہابن اور سوات کا علاقہ تھا۔ اس دور کا مشہور مورخ البیرونی جس نے ہندوستان میں بارہ برس گزار کر سنسکرت زبان پر عبور حاصل کیا تھا لکھتا ہے کہ ہندوشاہیہ گندھارا اور غزنوی ادوار میں سرحدی علاقے میں بسنے والے تمام قبائل وحشی جنگجو ہندو قبائل ہیں۔"

سر اولف کیرو لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں وادیٔ لوچی سے ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جو عربی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس پر ۸۵۷ء اور ۲۴۳ھ صاف صاف لکھی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اس علاقے میں ان دونوں زبانوں کا وجود تھا۔

ہندوشاہیہ گندھارا کے مشہور حکمرانوں کے نام سمند، کمالو، بھیم، جے پال، آنند پال اور تری لوچن پال تھے۔ انہوں نے لاہور تحصیل صوابی اور ہنڈ کے مراکز سے ۸۷۰ء سے ۱۰۲۱ء تک حکمرانی کی۔

مہاراجہ جے پال کے زمانے میں امیر سبکتگین نے غزنی میں ترکوں کی پہلی آزاد ترک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ جے پال نے ترک مسلمانوں کی اس اٹھتی ہوئی اسلامی ریاست سے خطرہ محسوس کیا اور اسے اس کی ابتدا ہی میں ختم کر ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ جے پال نے ۹۷۳ء اور ۹۷۹ء میں دو بار غزنی پر چڑھائی کی لیکن امیر سبکتگین نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

نقشہ توران

دریائے آرال
استرخان
بحیرۂ قزوین
قفقاز
قازقستان
بالکش
جھیل بالکش
بحیرۂ آرال
دریائے سیحون
ازبکستان
بخارا
ترمذ
تاشقند
ترکمانستان
ایران
قیرغیزیا
کاشغر
دریائے طارم
یارقند
ختن
چینی ترکستان
سنگیانگ
ایرتیش
قزان
سائبیریا
منگولیا یا منچولستان
کوہ التائی
تبت
پاکستان
پشاور
کابل
جلال آباد
ہرات
مزار شریف
افغانستان

اس وقت سے ترک مسلمانوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان طویل تاریخی کش مکش کا آغاز ہوتا ہے۔
گزشتہ صفحات میں ان تمام مغولی یا تاتاری النسل اقوام کا مختصر تذکرہ کر دیا گیا ہے جو توران کی سرزمین سے اٹھ کر نہ صرف ہندوستان بلکہ پرانے زمانے کی ساری مہذب دُنیا پر حملہ آور ہوتی رہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یوروپ دونوں طرف رُخ کرتے رہے۔ قدیم اور جدید مورخین کے نزدیک یہ تو قریب قریب متحقق ہے کہ شمالی چین اور روس کے علاقے میں بسنے والی یہی اقوام پرانے زمانے میں یاجوج ماجوج — یا Ghogs & Meghogs کہلاتی تھیں۔ انہی اقوام کے تباہ کن حملوں سے مہذب دنیا کا دفاع کرنے ایران کے بادشاہ خورس یا سائرس نے جسے قرآن نے ذوالقرنین پکارا ہے۔ ایک پختہ دیوار تعمیر کروائی تھی انہی اقوام کے حملوں سے بچنے کے لئے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کئے گئے تھے۔ دیوارِ چین کی تعمیر کا بڑا مقصد بھی یہی تھا۔ مسلمان مورخین کے علاوہ بائیبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں بھی ان اقوام کو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸، ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ بالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ ترک بھی اپنے آپ کو یافث کی اولاد بیان کرتے ہیں اور نسلاً یاجوج و ماجوج کو اپنے قریبی سمجھتے ہیں۔

زمانۂ قبل از اسلام میں جب ان اقوام نے برصغیر کا رُخ اختیار کیا تو یہاں ان کے مقابلے کی کوئی طاقت موجود نہ تھی۔ اس لئے وہ وقفے وقفے کے بعد پیش قدمی کرتی رہیں۔ ہندوستان کے شہری سماج اور ہندی تہذیب میں جذب ہو جانے کے بعد ان کی بود و باش، خوراک، لباس، زبان، مذہب اور عادات میں ایسے تغیرات رونما ہوتے کہ ان کی آئندہ نسلیں اپنے آباؤ اجداد سے قطعاً مختلف ہو گئیں۔ ان اقوام میں سے جس کسی کو ایک عرصہ تک اقتدار نصیب ہوا۔ وہ کھشتری ذات میں شامل ہو گئیں اور عوام انہیں راجہ کے لقب سے پکارنے لگے۔ مغربی پاکستان کے بیشتر راجپوتوں کا شجرہ نسب انہی اقوام میں سے چند ایک کے ساتھ جا ملتا ہے۔ ہزارہ قدیم کی بیشتر اقوام کا بھی انہی اقوام کی نسلوں سے ہونا بعید از امکان نہیں۔ ٹوڈ، سمتھ، ڈاکٹر بھندرکر اور ولیم بروک جیسے مصنفین نے اسی خیال کی تائید کی ہے۔ ٹیکسلا میوزیم کے شائع کردہ کتابچہ کا مندرجہ ذیل بیان بھی اس سلسلے میں قابلِ غور ہے:

"The Sythians or Sakas, the Parthions or Pahlawas, the Kushans and the Ephthalites or White Huns were all rally from the same stock of Turkomen or Turaniaus.

مؤرخین کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف افغانستان اور مغربی پاکستان بلکہ راجپوتانہ تک کے علاقے کے باشندوں کی اکثریت توران النسل باشندوں پر مشتمل ہے۔ وسط ایشیا ہی کا علاقہ مندرجہ بالا اکثر اقوام کا قدیم مسکن تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان اقوام کی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب میں تغیرات رونما ہوتے رہے۔ مغولی باشندے عرصہ دراز تک ملحد رہے۔ توران کے علاقے میں شمنی مذہب، مزدک اور زرتشت کی تعلیمات اور بدھ مت جیسے ادیان عرصہ دراز تک مقبول رہے اور بالآخر تمام تورانی باشندوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ترکوں کو بے مثل عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے چند صدیوں میں منگولیا اور توران بلکہ چین سے یوروپ اور ماسکو سے جنوبی ہند اور افریقہ کے ساحلی ممالک میں غلبہ حاصل کرلیا اور اٹھارویں صدی کے آغاز تک ان ممالک میں انہی حکمرانوں کے ناموں کا خطبہ و سکہ جاری رہا۔

The Archeological Museum and Monuments of Ancient Taxila. by M. Mohammad Hamid, 6th Edition, Page 10.

سیاسی اور معاشرتی زندگی

معاشرہ کی تشکیل میں جن بنیادی تصورات کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے ـــ ان میں مذہبی افکار کو ہمیشہ سے اولیت حاصل رہی ہے ـــــ خالق کائنات، عالم آخرت، انسان اور اس کے مقصدِ حیات کے تصورات نے ہمیشہ سے انسانی زندگی کا رُخ متعین کیا ہے۔ انسانی زندگی کی معاشرتی اور اخلاقی قدریں بالعموم مذہب ہی نے فراہم کی ہیں اور ہر قوم کے سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے میں ان قدروں کو ہمیشہ سے روح کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ زمانہ قبل از اسلام میں ہمارے ملک کے سیاسی اور معاشرتی نظام کی بنیادیں عیسائیت یا یہودیت کی تعلیمات پر نہیں بلکہ آتش پرستی، ہندو دھرم اور بُدھ مت کی تعلیمات پر اٹھائی گئی تھیں۔ اس زمانے میں یہ ادیان یا تو سرے سے ناپید ہو گئے ہیں اور یا پھر اتنے روبزوال ہو چکے ہیں کہ ان کی اصل تعلیمات کو دریافت کرنا محال ہو گیا ہے، لیکن زمانۂ قبل از اسلام میں یہ ادیان توران کی سرزمین سے لے کر جاپان تک اور ایران کی سرحدوں سے لے کر برما تک کے تمام درمیانی علاقوں میں صدیوں سے غالب رہ چکے تھے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان بلکہ برصغیر کے ان مذاہب میں اتنی کشش موجود تھی کہ توران کی سرزمین سے اٹھ کر برصغیر کے ممالک پر حملہ کرنے والی تمام اقوام نے رفتہ رفتہ ہندی مذاہب کو قبول کر لیا تھا۔ ان غالب اقوام کو ہندی معاشرہ میں کھشتریوں کا مقام حاصل ہو گیا اور ان کے حکمران راجے کہلانے لگے۔ غالب اقوام کے ہمراہ جو دوسری اقوام برصغیر میں داخل ہوتی رہیں، انہیں کمتر ذاتوں میں شامل کیا جاتا رہا۔ اس طرح زمانہ قدیم سے ہندی معاشرے میں بیرونی حملہ آور افراد کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بظاہر حیرت ہوتی ہے کہ یہ فاتح اقوام کیونکر حکمرانی کرنے کے باوجود ہندی معاشرے میں ایسی گم ہوئیں کہ ان کا الگ وجود تک بھی باقی نہ رہا، لیکن تاریخ کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کے پیشِ نظر سیاسی اور معاشرتی برتری حاصل کرنے کے علاوہ نہ تو کوئی اور بلند تر نصب العین تھا اور نہ ہی وہ کسی ترقی یافتہ تہذیب کے علمبردار تھے ـ

حملہ آوروں کے مقابلے میں ہندی باشندے اپنی قوتِ بازو کا لوہا نہ منوا سکے، لیکن ان کے ذہن ہندی نے بیرونی حملہ آوروں کے ذہن فتح کر لئے اور اس طرح فاتح مفتوح بن گئے۔ ان قدیم فاتحین کے برعکس جب ترکوں نے اسلام قبول کر لیا اور وہ اسلامی تہذیب کے علمبردار بن کر جذبۂ جہاد کے ساتھ برِ صغیر پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے ہندوؤں کو میدانِ جنگ میں شکست دینے کے ساتھ ساتھ وحیِ الٰہی کے زور سے ذہن ہندی کو بھی مسخر کر لیا اور اس طرح کم از کم افغانستان اور پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت وجود میں آگئی۔ اگر ترکوں کے پاس اسلام نہ ہوتا تو ان کا حشر بھی ان کے پیشروؤں سے کسی طرح مختلف نہ ہوتا۔

زمانہ قبل از اسلام میں ہندی معاشرہ پر ویدوں کی تعلیمات کے علاوہ منوجی مہاراج اور بدھ مت کے معاشرتی اور عمرانی فلسفوں کا رنگ غالب تھا۔ ایرانی اور یونانی آتش پرستی کے دور میں زرتشت، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات اگرچہ عوامی سطح تک پہنچ چکی تھیں، لیکن ایرانی اور یونانی اقوام کے سیاسی غلبے کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کے عمرانی فلسفوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اور مجموعی طور پر یہاں ہندو دھرم اور بدھ مت کا غلبہ قائم ہو گیا۔

منوجی مہاراج کے سیاسی اور معاشرتی فلسفے کے وجود میں آنے سے قبل آریاؤں میں ویدک تہذیب پیدا ہو چکی تھی۔ اس قدیم ترین تہذیب کی علمی بنیادیں چار ویدوں یعنی رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید پر اٹھائی گئی تھیں۔ ویدوں سے دوسرے درجے پر قدیم برہمنوں کے پران تھے جن کی تعداد البیرونی نے اٹھارہ بیان کی ہے۔ کھشتری دور کے قیام کے بعد رامائن اور مہابھارت جیسی اہم تاریخی کتابیں مرتب ہوئیں۔ مندرجہ بالا کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات پات کی ابتدا اور اصل اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جبکہ سفید فام آرین باشندوں نے کالے یا سیاہ فام کول اور دراوڑ باشندوں پر سیاسی غلبہ حاصل کیا تھا۔ منوجی مہاراج نے منوسمرتی لکھ کر ذات پات کے نظام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔ ابتدائی طور پر چار مشہور ذاتیں یعنی برہمن (علماء) کھشتری (سپاہی اور سیاست دان)، ویش (کسان) اور شودر (کمین) وجود میں آئیں۔ اگرچہ ذات پات کا ایک مقصد تقسیم محنت بھی تھا، لیکن ان پیشوں کی بنیاد پر اس نظام نے ہندو معاشرے کو مراعات یافتہ اور استحصالی طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ برہمن مستقل طور پر مذہبی تعلیمات کے امین بنا دیے گئے اور انہیں وہ مراعات دے دی گئیں جن سے معاشرے کے دوسرے افراد محروم تھے۔ حکمرانی کا منصب کھشتریوں کے پاس چلا گیا۔ یہ منصب انہیں باپ دادا کی طرف سے وراثت کے طور پر ملتا تھا۔ کھشتری راجپوت کہلائے اور حکمران کے لئے راجہ کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ زراعت ویش اور کول کا آبائی پیشہ بن گئی اور [illegible] دراوڑ باشندوں کو شودر بنا لیا گیا۔

اعلیٰ ذاتوں کے افراد سائنسی علوم اور پیشہ ورانہ زندگی سے نفرت کرنے لگے۔ کمین لوگوں کے لئے معاشرتی انصاف کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ ہندی معاشرہ کے ذات پات کا نظام افلاطون کے سہ گانہ معاشرے سے کسی قدر ملتا جلتا تھا۔ اس قدیم یونانی مفکر نے بھی معاشرہ کو اہلِ علم، سپاہیوں اور کمین پیشہ ور لوگوں کے تین طبقوں میں تقسیم کر کے انسانوں کو مختلف جکڑ بندیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہندی تہذیب میں عورت کا مقام بلند نہ تھا ستی کی رسم عام تھی۔ اس رسم کے مطابق خاوند کے مر جانے پر بیوی چتا میں چھلانگ لگا کر جل مرتی تھی! وراثت میں عورت کا کوئی حصہ نہ تھا۔ عورت اور دولت مندوں کی زینت بنے رہتے تھے۔ سالانہ عرس کے مواقع پر دان پُن پیش کرنے کے بعد صاحبِ استطاعت لوگوں کو زناکاری کی عام اجازت تھی۔ روسا کی بیٹیوں کی شادیوں کے موقع پر سوئمبر کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ کول اور دراوڑ باشندے مُردوں کو قبرستان میں دفن کیا کرتے تھے، لیکن آریائی تہذیب نے عروج کے وقت مُردوں کو جلانے کی رسم شروع ہو گئی۔

مذہبی زندگی

ہندو دھرم آریائی دور کا قدیم مذہب تھا۔ زبانِ ایران کی رُو سے ہندو کے معنی چور یا کالے کے ہیں لیکن ہندو روایت کے مطابق اصل لفظ ہندو نہیں، بلکہ سندھو تھا جو بگڑ کر ہندو بن گیا۔ ہندو دھرم کا جائزہ کے لئے ان مذہبی اصطلاحات پر غور کرنا ضروری ہے جو ہندی لٹریچر میں موجود ہیں۔ اگرچہ آج آریائی سنسکرت موجود نہیں، لیکن ہندوؤں کی مروجہ مذہبی اصطلاحات سے اتنا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے تصورات کے لحاظ سے ہندو دھرم، بلکہ بدھ مت بھی قدیم سامی مذاہب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ مندرجہ ذیل اصطلاحات کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

خدا کے نام:

ہندی لٹریچر میں خدا کے مندرجہ ذیل نام موجود ہیں:

بھگوان، ایشور، لہر، ویشنو، پرماتما، پرمیشور، مہادیو، برہما، پربھو وغیرہ خدا کے ان ناموں کے معانی سے اس کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان ناموں کے مفہومات اسلام سمیت اکثر سامی مذاہب کے خدائی ناموں سے ملتے جلتے ہیں، چونکہ ہر مذہب کے عقائد کی بنیاد اس کے تصورِ باری پر ہوا کرتی ہے، اس لئے یہ گمان کرنے کی گنجائش

موجود ہے کہ قدیم ہندو دھرم کی بنیاد الہامی تھی۔ اگرچہ خدا کے ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا اظہار ہوتا تھا، لیکن ذاتِ الٰہی کے جسمِ انسانی کے اندر اتحاد و حلول کے نظریے نے رفتہ رفتہ توحید کے اصل تصور بگاڑ دیا تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ ذاتِ الٰہی انسانی صورت میں اصلاحِ عالم کے لئے آیا کرتی ہے؛ چنانچہ برہما پہلا انسان تھا جو خدا کی خواہش کے مطابق ایک پھول سے پیدا ہوا۔ برہما کے معنی مبداء خلق کے ہیں۔ برہما کے بائیں بازو سے اس کی ساتھی دیوی پاربتی پیدا ہوئی۔ جب برہما نے پسینہ پونچھا تو اس سے سات مرد پیدا ہوئے۔ پھر ایک طوفان اٹھا جو ۱۲۰ سال ۵ مہینے اور پانچ روز تک جاری رہا۔ اس کے بعد برہما اور اس کی استری کے وجود سے انسان پیدا ہونے شروع ہوئے۔ انسان کی تخلیق کے بارے میں ہندوؤں کا یہ بنیادی نظریہ تھا۔ اپنی ذات کو بلند و بالا ثابت کرنے کا جنون اتنا بڑھ چکا تھا کہ راجپوت راجاؤں کا ایک خاندان اپنے آپ کو سورج بنسی یعنی سورج کی اولاد کہلاتا تھا۔ رامچندر جی سورج بنسی ہی تھے۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ مختلف دھرم اوتاروں کی صورت میں خدا خود صورتِ محسوس میں جلوہ گر ہو کر اصلاحِ عالم کا عظیم کارنامہ ادا کیا کرتا ہے۔

جنت اور جہنم:

آریائی دور میں جزا و سزا کے لئے جنت اور جہنم کا تصور موجود تھا۔ جنت کو سورگ اور بیکنٹھ پکارا جاتا تھا۔ سورگ کو وہ مقام خیال کیا جاتا تھا جہاں دیوندر اپنی حسین بیویوں سمیت رہتا ہے۔ ۳۳۰ دیوتا اس کی معیت میں وہیں سکونت پذیر تھے۔ بیکنٹھ میں وشنو اپنی دو بیویوں سمیت رہتا ہے۔ تیسرا مقام کیلاشام ہے جس میں رودر اپنی بیویوں سمیت رہتا ہے چوتھا مقام برہما لوکان اور پانچواں میلم پدن یا پروما وستو ہے۔

ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق دوسرے چھ عالموں کے نتیجے جہنم یعنی نرگ ہے جس میں شیوم یام رہتا ہے۔ چترگپتم گناہ و ثواب کا حساب محفوظ رکھتا ہے۔ زہریلے جانور اور بدکار لوگ نرگ میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق جنت یعنی سورگ میں ایک جنتی درخت کا تصور بھی موجود تھا جس کا نام کلپ برچھ تھا۔

جنت اور جہنم کے اس تصور سے انسانی اعمال کی جزا و سزا کی ایک خاص صورت سمجھ میں آسکتی تھی، لیکن آواگون یعنی تناسخ کے عقیدے نے جزا و سزا کے تصورات میں عجیب الجھاؤ پیدا کر دیا۔ تناسخ کے قائلین نے اسی دنیاوی زندگی کو جزا و سزا کا مقام قرار دے دیا۔ اسلام اور دیگر سامی مذاہب کی تعلیمات کے مطابق یہ عالم دار الجزا نہیں بلکہ امتحان اور آزمائش کا مقام ہے، مگر تناسخ کے قائلین کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو اس کے

پہلے جنم کے کرم بھوگ یعنی اعمال کے نتیجے میں دوبارہ نئی زندگی عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ انسان بار بار کسی انسان یا زہریلے جانور کی شکل میں پیدا ہو سکتا ہے اور اس طرح انسان اسی ہزار جون تک بھی بدل سکتا ہے۔ آواگون کے عقیدے کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو سوسائٹی میں جانداروں کو اذیت پہنچانا یعنی جیو ہتیا کبیرہ گناہ قرار پایا۔ یہ اسی عقیدے کا اثر تھا کہ ہندوؤں کے ہاں گوشت خوری ممنوع تھی، بلکہ وہ چمڑے کے جوتے تک بھی نہیں پہنتے تھے۔ اُس زمانے میں علم نباتات ترقی یافتہ نہ تھا، ورنہ اس عقیدے کی رو سے شاید سبزیاں اور پھل کھانا بھی ناجائز ٹھہرا دیا جاتا، کیونکہ علم نباتات کی رُو سے یہ چیزیں بھی جاندار ہی ہیں۔ تناسخ کے قائلین درحقیقت اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ یہ محدود عالم کسی طرح دارالجزا بن ہی نہیں سکتا۔ ایک انسان بعض اوقات ایسا غلط عقیدہ رائج کر دیتا ہے جس کے تباہ کن اثرات ہزاروں سالوں تک انسانی زندگی پر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ظالم حکمران اور بدکار افراد ایسے مظالم اور گناہوں میں ملوث ہو جاتے ہیں جن سے لاکھوں انسانی زندگیاں متاثر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض نیک لوگ اتنے اچھے اعمال سرانجام دے جاتے ہیں جن کے اچھے اثرات ہزاروں سالوں تک انسانی زندگی میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ پیغمبروں اور صالحین کو اس دنیاوی زندگی میں ان کی قربانیوں اور خدمات کا صلہ دینا ممکن ہی نہیں، لہٰذا جزا و سزا کے لئے یہ انسانی زندگی اور یہ عالم شہادت کافی نہیں، بلکہ اس مقصد کے لئے ایک اور ہی عالم کی ضرورت ہے جس میں انصاف کے تقاضے بہترین صورت میں پورے ہو سکیں۔ ویدانت فلسفہ فنا کو زندگی کی معراج قرار دیتا ہے لیکن اسلام فنا کے بعد بقا کے بلند مرتبے کو کمالِ انسانیت قرار دیتا ہے۔

فرشتے اور شیطان:

فرشتوں کو دیوتا یا دیوی کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ہندو فرشتوں کی تذکیر و تانیث کے قائل تھے اور مشرکین عرب کی طرح انہیں انسانی زندگی میں دخیل سمجھتے تھے۔ شیطان کو بھوت کہا جاتا تھا اور اس کی مؤنث کو بھتنی پکارا جاتا تھا۔ بھوت اور بھتنی کے آسیب کو دُور کرنے کے لئے برہمن لوگ خاص قسم کے منتر پڑھا کرتے تھے۔ فرشتوں کی رضا حاصل کرنے کے لئے ان کی پوجا کی جاتی تھی۔

ہندو علماء و صوفیاء:

ہندو علماء و صوفیاء کے مشہور نام یہ تھے: دھرم گیانی (عارف)، پنڈت (معلم)، بھگت (عابد)، پریمارک

(مبلغ)، بھکشو (بدھ فقیر) گرو (پیر) گرو گھنٹال (پیرانِ پیر) رشی اور منی (قطب الاقطاب) علاوہ ازیں دھرم چاری برہمچاری جوگی اور سنیاسی بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ روح کو آتما کہا جاتا تھا جو کہ نروان حاصل کر کے ذاتِ الٰہی میں فنا حاصل کر سکتی تھی۔ نر کی روح کو نر اور مادہ کی روح کو مادہ تصور کیا جاتا تھا۔

جسمِ انسانی میں ذاتِ الٰہی کے حلول و اتحاد کے نظریے نے بت پرستی کو جنم دیا۔ دھرم اوتاروں کے بُت تراش کر کے دراصل تصورِ شیخ کی ایک صورتِ محسوس ایجاد کر لی گئی تھی۔ پریت یعنی محبت یا عشق کو خدا سے تعلق جوڑنے کا سب سے بڑا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ ٹھاکر دوارہ، مندر، پاٹ شالہ اور دھرم شالہ عبادت اور تبلیغ کے بڑے بڑے مراکز ہوا کرتے تھے۔ مندروں میں سنکھ (ناقوس) بجا کرتے تھے۔ موسیقی کے ساتھ بھجن (مدح و ثنا) گاتے جاتے تھے۔ کتھا (مذہبی کہانی) اور دھرم اپدیش (وعظ) سنائے جاتے تھے۔ مختلف اقسام کے منتر پڑھے جاتے، مورتی پوجا کی جاتی اور پوجا پاٹ کے بعد پرارتھنا (دُعا) بھی کی جاتی تھی اور بتوں کے ناموں پر قربانیاں دینے اور نذر و نیاز دینے کا رواج عام تھا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ برہمن کو جو کچھ دیا جائے گا اگلے جنم میں، اس کا پھل ضرور ملے گا۔ خدا کے علاوہ دھرم اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کے نام یاد کرنے کے لئے مالا یعنی تسبیح استعمال کی جاتی تھی۔ لوگ کرم ریکھ یعنی تقدیر پر ایمان رکھتے تھے اور ایک زمانے تک نیکی کو قائم رکھنے کے لئے دھرم یُدھ یعنی جہاد کو بھی درست قرار دیتے رہے۔ کرم (نیکی)، پوجا (عبادت)، اور تزکیۂ نفس کو مکتی (نجات) حاصل کرنے اور شانتی (اطمینان) حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ عوام تیرتھ یاترا یعنی زیارت اور سالانہ عرس کے لئے دُور دراز مقامات تک سفر کیا کرتے تھے۔

ولایتِ بنگال میں دریائے کشن گنگ اور سندھ کا کنارہ تیرتھ یاترا کے لئے مشہور تھا۔ تور بیلہ کے مقام پر پہلی بیساکھ کو میلہ منایا جاتا تھا۔ مانسہرہ کے قریب چٹی گٹی کے مقام پر لنگ پوجا ہوا کرتی تھی۔ بریٹری کی پہاڑی دُرگا شٹمی کی پوجا کے لئے مشہور تھی۔ دریائے سندھ کے دوسرے کنارے کے قریب مہابن کا علاقہ درویشوں کا گڑھ تھا۔

جوگی، سنیاسی اور دیگر متصوفین ترکِ دُنیا کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہ حضرات اپنے جسموں پر بھبھوت (سواہ) مل لیا کرتے تھے۔ پیشانی اور پلکوں پر تلک لگانے اور سندور ملنے کا رواج عام تھا۔ گرہستی یعنی عائلی زندگی بسر کرنے کے بعد برہمچاری بننے کو بڑا مفید تصور کیا جاتا تھا۔ لوگ صوفیاء کی لوگ شکتی یعنی کرامات پر یقین رکھتے تھے۔ سادھوؤں کا دعویٰ تھا کہ وہ سانس روک کر ہر صدی کے اختتام پر اپنی کایا کلپ کر سکتے تھے اور اس طرح ان کی عمر چار پانچ صدیوں تک بھی طویل ہو سکتی تھی۔ ان کے ہاں دھیان (مراقبہ) اور

پاس انفاس (حبسِ دم) کے کئی طریقے رائج تھے۔ چھوت چھات اتنی زیادہ تھی کہ برہمن لوگ غیر ہندو کے جسم چھو جانے سے بھی بھرشٹ یعنی پلید ہو جاتے تھے۔

مندرجہ بالا ویدانت فلسفہ اور یوگا کا مخصوص نظام آریائی دَور سے ہندو شاہیہ گندھارا کے دور تک برِصغیر میں جاری رہا، بلکہ اسلام کی آمد کے بہت عرصہ بعد تک بھی مغربی پاکستان کے علاقے میں اس کے اثرات باقی رہے۔ ہندو ویدانت فلسفے سے تمام بیرونی حملہ آور اقوام متاثر ہوتی رہیں، یہاں تک کہ جزوی طور پر مسلمان صوفیاء کے سلسلے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ محتاط انداز میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی طور پر تمام سامی مذاہب کی طرح ہندو دھرم اور بُدھ مت کی بنیادی تعلیمات کا سرچشمہ الہامِ ربانی اور وحیِ الٰہی ہی ہوگی، لیکن برہمنوں نے اپنے مخصوص مفادات کے پیشِ نظر علمائے یہود کی طرح مذہبی کتب میں ترامیم یا اضافے کر ڈالے اور اس طرح اہلِ علم کی من مانی تفاسیر نے قدیم آریائی ادیان کی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ مذہبی تعلیمات کا بیش بہا خزینہ شرک اور توہمات کی بھول بھلیوں کی ایسی صورت اختیار کر گیا کہ البیرونی جیسا انتھک محقق بھی بارہ برس کی مسلسل جدوجہد کے باوجود ہندی ادیان کا اصل چہرہ دریافت کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔

اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ ہمارا خانقاہی تصوف جزوی طور پر ویدانت فلسفے سے متاثر ہوا ہے۔ یہ تو حضرت علی الہجویری، حضرت شیخ احمد سرہندی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے بزرگوں کا احسان ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے اسلامی تصوف کو ویدانت فلسفے اور ہندی یوگا کے نظام سے ممتاز کر دکھایا۔ ورنہ رہبانیت، ترکِ دنیا، وحدت الوجود اور تصورِ شیخ کے غیر مسنون طریقے شہنشاہِ اکبر اور داراشکوہ کی طرح لاکھوں مسلمانوں کو شرک اور گمراہی کی آخری منزل تک لے جاتے۔

ترک مسلمانوں اور تاتاری النسل ہندو شاہیہ گندھارا کے پال حکمرانوں کی باہمی کشمکش کا آغاز غزنوی دور میں ہوا۔ اس وقت ترک مسلمان اس اسلامی تہذیب کے علمبردار تھے۔ جو بقولِ علامہ اقبال سامی باپ اور آریائی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اور ان کی صفوں میں "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کا منظر دکھائی دیتا تھا، لیکن ان کے مقابلے میں چھوت چھات کا مارا ہندی معاشرہ تھا۔ شریف و کمین کی مصنوعی تقسیم، سائنسی علوم سے نفرت اور استحصالی طبقوں کی بہتات نے اسے روبہ زوال کر دیا تھا۔ شرک اور بُت پرستی اپنی انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ جب ہندی باشندوں نے اسلام کے معاشرتی انصاف کو اپنی

آنکھوں سے دیکھا تو وہ جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ ترک حملہ آوروں کی تلوار اور مسلمان علماء و صوفیاء کی قلم و زبان نے سیاسی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہندی باشندوں کے ذہنوں اور دلوں کو بھی فتح کرنا شروع کر دیا۔ چند صدیوں کے اندر اندر شرک و بُت پرستی کے تمام اہم مراکز میں توحید کے جھنڈے گاڑ دیئے گئے۔ افغانستان اور اور شمالی ہند کے تمام علاقوں میں عوام کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اگر اسلام محض تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا، تو پھر اس کے علمبرداروں کا حشر ستھین، پارتھین، ایرانی، یونانی اور ہُن حملہ آوروں کے حشر سے مختلف نہ ہوتا اور مسلمان بھی اسی طرح ہندی تہذیب میں اپنے آپ کو مدغم کر کے بے نام و نشان بن گئے ہوتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برِصغیر میں تقریباً آٹھ سو برس تک حکمرانی کرنے اور تقریباً دو سو برس تک غیروں کی غلامی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود ابھی تک کم از کم افغانستان اور پاکستان کے ممالک میں اسلامی تہذیب کا غلبہ موجود ہے جو مسلمان ہندوستان میں اقلیت بن چکے ہیں، وہ بھی کسی طرح اسلامی تہذیب سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ محض تلوار کے زور سے پھیلے ہوئے دین میں یہ سکت آخر کہاں سے آ سکتی ہے۔

ولایت پکھلی میں اسلام کا تعارف غزنوی دور ہی میں ہو چکا تھا، لیکن غوریوں کے عہد میں پہلی بار یہاں ترک مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ سلطنتِ دہلی کے زمانے میں ولایتِ پکھلی کی سرحدات میں اکثر و بیشتر سیاسی تغیرات رونما ہوتے رہے اور امیر تیمور کے حملے کے بعد یہاں ترک مسلمانوں کا مستقل غلبہ قائم ہو گیا جو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ابتدا تک قائم رہا۔ اس طویل عرصے میں اسلامی تہذیب کے اثرات رفتہ پھیلتے رہے۔ یہاں کے باشندوں میں اسلام کی محبت اتنی جاگزیں ہوئی کہ انہوں نے سابقہ ذاتوں اور گوتوں کو بھلا دیا۔ ان میں سے بعض لوگ اتنے انتہا پسند واقع ہوئے کہ انہوں نے عربوں کے ساتھ اپنا شجرہ نسب جوڑنے کی مضحکہ خیز کوششیں شروع کر دیں، حالانکہ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ گروہی طور پر اس علاقے میں عربوں کے کسی قبیلہ کی آمد ثابت نہیں ہوتی۔ جو قبائل یا افراد کسی نہ کسی طرح عربوں سے اپنا نسلی تعلق جوڑنے پر مُصر ہیں، انہیں تاریخی طور پر اپنی آمد ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دریافت کرنا ہوگا کہ ان سب اقوام کو کب سے زمین نگل گئی جن کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں کر دیا گیا ہے اور جن کی آمد اور حکمرانی کا ثبوت ناقابلِ تردید تک موجود ہے۔ عربوں میں سے صرف بنو امیہ کی ایک فوج کا محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور ہونا ثابت ہے، لیکن یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ایک سال کے اندر اندر ہی محمد بن قاسم کو واپس طلب کر کے نئے اُموی خلیفہ نے جیل میں ڈال دیا تھا اور اس طرح عرب ملتان سے آگے یا راجپوتانہ کی سمت میں مزید پیش قدمی نہ کر سکے، بلکہ

انہیں راجپوتانہ کے باپا راول کے ہاتھوں ہزیمت بھی اٹھانا پڑی۔ تعجب کی بات ہے کہ مغربی پاکستان یا ہمارے ہاں کا کوئی قبیلہ اُموی ہونے کا دعویدار نہیں، حالانکہ عربوں میں سے صرف بنو امیہ ہی کی فوج نے سندھ پر حملہ کیا تھا اور سندھ میں اگر کسی عرب قبیلہ کی موجودگی کا غالب امکان ہو سکتا ہے تو وہ بنو امیہ ہی ہو سکتا ہے۔

ترکوں کے زوال کے زمانے تک اگرچہ پرگنہ ہزارہ قارلق اور مکھلی سرکار کی بیشتر ہندو اور بدھ آبادی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی؛ تاہم بعض برہمن اور کھتری خاندان ایسے بھی تھے جو بدستور ہندو دھرم پر سختی سے قائم تھے۔ ان برہمنوں اور کھتریوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اس علاقے کے برہمن، برہمنوں کی سرسوت شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ منہیال، بھموال، بنجاتی اور لان جیسی ذیلی شاخوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ برہمنوں میں سے بعض کو مہاجن بھی پکارا جاتا تھا۔ برہمن ذات کے ہندو اگرچہ ملازم پیشہ بھی تھے، لیکن ان کی اکثریت دان پن (خیرات) پر بسر اوقات کرتی تھی۔ کھتریوں کی مشہور شاخیں اروڑہ، لبانہ، سُنار، بھاٹیہ اور گکھران تھیں۔ کھتریوں کا آباتی پیشہ دکانداری تھا۔ دیہاتی آبادیوں میں زیادہ تر گکھران اور بنجاتی قبیلوں کے ہندو دکانداری کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ سکھوں کے غلبے کے زمانے میں بعض منہیال اور بھموال برہمنوں نے سکھ مذہب قبول کر لیا تھا۔ ان سکھوں کی آبادی کا بیشتر حصہ ڈھونڈ اور کرڑال اقوام کے علاقے میں آباد تھا۔

قدیم ہندو تہذیب کے اثرات اب بھی جزوی طور پر اہل ہزارہ کی سماجی زندگی میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ سنسکرت اور دیگر ہندی زبانوں کے الفاظ بڑی کثرت کے ساتھ ہندکو بالخصوص پہاڑی ہندکو زبان میں مستعمل ہیں۔ ہمارے بیشتر مواضعات مثلاً اوگی، شنکیاری، دمبتوڑ، مانگلی، ماتکراتے، راجدہانی، چھتڑی وغیرہ جیسے سینکڑوں نام ہندی الاصل زبانوں کے ہیں۔ جیسا کہ قدیم اقوام ہزارہ کے حالات سے معلوم ہوگا۔ اہلِ ہزارہ کے اکثر قبائل اور ان کی ذیلی شاخوں کے اجداد کے اکثر نام بھی ہندی الاصل زبانوں کے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسومات میں ہندی تہذیب کے اثرات ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ پرانی تہذیب ہی کا اثر ہے کہ اب تک بعض قبائل میں بیوہ کی شادی کو معیوب تصور کیا جاتا ہے اور بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دار بنانے کی ممانعت کی جاتی ہے؛ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پختون علاقے کی طرح یہاں دُختر فروشی، سود خوری اور اغوا کر کے روپیہ بٹورنے کے واقعات کبھی نہیں ہوئے اور بحیثیتِ مجموعی اہلِ ہزارہ کیسے مسلمان بنے رہے۔

٭

باشندے

گوجر:

گوجر یا گجر نہ صرف ہزارہ قدیم بلکہ مغربی پاکستان بھر کی اقوام میں سے ایک مشہور قوم ہے۔ ان کی اصل کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کیپٹن ویس سجھ، راورٹی، واٹکلے اور سر اولف کیرو سابق گورنر صوبہ سرحد گوجروں کو وہ گرجار تسلیم کرتے ہیں جو چھٹی صدی کے اوائل میں ہن یا ہیطال قوم کے ہمراہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ہن حکمران تھے اور گوجر ان کے ماتحت کھیتی باڑی کا کام کیا کرتے تھے۔ بعض مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ لفظ گوجر "گتوچر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ان کے خیال میں گوجر آریائی دور کے ویش یا کھشتری ہیں۔

بظاہر مصنفین کی ان آراء میں اختلاف نظر آتا ہے، لیکن شمالی ہند کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔ گزشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام بیرونی حملہ آور اقوام کچھ عرصہ ہندوستان میں حکمرانی کرنے کے بعد ہی ہندی تہذیب میں مدغم ہوتی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کا اپنا الگ وجود تک باقی نہ رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہیون سانگ ساتویں صدی کے اوائل میں راجستھان کے علاقے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ جنوبی راجستھان کی گرجار ریاست سب سے زیادہ باوقار تھی۔ ہیون سانگ نے جب اس گرجار ریاست کی سیاحت کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی غیر ملکی اصل کے باوجود یہاں اسے کھشتری تصور کیا جاتا تھا۔ ہن قوم کے زوال کے بعد جب گوجر شمالی ہند میں پھیلے پھولے تو انہوں نے پنجاب اور راجپوتانہ کے علاقوں میں اپنی بستیاں تعمیر کر لیں۔ انہیں اپنی قدیم زبان بھول گئی اور سنسکرت زبان ان کی مادری زبان بن گئی۔ بدھ مت کے عروج کے زمانے میں گوجروں کی اکثریت نے اسے قبول کر لیا۔ بدھ ازم برہمنوں کے استحصال کے ردِ عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا

ہن قوم کے زوال کے بعد نویں صدی میں ہندو دھرم کو ایک بار پھر افغانستان، پاکستان اور کشمیر کے علاقوں میں غلبہ حاصل ہوگیا۔ ترکی شاہیہ کابل کے آخری بُدھ حکمران ہندو وزراء کے زیر اثر آگئے تھے۔ برہمنوں نے سخت جدوجہد کے بعد اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہندو راجپوت راجے پنجاب میں غالب آگئے تھے اور انہوں نے بُدھ گوجروں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ انہی راجپوت راجاؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر گوجروں نے ہزارہ قدیم اور سوات کے دُور دراز علاقوں میں اپنی بستیاں قائم کیں تھیں۔ ان بستیوں میں وہ ابھی تک رہائش پذیر ہیں۔ گوجروں کو ان کی پنجابی مقبوضات سے بے دخل کر دیا گیا۔ ان کی سنسکرت زبان رفتہ رفتہ گجراتی اور پھر گوجری بولی کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ صدیوں کے انقلابات کے باوجود ہزارہ کے پہاڑی علاقوں کے گوجر ابھی تک اسی گوجری بولی میں گفتگو کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ راجپوتانہ کی تسخیر کے بعد یہ قوم مسلسل دبتی ہی چلی گئی۔ پنجاب کے مشہور شہر گوجرانوالہ، گجرات اور گوجر خان اب بھی ان علاقوں میں گوجروں کی آبادکاری کی یاد دلاتے ہیں۔ ہندو دھرم کے دوبارہ عروج کے بعد گوجر اپنے کھیتی باڑی کے آبائی پیشے کی طرف دوبارہ مائل ہوگئے تھے۔ ترک مسلمان جب ہندو راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر یہاں حکمران بنے تو گوجر بدستور کھیتی باڑی کے کاروبار میں مصروف رہے اور ترکوں نے راجپوت راجاؤں کا مقام حاصل کر لیا۔

ضلع ہزارہ کے رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے بیان کے مطابق گوجروں کی ایک سو سے زائد شاخیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔

کٹھانہ، عالم، جاگل، کالس، لبری، کسانہ، برکٹ، بجار، گورسی، بوکل، کھاری، گھیلا، پسوال، ٹھیکری، نکیال، ٹنجر، جنگل، باہروال، بانیال، جہارا، ٹوکرہ، رواناں، سوہا، پڈہانہ، کوہلی، بُرلا، تیروڑ، بجراں، شاہ منگی، ننیاڑہ، لانڈے، کونشی، جٹ، چوہان، سوہو تنترہ۔

گوجروں کی مندرجہ بالا شاخوں میں سے بعض کے ناموں پر ہزارہ کے بعض دیہات کے نام رکھے گئے یہ دیہات اب بھی موجود ہیں اور وہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ دیگر اقوام کی آمد سے قبل گوجر ہزارہ کے ان مواضعات میں آباد تھے۔ ظہیر الدین بابر میدانِ ہزارہ قارلق کے علاقے سے پانچ بار گزر کر پنجاب اور دہلی کی طرف آگے بڑھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ میدانِ ہزارہ قارلق میں کہت اور کجور قومیں آباد ہیں۔ بابر ترک تھا، اس لئے وہ ترکوں کے مخصوص لب و لہجہ میں کھٹڑ کو کہت، گجر کو کجور اور گکھڑ کو کہہ کر لکھتا رہا۔

آئندہ اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اکبر بادشاہ کے ابتدائی دور میں ولایتِ پکھلی کا حکمران

سلطان محمود کلاں تھا۔ سلطان محمود کلاں تیموری نسل کا ترک تھا اور اس نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنی ریاست کا الحاق سلطنتِ مغلیہ سے کر دیا تھا، لیکن جب مرکزی حکومت کے اہلکاروں نے اس ریاست کا بندوبست شروع کیا تو سلطان محمود کلاں کے بیٹے سلطان حسین خان نے اسے اپنی ریاست میں مداخلتِ بے جا سمجھا اور اس نے اکبر بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اکبر بادشاہ کو سلطان حسین خان کے خلاف ولایتِ پکھلی میں دو بار فوج کشی کرنی پڑی۔ طویل کش مکش کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ سلطان حسین خان کو حاکمِ پکھلی تسلیم کر کے شاہی منصبداروں میں شامل کر لیا گیا اور اس کی ریاست کو سالانہ باج و خراج سے بھی مستثنیٰ قرار دے کر اسے اندرونی خود مختاری دے دی گئی، مگر اس کے ساتھ ہی میدانِ ہزارہ قارلق کو بقیہ ولایتِ پکھلی سے جدا کر کے اٹک کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور اسے ایک پرگنہ کی حیثیت دے دی گئی۔ اس پرگنہ پر آئینِ اکبری کا اطلاق کر دیا گیا۔

جو گوجر ولایت پکھلی میں رہے، وہ بدستور سلطان حسین خان کی رعایا بنے رہے۔ اس وقت میدانِ ہزارہ قارلق میں گوجر اور دلازاک ہی دو معتبر قومیں تھیں، دلازاک نو وارد تھے۔ وہ یوسف زئیوں اور غوریا خیلوں کے دباؤ سے تنگ آ کر دریائے سندھ کو عبور کر کے میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو دلازاک یہاں پُرامن زندگی بسر کرتے رہے، لیکن عہدِ جہانگیری میں انہوں نے تمام علاقے میں ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتیں شروع کر دیں اور اس طرح اس علاقے میں بدامنی پھیلنی شروع ہو گئی۔ جب جہانگیر بادشاہ کابل کے دورے پر جاتے ہوئے لاہور سے حسن ابدال پہنچا تو گوجر دلازاکوں کی ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کے خلاف ایک شکایت لے کر بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے۔ جہانگیر یہ سُن کر سخت برہم ہوا اور اس نے اس علاقے سے تمام دلازاکوں کو نکال کر لاہور میں آباد کرنے کا حکم دے دیا۔ جہانگیر کے حکم پر عمل کیا گیا اور اس طرح شاہراہِ کابل اور شاہراہِ کشمیر کو ملانے والا یہ علاقہ محفوظ ہو گیا۔ دلازاکوں کو صوبیدار لاہور کی براہِ راست نگرانی میں دے دیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد گوجر دوبارہ میدانِ ہزارہ قارلق میں پُرامن زندگی بسر کرنے لگے اور اپنی زراعت کو ترقی دینے کے لئے یکسو ہو گئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک گوجر یہاں پُرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ اپنی زمینوں کا لگان قلعہ اٹک میں ادا کیا کرتے تھے۔

۱۶۷۲ء میں جب اورنگ زیب عالمگیر سرحدی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے بنفسِ نفیس حسن ابدال، تشریف فرما ہوا تو سب سے پہلے میدانِ ہزارہ قارلق کا ایک معتبر گوجر دولت بیگ نامی بادشاہ کے استقبال

کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عالمگیر نے خوش ہو کر دولت بیگ کو مقدم کا لقب عطا کیا۔ اس زمانے میں گوجر سرداروں کے لئے مقدم کا لقب ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں گوجر سرداروں کیلئے مقدم دولت بیگ کا لقب ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ مقدم دولت بیگ کوٹ نجیب اللہ کے علاقے کا باشندہ تھا، اب بھی کوٹ نجیب اللہ کے قریب پانی کا ایک تالاب موجود ہے جسے لوگ ہندکو زبان میں "دولتے دی بن" پکارتے ہیں۔

سرحدی علاقے میں یہ بغاوتوں کا زمانہ تھا۔ ایمل خان آفریدی، خوشحال خان خٹک اور بہاکو خان یوسف زئی نے تمام سرحدی علاقے میں شورش اور ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ شاہراہ کابل غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ اس پر سے نہ صرف تجارتی قافلوں بلکہ شاہی افواج تک کا گزرنا محال ہو گیا تھا۔ صوبیدار کابل نے اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کی انتھک کوشش کی، لیکن امن بحال نہ ہو سکا۔ عالمگیر کے فرمان کے مطابق علاقہ گکھڑ، نیلاب اور پکھلی کے تمام جاگیردار سرحدی مہمات سر کرنے میں مصروف ہو گئے، لیکن پھر بھی یہ علاقہ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں سے محفوظ نہ ہو سکا۔ بغاوت کی فضا اتنی مکدر ہوئی کہ اورنگ زیب عالمگیر کو دکن کی مہمات کی نگرانی ترک کر کے اپنی ذاتی توجہ سرحدی علاقے میں مبذول کرنی پڑی۔ قبل ازیں عالمگیر عرصہ دراز سے دکن اور مرکزی ہند کی مہمات میں اتنا مصروف رہا تھا کہ سرحدی علاقہ اس کی ذاتی توجہ سے محروم ہو گیا تھا۔

اسی شورش اور بدامنی کے زمانے میں غورغشتی قوم میدان ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھی اور اس نے علاقہ مانک رائے پر قبضہ جما لیا۔ اب حالت یہ ہو گئی کہ سندھ کے اس پار کے جس قبیلے کو موقع ملتا، وہ دریا کو عبور کر کے میدان ہزارہ قارلق میں آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا۔ اس طرح شاہراہ کشمیر کے علاقے میں بھی بدامنی کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی حسن ابدال میں تشریف آوری سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۱۶۶۹ء کے لگ بھگ سلطان محمود خورد والی پکھلی کا ایک بیٹا سلطان فاضل خان نے اپنے بھتیجے ملوک خان اور شمشیر خان کو ہمراہ لے کر پکھلی سے میدان ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھا۔ سلطان فاضل خان نے موضع سلطان پور (دوڑ) میں کیمپ لگایا اور شاہراہ کشمیر کی حفاظت کے لئے مناسب انتظام کرنا شروع کر دیا۔ یہیں سے سلطان فاضل خان نے اپنے بھتیجے ملوک خان کو ترک فوج کا ایک دستہ دے کر علاقہ مانکرائے پر حملہ کرنے اور غورغشتیوں کو اس علاقے سے بے دخل کرنے کے لئے آگے روانہ کیا۔ چنانچہ ملوک خان نے نہایت دلیری سے مانکرائے پر حملہ کر دیا۔ غورغشتیوں کو شکست ہوئی اور انہیں اس علاقے سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس طرح شاہراہ کشمیر محفوظ ہو گئی۔ اسی زمانے سے ملوک خان اور دیگر ترکوں کی اولاد علاقہ مانکرائے

میں آباد چلی آرہی ہے۔

اس زمانے میں ترین بھی خرید و فروخت کے ذریعے گوجروں کی بعض زمینوں پر قابض ہو چکے تھے۔ ترین سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے علاقہ چھچھ میں آباد چلے آرہے تھے۔ میدانِ ہزارہ قارلق میں ترینوں کی آبادکاری کے حالات ایک الگ عنوان کے تحت آئندہ صفحات میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس زمانے میں کچھ دلازاک بھی لاہور سے واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ ترینوں اور دلازاکوں نے گوجروں سے ان کی زمینیں چھیننی شروع کر دیں۔ ترک بھی انہی کے ہمنوا بن گئے، اس لئے گوجر مجبور ہو کر ان سب کے خلاف ایک شکایت لے کر حسن ابدال میں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ تاریخ ہزارہ کا بیان ہے کہ یہ شکایت ۱۶۶۶ء میں کی گئی اور اسی سال میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم عمل میں آئی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شکایت اور میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم کا سال ۱۶۶۶ء نہیں، بلکہ ۱۶۷۲ء ہے۔ سوائے ۱۶۷۲ء کے جبکہ بادشاہ حسن ابدال تشریف فرما ہوا کسی اور سال میں گوجروں کا اُس کے حضور میں حاضر ہونا محال تھا۔ تاریخ ہزارہ میں یہ بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ ۱۶۷۲ء میں دولت بیگ اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں حسن ابدال حاضر ہوا اور اس نے خوش ہو کر اُسے مقدم کا لقب عطا کیا۔ اس شکایت پر میدانِ ہزارہ قارلق کی جو تقسیم عمل میں آئی۔ اس کے مطابق ایک پٹی کا نام پٹی گوجری دولتا چودھری رکھا گیا، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ گوجروں کی شکایت اور میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم کا سال ۱۶۷۲ء ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ اتفاق سے گوجروں کی شکایت کے موقع پر شاہی دربار میں صالح محمد خان دلازاک بھی موجود تھا۔ وہ گوجروں سے اُس شکایت کا بدلہ لینا چاہتا تھا جو انہوں نے جہانگیر بادشاہ کے پاس دلازاکوں کے خلاف پیش کی تھی اور جس کے نتیجے میں دلازاکوں کو میدانِ ہزارہ قارلق سے بے دخل ہونا پڑا تھا؛ چنانچہ صالح محمد خان نے گوجروں کی شکایت پیش ہوتے ہی جھٹ ثالثی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ گوجر اپنی نادانی سے اس چال کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے صالح محمد خان کو ثالث تسلیم کر لیا۔ صالح محمد خان ثالث بن کر میدان ہزارہ قارلق میں اس وقت اس پرگنہ میں کل چوراسی گاؤں موجود تھے صالح محمد خان نے ان چوراسی گاؤں کو اکیس اکیس گاؤں کی چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی پٹی گوجری دولتا چودھری، دوسری پٹی ترکی مانک رائے، تیسری پٹی ترینی درویش اور چوتھی پٹی دلازاک سرائے صالح تجویز ہوئی۔

اس تقسیم کی رُو سے گوجر اپنی ان آباقی زمینوں سے کافی حد تک محروم ہو گئے جو عرصہ دراز سے ان کے

قبضے میں چلی آرہی تھیں، ترک تین صدیوں سے پکھلی سرکار کے دال چلے آرہے تھے، وہ ان اکیس دیہات پر قبضہ کرکے مطمئن ہوگئے جو درحقیقت ان کی ریاست کی سرحد پر واقع تھے اور ریاست کے دفاع کیلئے ان پر قبضہ جمانا ضروری بھی تھا۔ دلازاکوں کے لئے یہ تقسیم نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئی۔ صالح محمد خان نے سدائے صالح کا موضع آباد کیا اور دلازاک ایک بار پھر اس میدان میں آباد ہوگئے۔ ترینوں کے حق میں بھی یہ تقسیم نہایت سود مند ثابت ہوئی۔ قبل ازیں اس علاقے میں ترینوں کا کوئی سیاسی کردار نہ تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ تقسیم میدانِ ہزارہ قارلق میں ترینوں کے عروج کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔

میدانِ ہزارہ قارلق کی اس تاریخی تقسیم سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں گکھڑ، اتمان زئی اور پٹھان قبائل تاحال اس میدان میں قدم نہیں جما سکے تھے، ورنہ زمین کے مالکان کے طور پر ان کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں ضرور موجود ہوتا؛ البتہ گکھڑوں کے سرنگال (سرنگال) قبیلہ کے کچھ افراد موضع خان پور میں آباد تھے۔ ان کی آبادکاری کا تذکرہ تاریخ ہزارہ میں موجود ہے۔

گوجروں نے اکیس دیہات پر ہی قناعت کرلی، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد انہیں ان دیہات کی ملکیت سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے آثار ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے ہی نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ۱۷۲۹ء میں ایران میں نادر شاہ درانی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدال نے درانی کا لقب اختیار کرنے کے بعد ہندوستان میں پیش قدمی شروع کردی۔ ۱۷۵۰-۵۲ء میں درانیوں کو کشمیر، پکھلی، میدانِ ہزارہ قارلق اور پنجاب میں بالادستی حاصل ہوگئی، لیکن انہوں نے ہزارہ میں کوئی پائیدار نظامِ حکومت قائم نہ کیا، بلکہ انہوں نے ان مقامی قوانین کے ذریعے جو ترکوں کے زوال کے بعد یہاں شہرت حاصل کرچکے تھے، حکمرانی کا سلسلہ شروع کردیا۔ میدان ہزارہ قارلق میں درانیوں کی نگاہ نجیب الدین خان ترین پر پڑی اور انہوں نے اسے اس میدان میں اپنا عامل مقرر کردیا۔ نسلی طور پر ترین اور ابدال دوسری اقوام کی نسبت ایک دوسرے کے قریب تر تھے۔ درانیوں کو ہزارہ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ شاہراہِ کشمیر اسی سے ہوکر گزرتی تھی؛ لہٰذا اس پر قبضہ کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ترینوں نے گوجروں کی ملکیتوں پر قبضہ جمانا شروع کردیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ترین نہ صرف پٹی گوجری بلکہ پٹی دلازاک

پر بھی قابض ہو گئے۔ نجیب اللہ خان ترین کی وفات کے بعد مقدم مشرف بنی بیگم کا سربراہ اور معتمد تھا۔ سکھوں کی آمد کے موقع پر مقدم مشرف ہی بنی بیگم کی طرف سے ترینوں کی سربراہی کر رہا تھا۔

۱۸۱۶ء میں سکھ میدان ہزارہ قارلق پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے ترینوں اور ترکوں سے ان کی املاک چھین لیں۔ اہل ہزارہ آخر دم تک ان کے خلاف برسرپیکار رہے۔ اس کش مکش کے تفصیلی حالات اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔

تربیلا کے گوجر ابتدائی مغل دور میں سندھ پار کر سے اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ یہ علاقہ مال مویشی پالنے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد تک گوجر اس علاقے میں پُرامن زندگی بسر کرتے رہے، مگر آخری عہدِ عالمگیری میں جب یوسف زیتوں نے اس علاقے میں شورش اور ہنگامہ کھڑا کر دیا تو گوجر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یوسف زیتوں، علی زیتوں اور حسن زیتوں نے گوجروں کی املاک پر قبضہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ اتمان زئی بھی ادھر پیش قدمی کرنے لگے۔ ان تمام اقوام نے گوجروں پر غلبہ حاصل کر لیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ گوجر اپنے اصل نام کے ساتھ نہ صرف ہزارہ بلکہ تمام سرحدی اور پنجابی علاقوں میں زندہ موجود ہیں، لیکن وہ ترکی النسل ہن قوم اپنے اصل نام کے ساتھ موجود نہیں جس کی ہمراہی میں گوجر یہاں وارد ہوئے تھے؛ البتہ ہنوں کا قبائلی لقب "خان" ابھی تک سرحدی علاقے میں استعمال ہو رہا ہے اور تمام افغان اور پختون قبائل بڑے فخر کے ساتھ اس ترکی لقب کو اپنے ناموں کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ پختون علاقوں میں مہر گل اور تور گل جیسے نام بھی ہن دور ہی کی یادگار ہیں۔

٭

آوان یا اعوان

قدیم دستاویزات میں لفظ آوان ملتا ہے، لیکن تحقیق اعوان کا بیان ہے کہ اصل لفظ اعوان ہے نہ کہ آوان۔ اگر تحقیق الاعوان کی یہ تحقیق درست ثابت ہو جائے تو اس سے ثابت ہو گا کہ تمام اقوامِ ہزارہ میں یہ وہ واحد قوم ہے جس کا نام عربی زبان کا ہے، لیکن اُسے درست تسلیم کر لینے سے قبل اس پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس قوم کے معزز افراد مُلک کہلاتے ہیں۔ مُلک بھی عربی زبان کا لفظ ہے، لیکن یہ صرف انہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ اکثر پٹھان اور پنجابی اقوام کے سرداروں کے لئے بھی مُلک کا لقب استعمال کیا جاتا ہے۔

اس قوم کے بیشتر افراد کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت قطب شاہ بابا حاکمِ ہرات کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق حضرت قطب شاہ غزنوی دَور میں حاکمِ ہرات ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مبلّغ دین بھی تھے اور علوی النسب بزرگ تھے۔ ان کے دعوے کے مطابق حضرت قطب شاہ بابا غزنوی حملوں کے جلو میں بغرضِ تبلیغ اس ملک میں وارد ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے۔ مشہور روایت کے مطابق قطب شاہ بابا کے مندرجہ ذیل بیٹے تھے:

۱۔ گراڑہ جو سیکسیر کے نزدیک آباد ہوا۔

۲۔ کلگان جو دُھن کوٹ نزد کالا باغ کے قریب آباد ہوا۔

۳۔ چوہان جو دریائے سندھ کے پہاڑی علاقے میں آباد ہوا۔

۴۔ کھوکھر جو چناب کے علاقے میں آباد ہوا۔

۵۔ توری جو تیراہ وغیرہ کے علاقے میں آباد ہوا۔

۶۔ حجاج یہ بھی تیراہ وغیرہ کے علاقے میں آباد ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت قطب شاہ بابا کا مزار غزنی میں ہے۔ ایک روایت کے مطابق لفظ اعوان کی نسبت قطب عون سے ہے۔ مختلف کتب میں آوانوں کی کل اسّی گوتیں اور ان کی سات سو ذیلی شاخیں بیان کی گئی ہیں، لیکن ان میں سے مندرجہ ذیل مشہور ہیں:

کھوکھر، ممنال، کھٹڑ، کلگان، ریحان، جنڈ، بالکال، کھرانہ، درہال، گلشاہی، کانگ، چوہان، سنرال، شیال، صادقال، بگدیال، چجی، سیدن، پربال، بلیال۔

آوانوں کے مندرجہ بالا بیان کے برعکس اکثر مورخین انہیں ہندی الاصل باشندے قرار دیتے رہے ہیں۔ قابلِ اعتماد شجرہ نسب اور مستند تاریخی ریکارڈ کی عدم موجودگی میں مؤرخین حالات کا تجزیہ کر کے کسی قوم کی اصل کے بارے میں اپنی رائے یا قیاس پیش کرتے چلے آتے ہیں۔ آوانوں کے متعلق بھی ایسا ہی ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی اصل کے بارے میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔

کچھ لوگوں کا قیاس یہ ہے کہ اعوان کاری دراصل ایک پیشہ تھا، قوم نہ تھی۔ اس پیشہ کو عموماً وہ لوگ اختیار کیا کرتے تھے جو بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہوں میں سکونت پذیر ہوا کرتے تھے۔ بیرونی حملہ آوران مقامی باشندوں کو معاون یا ریزرو دستوں کے طور پر بھرتی کر لیا کرتے تھے۔ ان کے ذمے راستوں کی نشان دہی کرنا، فوجوں کو رسد بہم پہنچانا، کیمپ لگانا اور اسی قسم کے دوسرے فرائض ہوا کرتے تھے۔ موقع و محل کے مطابق ان اعوان کار دستوں سے لڑائی میں مدد بھی لی جاتی تھی۔ اعلیٰ کارنامے سرانجام دینے کی بدولت انہیں فوجی عہدوں پر ترقی بھی دی جاتی تھی۔ اسی بنا پر مغربی پاکستان میں اعوانوں کی اکثریت کے علاقے کو اعوان کاری کا علاقہ بھی پکارا جاتا ہے۔ ابتدائی ترکی حملوں یعنی غزنوی حملوں کے زمانے میں یہ اعوان کار لوگ ترک افواج میں شامل کر لئے گئے تھے، اسی لئے مقامی ہندی باشندے انہیں بھی ترک پکارنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندی باشندے ہر اس شخص کو ترک پکارنے لگے تھے جو اسلام قبول کر کے ترک افواج میں شامل ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اعوان کاروں کے نام کے ساتھ لفظ ترک لکھا ہوا دیکھ کر کچھ لوگ انہیں ترک سمجھنے لگے ہیں۔

راورٹی Raverty آوان اور کھٹڑ دونوں اقوام کو وہ بدنی قبائل بیان کرتا ہے جو دریائے سندھ کو عبور کر کے سندھ ساگر دوآب میں آباد ہو گئے تھے۔

قطع نظر اس کے کہ حضرت قطب شاہ بابا سلطان محمود غزنوی کے ہمعصر تھے بھی یا نہیں، کسی مستند ذریعے سے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ وہ غزنوی حملوں کے جلو میں ہندوستان تشریف لاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مورخین نے ان کی آمد یا ان کی اس علاقہ میں آبادکاری کی مندرجہ بالا روایت کو نہیں تسلیم کیا۔ اسی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل وائکلی Lt Col. Wikeley لکھتا ہے:

[1] "Several tribes natably the Gokhars and Awans claim to have come with Mehmud Ghaznawi though it is difficult to reconcile their statements with historical record of the time".

اگر ہم آوانوں یا اعوانوں کی آبادی اور ان کے آباقی علاقہ کی اکثریت پر غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ پشاور، کیمبل پور، کالا باغ، میانوالی اور اٹک کے اردگرد کے بیشتر علاقوں میں آوان لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ اگر ان میں مغربی پاکستان کے دیگر علاقوں کے آوانوں اور ان کی فرعی شاخوں کے افراد کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد یقیناً لاکھوں سے تجاوز کر جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا چند صدیوں میں ایک فرد کی اولاد اتنی کثرت اختیار کر بھی سکتی ہے۔ بالخصوص ان حالات میں جبکہ ان کا مرکزی علاقہ بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ بھی بنا رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس سوال پر بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہے کہ حضرت علیؓ کی اولاد ہوتے ہوئے حضرت قطب شاہ بابا جیسے بزرگ نے اپنے مندرجہ بالا چھ بیٹوں کے نام ہندوانہ کیوں پسند کر لئے ہوں گے۔ ان دونوں کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ کھوکھر، چوہان اور کھٹڑ ان کی مشہور شاخیں ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اقوام غزنوی حملے سے لے کر بابر کی آمد تک اسی علاقے میں آباد تھیں۔ کھوکھروں

---

[1] The Punjabi Mussalman by Lt. Col. Wikely II Edition, Page 7.

ہی نے سب سے بڑھ چڑھ کر غزنوی اور غوری ترکوں کا مقابلہ کیا تھا۔ سلطان محمد غوری کو حالتِ نماز میں شہید کرنے والے بھی کھوکھر ہی تھے؛ لہذا یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ حضرت قطب شاہ بابا یا اُن کی اولاد نے اپنے خاندان کے افراد کے لئے ایسے دشمنانِ اسلام اور مشرک قوم کے افراد کے نام کیسے پسند کر لئے، چونکہ یہ غلبۂ اسلام کا دور تھا، اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوؤں کی ذہنی غلامی کے اثرات کے تحت ان حضرات نے اپنے خاندانوں کے لئے ایسے نام پسند کر لئے ہوں گے۔ آوانوں کی دیگر شاخوں کے نام رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبانوں کے رکھے جاتے رہے ہیں، چونکہ ابھی تک آوانوں میں انہی ناموں کے قبیلے اور گوتیں زندہ موجود ہیں؛ لہذا ان کے ناموں کی اصل پر غور کرنا ضروری ہے۔

آوانوں کی اصل کے متعلق مندرجہ بالا آراء کے علاوہ پنڈت ہری کشن کول نے ۱۹۱۱ء کی سروے رپورٹ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ سنسکرت زبان میں لفظ آوان کے معنی محافظ کے ہیں چونکہ آوانوں کے آباؤ اجداد نے اس علاقے میں بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے ملک کا اچھی طرح دفاع کیا تھا۔ لہذا پنڈت جی کے بیان کے مطابق وہ آوان یعنی محافظ مشہور ہو گئے تھے۔ آریائی دور سے لے کر ترک مسلمانوں کی آمد تک کے زمانے کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ نہ صرف قدیم راجپوت بلکہ بیرونی حملہ آور اقوام کے حکمران بھی ہندی تہذیب کو اپنانے کے بعد یہاں کھشتری ذات میں شامل ہوتے رہتے تھے اور ان کے حکمرانوں کا لقب راجہ یا مہاراجہ ہی مشہور ہو جایا کرتا تھا اور عوام ان کی اولادوں کو راجپوت ہی پکارتے تھے؛ چنانچہ مورخین کے خیال میں مغربی پاکستان اور راجپوتانہ کی بیشتر راجپوت اقوام کا شجرہ نسب سرزمین توران ہی سے آئی ہوئی اقوام سے جا ملتا ہے۔ اب اگر ایسے ہی راجپوتوں میں سے کسی کو عمدہ فوجی کارنامے سرانجام دینے کی وجہ سے آوان (بمعنی محافظ) کا لقب دے دیا گیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مورخین کے مندرجہ بالا تمام قیاسات میں جزوی صداقت پائی جاتی ہے۔ مغربی پاکستان میں علوی النسب اعوانوں کے علاوہ آوان بمعنی محافظ اور اعوان کا بمعنی معاون دونوں کے پائے جانے کے امکانات موجود ہیں اور نہ ہی آوانوں یا اعوانوں کا نسلی طور پر ایک ہی سٹاک سے نسبت رکھنا خارج از امکان ہے۔ ہمیں اس مفروضے پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ آیا قطب شاہ بابا کے مندرجہ بالا چھ بیٹوں کو ان کا فرزند تسلیم کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہو سکتا ہے یا انہیں حضرت کا مرید یا

یا شاگرد مان لینا زیادہ صحیح بات ہے۔ میرے خیال میں ان تمام قیاسات پر غور کرنے سے اصل حقیقت کا تلاش کر لینا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔

ہمیں جو بات وثوق سے معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ ترک مسلمانوں کے ابتدائی حملوں سے لے کر دورِ جدید تک آوانوں یا اعوانوں میں سے ہمیشہ اچھے سپاہی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہزارہ کے اکثر دیہات کی صورتِ دیہوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آوان زمانۂ قدیم سے یہاں آباد چلے آرہے ہیں۔ اسلام کی اشاعت میں انہوں نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا اور ان میں وقتاً فوقتاً قابلِ قدر مبلغِ دین پیدا ہوتے رہے۔ ان کے بزرگوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے اس علاقے میں خاصی اشاعت دین ہوتی۔ تمام ولایتِ پکھلی یعنی پکھلی سرکار اور میدانِ ہزارہ قازلق میں ان کی آبادیاں بکھری ہوتی تھیں۔ اسی لئے ترکوں کے عہد میں وہ کوئی نمایاں سیاسی کردار نہیں ادا کر سکے۔ اس علاقے میں ان کے معزز گھرانوں کو ابھی تک دیندار گھرانے تصور کیا جاتا ہے، چونکہ ان کے بعض خاندانوں کے پاس ترکوں کے زمانے میں قضاہ کے عہدے بھی ہوا کرتے تھے، اس لئے اب بھی ان کے چند معتبر گھرانوں کے افراد کو قاضی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ گوجروں کی طرح آوان یا اعوان بھی ایک زراعت پیشہ قوم چلے آرہے ہیں۔ سکھوں اور انگریزوں کے ادوار میں آوانوں کے ایک خاندان نے میدانِ ہزارہ قازلق کے علاقے میں کچھ نہ کچھ سیاسی کردار ادا کیا تھا، جس کا تذکرہ اس کتاب کی دوسری جلد میں کر دیا جائے گا۔

❖

دِلازاک

دلازاک سرحدی علاقہ کی قدیم اقوام میں سے ایک مشہور قوم ہے۔ کلیاتِ قوم دلازاک کے بیان کے مطابق یہ قوم سُلطان محمود غزنوی کے زمانے سے قبل قندھار سے نکل کر علاقہ پشاور میں آباد ہوئی۔ ان کے بیان کے مطابق اس زمانے میں وادیٔ پشاور میں سلمانی قوم آباد تھی جسے بیدخل کر کے دلازاک یہاں آباد ہو گئے، لیکن اس روایت کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

سترھویں صدی کے افغان شجروں[1] میں دلازاکوں کا نام کرلانڑی پٹھانوں میں ملتا ہے۔ کرلانڑی کے دو بیٹے بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے ایک کا نام کٹے اور دوسرے کا نام کوڈے بیان کیا جاتا ہے، لیکن کرلانڑی سے اوپر کا شجرہ نسب ناقابلِ اعتماد ہے، کیونکہ افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری میں قیس عبدالرشید کے صرف تین بیٹے یعنی سربن، بطان یا بتان اور غور وغشت بیان کئے گئے ہیں۔ کوڈلئے کی اولاد میں جن قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں اتمان وزیر، اورک زئی، دلازاک، آفریدی، خٹک، منگل اور توری بیان کئے گئے ہیں۔ سر اولف کیرو ان تمام قبائل کی اصل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

[2] "The tradition quite conceivably reflects a truth that the Karlonris sprung from an indigenous stock which was not

---

[1] ان شجروں میں مخزن افغانی کے مصنف کے مرتب کردہ اس شجرے کو زیادہ شہرت ملی ہے جس کی رو سے افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دیا گیا ہے۔ ترین قوم کے عنوان کے تحت افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری پر مفصل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

[2]

Pushto speaking and latter became fused with or overlaid by Pushto and Pushto speaking peoples, learning in the process to speak the language of the dominent race. At the least it illustrates a conviction that the Karlonris are not Afghans in the true line, and may be much older established".

ایک مشہور مصنف لیفٹیننٹ کرنل ہاٹکلی دلازاکوں کی اصل کے بارے میں لکھتا ہے:

"The origin of the tribe is doubtful, they are acknowledged by Pathans as belonging to the Kodai Karlanri branch of Ghurghusht Pathans, but are probably a race of S ythians stock".

اگر یہاں گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی ستھین یا ساکا قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ باشندے در اصل تورانی النسل تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں وہ کسپین اور دریائے جیحوں کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔ رفتہ رفتہ وہ افغانستان کے اکثر علاقوں پر قابض ہوتے چلے گئے۔ قندھار کے ستھین حکمران ماؤس نے سندھ کے اس پار حملہ کر کے وادیٔ پشاور، سلطنتِ ٹیکسلا اور ہزارہ قدیم کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح ۹۰ ق۔م سے ۲۵ ق۔م تک یہاں ستھین راج قائم رہا۔ ستھین یونانیوں کے جانشین بنے تھے۔ بعض مورخین نے کشن خاندان کو بھی ستھین قوم کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ اس زمانے میں وادیٔ پشاور میں ارمڑی زبان بولی جاتی تھی۔ اب بھی پشاور کے قریب ارمڑ گاؤں اور اسی قوم کے افراد موجود ہیں۔ ارمڑی زبان میں دُل کے معنی جدّ اور بڑے کے ہیں۔ جیسے دُل پیو (پردادا) ستھین کا دوسرا نام ساکا تھا۔ ساکا کے دیگر قبائل اپنی شاہی فوج کو دل ساکا پکارا کرتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ یہی دل ساکا کا لفظ دلازاک بن گیا۔ لسانیات میں س عموماً ز سے بدل جایا کرتا ہے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ سیستان اس علاقہ میں ساکا قوم کی آبادکاری کے بعد سکستان کہلانا رہا۔ رفتہ

The Pathans Carac, Page 23 The Punjabi Mussalman II Edition by Lt. Col. Wilcoly, Page 90 Dalazak

رفتہ ساکستان سیلستان میں بدل گیا۔ لفظ دلازاک کی اس تحقیق کی رُو سے مؤرخین کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ دلازاک اصلاً سقین یا ساکا قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ توزک بابری میں دلازاکوں کا ذکر افغان قوم کے طور پر کیا گیا ہے اور ان کے مخالف یوسف زئی بھی انہیں افغان تسلیم کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ جب سرحد کے لوگ عرصہ دراز تک اسی علاقے میں سکونت پذیر رہے اور پشتو زبان یہاں غالب ہوگئی تو تمام بیرونی عوام نے انہیں افغان یا پٹھان پکارنا شروع کر دیا حالانکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ لفظ افغان فارسی کے لفظ آہ وفغان سے مشتق ہے اور لفظ پٹھان یونانیوں کا سکیان اور ہندی کا پٹھان ہے۔ ابن بطوطہ افغانستان کے علاقے میں مقیم ایرانی النسل فارسی گو باشندوں کو افغان لکھتا ہے۔

ظہیر الدین بابر کے عہد تک یعنی تقریباً ۱۵۲۵ء تک دلازاک وادی پشاور میں باوقار زندگی بسر کر رہے تھے۔ پندرھویں صدی کے اسی حصے میں تیموری ترکوں کے ایک شہزادے الغ بیگ مرزا نے تشدد کے ذریعے یوسف زئیوں کو افغانستان کے علاقے سے باہر نکال دیا۔ بے بسی کے عالم میں یوسف زئی دلازاکوں کے پاس آتے، اس زمانے میں یوسف زئیوں کا مشہور سردار ملک احمد وتھا اور دلازاکوں کا سردار ملک ہیبو تھا۔ یوسف زئیوں نے دلازاکوں سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے علاقہ میں آباد ہونے کا موقع دیں۔ دلازاکوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ یوسف زئیوں کی اس درخواست کو قبول کر لیا اور انہیں دانش کول، دانبھار تا بحد باجوڑ کا علاقہ آباد ہونے کے لئے دے دیا، بلکہ دلازاکوں نے یوسف زئیوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ہشت نگر کے ان دہقانوں کا علاقہ بھی فتح کر سکتے ہیں جو باجوڑ کے جہانگیری سلاطین کے ماتحت تھے۔ یوسف زئیوں نے بتدریج اس علاقہ میں آباد ہونا شروع کر دیا۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو انہوں نے ایک ایک کر کے تنولیوں، گبریوں، سواتیوں، غوریا خیلوں اور دیگر قبائل سے ان کے علاقے چھیننا شروع کر دیئے۔ یوسف زئی اتنے سرکش ہوتے کہ انہوں نے اپنے محسن دلازاکوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ۱۵۲۱ء کے لگ بھگ یوسف زئیوں کے جنگ کاٹلنگ میں دلازاکوں کو شکست فاش دی۔ ملک کو احمد یوسف زئی نے دریا پار کرتے ہوئے ملک ہیبو کی بیٹی بھی اس سے چھین لی۔ اس جنگ میں ترکانڑی بھی یوسف زئیوں کی امداد پر کمربستہ ہو گئے تھے۔ برہان نامی ایک ترکانڑی نے تلوار کے ایک ہی وار سے ملک ہیبو کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس شکست کے بعد دلازاکوں کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد مصری خان یوسف زئی نے بچے کھچے دلازاکوں سے بھی ان کی املاک چھین کر انہیں ملک بدر کر دیا۔

جنگ کاٹلنگ سے کچھ عرصہ قبل ۱۵۱۹-۲۰ء میں ظہیر الدین بابر صوبہ سرحد کے علاقے میں پہلی بار نمودار ہوا۔ اس وقت بابر کابل کا حکمران تھا اور وہ سرحدی قبائل کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے میں مصروف تھا۔

دلازاک بابر کے حضور میں یوسف زئیوں کے رویے کے خلاف ایک شکایت لے کر حاضر ہوئے۔ بابر ان دنوں سوات اور باجوڑ کے جہانگیری سلاطین کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ باجوڑ میں گبری سلطان حیدر علی کو شکست دینے کے بعد بابر یوسف زئیوں کی سرکوبی کے لئے آگے بڑھا، لیکن اسی دوران میں وہ یوسف زئی سردار شاہ منصور کی بیٹی مبارکہ بی بی کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور لڑائی کی بجائے اُس نے شاہ منصور سے اس کی بیٹی کے رشتے کی خواہش کا اظہار کر دیا، جسے شاہ منصور نے قبول کر کے بابر سے مبارکہ بی بی کا نکاح کر دیا۔ بابر محبت سے اسے افغانی بیگم پکارا کرتا تھا لیکن اس کے بطن سے بابر کی کوئی اولاد پیدا نہ ہو سکی۔ شاہی حرم کی ترک خواتین بی بی مبارکہ سے نفرت کیا کرتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد مبارکہ بی بی کی درخواست پر بابر نے یوسف زئیوں کو معاف کر دیا اور اُن کے وقار میں پہلے سے زیادہ اضافہ کر دیا اور انہوں نے آخری گبری سلطان اویس کو بھی ملک بدر کر کے اس کے صدر مقام منگلور پر بھی قبضہ کر لیا۔

ظہیر الدین بابر کی وفات کے بعد سرحدی علاقہ اس کے بیٹے کامران مرزا کے حصے میں آیا۔ اتفاق سے کامران مرزا بھی خلیل اور مہمند قبیلوں کی انگیخت پر دلازاکوں کا مخالف ہو گیا اور ۳۴-۱۵۳۳ء کے لگ بھگ اس نے دلازاکوں کو سندھ کے مغربی علاقے سے نکال دیا۔ کچھ عرصہ تک سرگرداں پھرتے رہنے کے بعد دلازاک ۱۵۵۳ء کے لگ بھگ دریائے سندھ کو عبور کر کے میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ ہمایوں، شیر شاہ سوری کے دباؤ اور اپنے بھائیوں کی غداری کی وجہ سے سخت پریشان حال تھا۔ ظہیر الدین بابر کی آمد سے قبل اگرچہ میدانِ ہزارہ قارلق پر سلاطینِ پکھلی کی حکمرانی قائم تھی، لیکن بابر نے یہ علاقہ جاگیر کے طور پر ہمایوں کو بخش دیا تھا، اس لئے اس پر پکھلی کے ترک سلاطین کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور دریائے سندھ کے اُس پار کے قبائل جن میں یوسف زئی سرِفہرست تھے۔ اس میدان میں آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنے لگے تھے۔ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس بدامنی اور انتشار کے زمانے میں دلازاکوں کو بغیر کسی مزاحمت کے میدانِ ہزارہ قارلق میں آباد ہونے کا موقع مل گیا۔

اکبر بادشاہ کے عہد میں میدان ہزارہ قارلق کو ایک پرگنہ کی حیثیت دے کر اٹک کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اکبری دور میں گوجر اور دلازاک ہی اس میدان کی دو معتبر قومیں تھیں۔ عہدِ جہانگیری تک دلازاک اس میدان میں باوقار زندگی بسر کرتے رہے، لیکن عہدِ جہانگیری میں ان کے مقدر کا ستارہ ایک بار پھر گردش میں آیا۔ ۱۶۵۷ء میں جہانگیر بادشاہ کابل کے دورے کے ارادے سے سفر کرتا ہوا حسن ابدال کے مقام پر پہنچا۔ اس

موقع پر گوہر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دلازاکوں کے خلاف یہ شکایت پیش کی کہ اس علاقے میں دلازاک ڈکیتی، لوٹ مار اور راہزنی کی وارداتیں کر رہے ہیں اور ان وارداتوں کی وجہ سے تمام علاقہ بدامنی کا شکار ہو رہا ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر سخت برہم ہوا اور اس نے دلازاکوں کو اس علاقے سے نکال کر لاہور میں آباد کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ جہانگیر کے فرمان کا مقصد شاہراہِ کابل اور شاہراہ کشمیر کے اس اہم علاقے کو بدامنی سے محفوظ کرنا تھا۔ اس غرض کے لئے ظفر خان پسر زین خان کوکہ کو مقرر کیا گیا اور ایک سال کے دوران میں بادشاہ کے کابل سے واپسی سے پہلے پہلے تقریباً ساٹھ ہزار دلازاکوں کو اس علاقے سے نکال کر لاہور میں آباد کر دیا گیا۔ اس طرح دلازاکوں کو صوبیدار لاہور کی براہِ راست نگرانی میں دے دیا گیا۔ لاہور سے دلازاکوں کے بعض خاندان ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہجرت کر گئے جہاں اب بھی ان کی اولادیں موجود ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور دلازاکوں کو ایک بار پھر میدانِ ہزارہ قارلق میں باوقار زندگی بسر کرنے کا ایک موقع نصیب ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر عرصۂ دراز تک دکن اور جنوبی ہند کے دوسرے علاقوں میں مرہٹوں اور ہندو راجپوتوں کی سرکوبی میں مصروف رہا تھا اور شمالی ہند بالخصوص سرحد کا علاقہ اس کی ذاتی توجہ سے محروم رہ گیا تھا۔ بادشاہ کی طویل غیر حاضری نے یہاں کئی مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ سرکاری منصب دار اور اہل کار اپنے فرائض ادا کرنے میں غفلت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام سرحدی علاقہ بدامنی اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ ایمل خان آفریدی، خوشحال خان خٹک اور بہادر خان یوسف زئی نے سرحدی علاقے میں شورش اور ہنگامے کھڑے کر دیئے۔ شاہراہ کابل خطرے میں پڑ گئی۔ اس پر سے نہ صرف مسافروں اور تجارتی قافلوں کا گزرنا محال ہو گیا، بلکہ شاہی فوج تک کا سفر کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے فرمان کے مطابق صوبیدار کابل کے علاوہ علاقہ گکھڑ، نیلاب اور پکھلی کے شاہی منصبدار بھی ان بغاوتوں کو کچلنے پر کمربستہ ہو گئے۔ لیکن شورش دن بدن تیز تر ہوتی چلی گئی، اس لئے اورنگ زیب عالمگیر کو بذاتِ خود ادھر توجہ مبذول کرنا پڑی؛ چنانچہ عالمگیر وقتی طور پر دکن کی مہمات کی نگرانی ترک کر کے ۱۶۷۲ء میں حسن ابدال تشریف فرما ہوا اور یہیں سے اس نے سرحدی مہمات کی نگرانی شروع کر دی۔

اسی بدامنی کے زمانے میں غورغشتی قوم نے آگے بڑھ کر علاقہ مانک رائے پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن سلطان محمود خورد والئ پکھلی کے بیٹے سلطان فاضل خان اور اس کے بھتیجے ملوک خان کی بروقت فوجی کارروائی نے ان کے قدم جمنے نہ دیئے اور انہیں اس علاقے سے حملہ کر کے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ترک پھر

نقشہ مشرق وسطیٰ ساتویں صدی قبل مسیح

علاقہ مانک رائے پر قابض ہو گئے اور انہوں نے شاہراہِ کشمیر کو محفوظ کر دیا۔ اس وقت ترین بھی میدانِ ہزارہ قارلق میں آباد تھے اور کچھ دلازاک بھی لاہور سے واپس یہاں چلے آتے تھے۔ ترینوں اور دلازاکوں نے گوجروں کی زمینوں پر دست درازی شروع کر دی۔ ترک بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ گوجران اقوام کے اس جارحانہ رویے کے خلاف ایک شکایت لیکر بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے استقبال کے لئے سب سے پہلے میدانِ ہزارہ قارلق کا ایک معتبر گوجر سردار دولت بیگ حسن ابدال پہنچا تھا اور بادشاہ نے خوش ہو کر اسے مقدم کا لقب بھی عطا کیا تھا۔ گوجروں کی اس شکایت کے موقع پر اتفاق سے صالح محمد خان دلازاک بھی شاہی دربار میں حاضر تھا۔ اس نے فی الفور تاج محمد کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں اور گوجروں نے نادانی سے اسے قبول کر لیا۔ صالح محمد خان دلازاک نے سرائے صالح کا موضع آباد کیا۔ اس نے تمام پرگنہ ہزارہ قارلق کے چوراسی دیہات کو چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا۔ اول پٹی گوجری دولتا چودھری، دوم پٹی ترکی مانکرائے، سوم پٹی دلازاک سرائے صالح اور چہارم پٹی ترینی درویش۔ ان ہر چار پٹیوں میں کل اکتیس اکتیس مواضعات شامل تھے۔ صالح محمد خان سرائے صالح ہی کے موضع میں آباد ہو گیا۔ یہ موضع تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق اُس نے ۱۶۷۲ء میں آباد کیا گیا۔ اسی سال اورنگ زیب عالمگیر بھی حسن ابدال تشریف فرما ہوئے تھے۔

بہر حال اس تقسیم کی رُو سے دلازاکوں کو میدانِ ہزارہ قارلق کے اکیس دیہات مل گئے اور اس طرح انہیں ایک بار پھر اس میدان میں باوقار زندگی بسر کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔

مگر سترھویں صدی کی ابتدا میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ سرحدی بغاوتوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی اورنگ عالمگیر کی خدمت میں پیش ہونے کے لئے دہلی روانہ ہوئے۔ بادشاہ نے سرحدی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے سلطان محمود خورد کو دیگر منصب داروں سمیت مقرر کر دیا، لیکن وہ انہی بغاوتوں کو فرو کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ عرصہ دراز تک پکھلی سرکار میں ان کی شہادت کی خبر نہ پہنچی، اس لئے پکھلی اور دھمتوڑ میں ترکوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی میں اگرچہ سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ کا پلہ بھاری رہا، لیکن اورنگ زیب عالمگیر نے مبارز الدین خان گکھڑ کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کر کے سلطان مقرب خان کی بغاوت کو فرو کر دیا، مگر اس کے باوجود پکھلی سرکار میں امن قائم نہ ہو سکا اور ترک سلطان محمود خورد کے کسی بیٹے یا پوتے کی حکمرانی پر متفق نہ ہو سکے۔ ان حالات میں سواتیوں نے ۱۷۱۳ء میں گلی باغ کے دارالریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام قبائل ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۱۷۲۹ء کے لگ بھگ درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے ۵۲-۱۷۵۰ء میں

ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار پر قبضہ کر لیا۔ درانیوں نے یہاں براہ راست حکمرانی کرنے کی بجائے مقامی خوانین کے ذریعے حکمرانی کرنے کو ترجیح دی۔ میدان ہزارہ قارلق میں ان کی نگاہِ انتخاب نجیب اللہ خان ترین پر پڑی جسے انہوں نے اس علاقے کا عامل مقرر کر دیا۔ ترینوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر پٹی گوجری اور پٹی دلازاک کے دیہات پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح چند سالوں کی باوقار زندگی بسر کرنے کے بعد دلازاک ایک بار پھر ترینوں کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ درانیوں کا غلبہ ۱۸۱۶ء سے قبل ختم ہو گیا اور ان کی جگہ سکھوں نے لے لی۔ ۱۸۱۶ء میں سردار مکھن سنگھ پہلی بار سکھ فوج لے کر میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوا اور ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے باضابطہ طور پر ہزارہ کو اپنی قلمرو میں شامل کر دیا۔

ڈھونڈ اور سراڑہ:

ان دونوں اقوام کی آبادی موجودہ ضلع ہزارہ کے اس جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے جو علاقہ راولپنڈی (قدیم علاقہ گکھڑ) اور موجودہ آزاد کشمیر سے ملحق ہے۔ ان کی آبادی کا بڑا حصہ علاقہ گکھڑ میں آباد تھا۔ میں نے ان ہر دو اقوام کی اصل اور اس علاقہ میں ان کی آمد کے حالات دریافت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس سے زیادہ تفصیلی حالات کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکے جو سطورِ ذیل میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ میری معلومات کا انحصار زیادہ تر ٹوڈ و انگلی ویس اور گزیٹیئرز راولپنڈی و ہزارہ میں بیان کئے گئے تاریخی مواد پر ہے۔ ان معلومات میں ان کے علاقے کے بعض دیہات کی صورت دیہوں کا مواد بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

۱۹۶۵ء میں آزاد کشمیر کے ایک ریٹائرڈ سیشن جج سردار محمد ایوب صاحب نے "عباسی شمالی پاکستان" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کر کے ڈھونڈ اور سراڑہ اقوام کی اصل اور ان کی آمد کے بارے میں پہلی بار ایک ایسا مضمون قلمبند کیا ہے جو ڈھونڈ قوم کے ایک فرد کا لکھا ہوا ہے۔ تاریخی اور علمی اعتبار سے سردار صاحب کا کتابچہ قابلِ اعتماد نہیں؛ تاہم اس پر غور کرنا اور اس کا تجزیہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے سوا ڈھونڈ اور سراڑہ اقوام کے پاس کوئی ایسی تحریر نہیں مل سکی جو ان کی اصل کی تائید کرتی ہو جس کا دعویٰ اس کتابچہ میں کیا گیا ہے۔ سردار محمد ایوب کے والد بزرگوار نے "آئینہ قریش" کے نام سے ایک اور کتابچہ بھی لکھا ہے، مگر روایت اور درایت کے اعتبار سے یہ سردار صاحب کے اپنے کتابچے سے بھی گیا گزرا ہے؛ لہٰذا اس کا نوٹس لینا مناسب نہیں۔

سردار صاحب کا بیان ہے کہ نہ صرف ڈھونڈ بلکہ سراڑہ اور تنولی بھی عباسی ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ان اقوام کے مورثِ اعلیٰ وہ ضراب خان ہیں جو قطب شاہ والئی ہرات کے زمانے میں اس کی طرف سے ایک فوج

کے جرنیل یا سفیر بن کر کوٹہ رانی کے زمانے میں کشمیر تشریف لائے تھے۔ ان کے یہاں وارد ہونے تک شاہ مرزا نے کشمیر میں اقتدار حاصل کر لیا تھا؛ لہٰذا وہ یہیں شادی کر کے سکونت پذیر ہو گئے، مگر اس کے ساتھ ہی سردار صاحب کتاب چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ کے حوالے سے یہ بھی فرماتے ہیں کہ ضراب خان کے ایک بزرگ تاخت خان نے امیر تیمور کی بہن سے شادی کی تھی۔ پھر اسی کتابچے میں وہ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ضراب خان امیر تیمور کے حملے کے بہت عرصہ بعد دہلی سے واپس کشمیر لوٹے اور ان کی اولاد میں سے ڈھونڈ خان، سراڑہ خان اور تنولی خان پیدا ہوتے جو ان تینوں قبیلوں کے جدِ امجد ہیں۔

سردار صاحب کے مندرجہ بالا بیانات تاریخی حقائق کی روشنی میں بڑے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ قطب شاہ والیٔ ہرات سلطان محمود غزنوی کے ہمعصر بزرگ تھے۔ کسی تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی اسلامی لشکر غزنوی حملوں سے قبل کشمیر روانہ کیا گیا ہو۔ غزنویوں کے ابتدائی دور میں اور اس سے قبل کشمیر، پکھلی، سلطنتِ ٹیکسلا، صوبۂ سرحد اور افغانستان میں لمغان کے علاقے تک ہندو شاہیہ گندھارا کی مضبوط سلطنت قائم تھی۔ یہ ہال خاندان کی حکومت تھی اور اس کا دارالسلطنت لاہور تحصیل صوابی تھا۔ اس زمانے میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی لشکر پاس سلطنت کو تباہ کئے بغیر کشمیر کو پیش قدمی کر سکتا۔ اگر ضراب خان سفیر بن کر کشمیر وارد ہوتے تھے تو اس کا ذکر بھی کسی معتبر کتاب میں ہونا چاہیئے۔ سیر المتاخرین میں اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں۔ تحقیق الاحوان کا بیان یہ ہے کہ حضرت قطب شاہ غزنوی حملوں کے جلو میں بغرض تبلیغ ہندوستان میں وارد ہوتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کا ابتدائی حملہ ۱۰۰۱ء میں ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے ہندوستان پر مسلسل سترہ حملے کئے۔ سلطان محمود غزنوی نے کشمیر کے مشہور قلعوں موہر کوٹ، نندکوٹ اور بندنہ وغیرہ کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی، مگر اسے مطلوبہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸ء میں ہوا۔ ہندوستان فتح کرنے کے سات سال بعد امیر تیمور ستر برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس لئے یہ بڑا مضحکہ خیز دعویٰ ہے کہ ضراب خان کے ایک بزرگ تاخت خان نے امیر تیمور کی بہن سے شادی کی تھی۔ اگر ضراب خان کو غزنوی دور کا آدمی تسلیم کیا جائے تو تاخت خان یقیناً اس سے پہلے کے بزرگ ہوتے ہوں گے۔ اس طرح سردار صاحب ضراب خان کو تقریباً چار سو برس کے طویل عرصے میں کشمیر، ہرات اور دہلی میں آتا جاتا بیان کرتے ہیں جو کسی لحاظ سے بھی لائقِ اعتبار نہیں۔ شاہ مرزا کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے کولڈ رانی کے زمانے میں ۱۳۳۹ء میں اقتدار حاصل کیا۔ اگر سردار صاحب مندرجہ بالا تمام تمام تاریخی شخصیتوں کی حکمرانی کی تاریخیں جمع کر لیتے، تو انہیں اتنا بڑا مغالطہ نہ ہوتا۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ

سلطان محمود غزنوی ترکوں کا پہلا آزاد مسلمان حکمران ہے، اس کے دور سے قبل کبھی کسی عرب حکمران یا سردار نے اپنے لئے ترکوں کا قبائلی لقب "خان" نہیں استعمال کیا تھا۔

سردار صاحب کا تنولی خان کو ڈھونڈا اور سراڑہ خان کا بھائی قرار دینا بھی بڑا عجیب خیال ہے۔ تاریخ تناولیاں مرتبہ سید مراد علی شاہ، تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس اور ہزارہ گزیٹیر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تنولی چار ہزار کی تعداد میں ۱۷۲۴ء کے لگ بھگ مہابن سے نکل کر موجودہ تناول کے علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ تنولیوں کی اپنی روایت یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد افغانستان کے ایک درّہ تا فال نامی سے نکل کر آئے تھے۔ اس بنا پر وہ تنولی کہلائے۔ واتکلی نے تنولیوں کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ وہ ترنولی ولد راجہ مل کی اولاد ہیں جو ہندو شاہیہ گندھارا کے راجہ جے پال کے خاندان سے تھا۔ تنولیوں کے شجرہ نسب سے بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ تنولی خان ان کا کوئی فرد تھا یا وہ ڈھونڈ خان کا بھائی تھا، اس لئے سردار صاحب کا بیان کردہ نسب بھی قابلِ اعتماد نہیں ٹھہرتا، اسی کتاب میں تنولیوں کی اصل اور علاقہ تناول میں ان کی آمد کے حالات ایک الگ عنوان کے تحت بیان کئے گئے ہیں، ان کا مطالعہ اس سلسلے میں سود مند ثابت ہوگا۔

ضراب خان کے بیٹے گائی خان کے بارے میں بھی سردار صاحب نے ایک عجیب روایت پیر صاحب دیول کے حوالے سے بیان فرمائی ہے۔ بقول ان کے پیر صاحب دیول بذریعہ کشف بیان کرتے ہیں کہ گائی خان ابنِ ضراب خان ایک درویش کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ درویش نے والدین کو حکم دیا کہ جب بچہ پیدا ہو تو اسے ان کے پاس حاضر کیا جائے؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ درویش نے حکم دیا کہ وہ بچہ کو وہیں چھوڑ کر چلے جائیں، چنانچہ انہوں نے بچے کو وہیں چھوڑا، اور خود چلے گئے۔ یہ حج کے ایام تھے، درویش وہیں جنگل میں بچے کو تنہا چھوڑ کر اپنی روحانی طاقت کے ذریعے حج کرنے چلا گیا، مگر حج کے دوران میں درویش کی طبیعت میں بے چینی پیدا ہو گئی اور وہ فوراً اپنی روحانی طاقت کے زور سے بچے کے پاس پہنچ گیا۔ درویش کیا دیکھتا ہے کہ ایک سانپ گردن کھڑی کئے ہوئے بچے کو ڈس مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ درویش نے فوراً سانپ کو مار دیا اور بے اختیار خوشی سے اس کے منہ سے ہندوؤں کا مذہبی نعرہ "جے" نکلا۔ یہ لفظ "جے" بگڑ کر پہلے "گھیسہ" اور بعد میں "گھیسی" بن گیا اور آخر کار یہ بچہ گائی خان کے نام سے مشہور ہوا۔

قطع نظر اس مسئلہ سے کہ شریعتِ اسلامیہ نے حج بذریعہ طاقتِ روحانی فرض بھی کیا ہے یا نہیں، بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس مردِ درویش کے منہ سے، جو اتنا باکرامت بزرگ تھا، ہندوؤں کا مذہبی نعرہ "جے" کیسے

نکل گیا؟ مسلمان تو خوشی کی حالت میں ہمیشہ سے الحمدللہ ہی پکارتے چلے آتے ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ ایک ولی اللہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسمائے ذات اور اسمائے صفات کو ترک کر کے ایک کفر کا نعرہ لگانے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح گائی خان یا گھیسی خان کے لڑکے ڈھونڈ خان کے بارے میں بھی ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ڈھونڈ خان کا اصل نام شاہ ولی خان تھا اور وہ حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی کے مرید تھے۔ حضرت موصوف کی خواہش پر شاہ ولی خان چند افراد کے ہمراہ شکار کے لئے روانہ ہوتے۔ باقی شکار کرنے کے بعد بخیریت واپس لوٹ آئے لیکن شاہ ولی خان واپس نہ لوٹے بڑی تلاش کے بعد آپ ملے اور حضرت ذکریا ملتانی کے روبرو حاضر ہوتے۔ حضرت نے فرمایا "ڈھونڈ خان" بس اس واقعہ کے بعد شاہ ولی اللہ خان اور ان کی اولاد ڈھونڈ کہلائی۔

قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جناب سردار محمد ایوب خان ریٹائرڈ سیشن جج نے فنِ تاریخ میں بزرگوں کے کشوف والہامات کو مآخذِ تاریخ تسلیم کر کے صحیح Judgment نہیں کی اور نہ ہی ایسی کمزور روایات کو نقل کر دینا صحیح قومی خدمت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کتابچے کے ساتھ سردار صاحب مذکور نے ڈھونڈ قوم کے بزرگوں کا ایک شجرہ نسب بھی منسلک کیا ہے جس میں سردار صاحب نے اپنے بزرگوں کے کئی ہندوانہ نام مثلاً جے، اجو، کلچندر، رائے سب، رتن، ڈمٹ، کلو رائے، کوندر، چندر وغیرہ درج کئے ہیں۔ ان ہندی الاصل ناموں پر غور کرنے سے بھی مزید تعجب ہوتا ہے کہ آخر کس مجبوری کی بناء پر ضراب خان عباسی کی اولاد مسلسل کئی نسلوں تک اپنی اولادوں کے لئے یہ ہندوانہ نام پسند کرتی رہی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے عہد کے بعد مسلسل آٹھ سو برس تک کشمیر سے سندھ تک کے تمام علاقے میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہا۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک غالب قوم بالخصوص عباسی خاندان کے بزرگ یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی اولاد کے نام اسلامی ناموں کی بجائے اس مشرک قوم کے ناموں پر رکھے جائیں جو مسلمانوں کی دشمن بھی تھی اور غلام بھی۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ والی بات تو درست ہو سکتی ہے لیکن اَلْمُلُوْکُ عَلٰی دِیْنِ رَعِیَّتِھِمْ والی بات قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

ان دلائل کی بناء پر سردار محمد ایوب کا کتابچہ قابلِ اعتماد شمار نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب پنجابی مسلمان میں ڈھونڈ قوم کی مندرجہ ذیل شاخیں بیان کی گئی ہیں اور ان تمام کے مورثِ اعلیٰ کے نام ہندی الاصل زبانوں کے ہیں:

نمبر شمار	نام مورثِ اعلیٰ	نام قبیلہ	سکونت
۱	چند	چندال	پونچھ بالخصوص تحصیل باغ،
۲	گائی (گھیسہ بجے)	گیال	جہلم
۳	رتن	رتنیال	مری اور تحصیل ایبٹ آباد
۴	ہند	ہندوال یا اندوال	تحصیل ایبٹ آباد

مندرجہ بالا بڑے قبیلوں کے علاوہ رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء میں قوم ڈھونڈ کی مندرجہ ذیل شاخیں بھی بیان کی گئی۔

پینگال، گیرال، بیجال، لہروال، بڈہریال، بھاگرتھال، یہ بڑی شاخیں آگے چل کر مزید چھوٹی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔

ڈھونڈ اور سراڑہ کا عام طور پر ایک دوسرے سے قریبی تعلق بیان کیا جاتا ہے۔ سراڑہ قوم کی معروف شاخیں مندرجہ ذیل ہیں:

سعدوال، اوہلی، عارفال، فتحیال، شیرال، بوڈیال، گوبندریال، دمیال، بھرمال، تنترال، ستیال، شکریال سوجوال، اور پتیال ڈھونڈ اور سراڑہ اقوام کا مسکن ایک ہی پہاڑی سلسلہ ہے اور وہ کرڑال قوم کی بہ نسبت ایک دوسرے کو زیادہ قریبی سمجھتے ہیں۔ ان اقوام کے علاقے میں کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان اقوام کے اجداد سندھ سے بہاولپور اور پھر وہاں سے اس علاقے میں تشریف فرما ہوئے تھے، مگر مشکل یہ ہے کہ کسی معتبر تاریخی روایت یا شہادت کے بغیر ایسی باتوں کو کیونکر تسلیم جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ چونکہ سندھ پر محمد بن قاسم نے حملہ کیا تھا اور عرب ملتان تک کے علاقے پر بھی قابض بھی ہوتے تھے؛ لہذا ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ادھر آنکلے ہوں۔ لیکن اس ضمن میں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ سندھ پر کسی عباسی حکمران نے نہیں، بلکہ عباسیوں کے مخالف قبیلہ بنوامیہ کے مشہور [illegible] محمد بن قاسم نے حملہ کیا تھا اور اس زمانے میں خلافت بھی بنوامیہ ہی کی تھی۔ محمد بن قاسم

بمشکل ایک سال سندھ میں رہا اور پھر اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر خلیفہ کے حکم کے مطابق واپس چلا گیا اور قید کی حالت میں فوت ہوا۔ لہٰذا سندھ میں عباسیوں سے زیادہ اموی قبیلے کی موجودگی کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں۔ "عباسی شمالی پاکستان" اور "آئینہ قریش" میں یہ بھی گمان کیا گیا ہے کہ ڈھونڈا اور سراڑہ اقوام کی تقریباً تمام شاخوں کے ساتھ لفظ "آل" (مثلاً چندال، رتنال، گوبندریال وغیرہ) کا اضافہ عربی زبان کے لفظ آل بمعنی اولاد کا ہے، لیکن ہمیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ڈھونڈا اور سراڑہ اقوام کے اسی علاقے میں سرسوت برہمنوں کی منہیال اور بھموال شاخیں بھی آباد تھیں۔ منہیال اور بھموال برہمن، انگریزی عہد تک اس علاقے میں آباد تھے اور ان کا تذکرہ پنجاب گورنمنٹ کے پہلے ہزارہ گزیٹیر میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ اکثر اقوامِ ہزارہ کی ذیلی شاخوں کے نام اسی طرز کے ہیں اور ان کے ہندی الاصل ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں۔

"تاریخ ہزارہ" مصنفہ کیپٹن ویس، ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء[1] اور کتاب پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی تینوں کا بیان ہے کہ ڈھونڈا، سراڑہ اور کرڑال تینوں اقوام ہندی الاصل ہیں۔ ڈھونڈا اور کرڑال اقوام کے بارے میں ہزارہ گزیٹیر کے الفاظ یہ ہیں:

"The Dhunds are identical in origin and character with Karrals".

لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی کیپٹن ویس کے حوالے سے لکھتا ہے:

"Thirty years ago their acquaintance with Muhammaden faith was still slight and though they now know more of it, and are more careful to observe it, relics of their Hindu faith are still observeable in their social habits".[2]

---

[1] ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء، صفحہ ۷۰ - ۴۹

[2] دی پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی صفحہ ۴۹

لیفٹیننٹ کرنل وائکلی آگے چل کر ٹوڈ Tod کے حوالے سے یہ انکشاف کرتا ہے کہ قوم ڈھونڈ پنوار Punwar راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ ولیس اور انفسٹن نے ڈھونڈ قوم کے کردار پر جو نکتہ چینی کی ہے شاید وہ ان کے تعصب یا ذاتی رائے کا نتیجہ ہو لیکن اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ڈھونڈ قوم کے تمام افراد ریونیو ریکارڈ میں اپنی قوم ڈھونڈ ہی لکھواتے رہے ہیں۔ اس میں انگریز کے جبر کا کوئی دخل نہ تھا۔ مشہور روایت کے مطابق یہ راجہ ڈمٹ پہلا سردار تھا جس کی سربراہی میں ڈھونڈ قوم کے اکثر افراد آزاد کشمیر کے علاقے سے نکل لورہ میں آباد ہو گئے۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مجھے ڈھونڈ قوم کے مسکن کی سیاحت کرنا پڑی اور مجھے جگہ بجگہ شاہ عبداللطیف المعروف بڑی امام کی نشست گاہیں نظر آئیں۔ شاہ عبداللطیف اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کے ایک مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے اس علاقے میں اشاعتِ اسلام ہوئی۔ ڈھونڈ قوم کے عام افراد ابھی تک ان کے عقیدت مند ہیں۔

ترکوں کے عہد میں یہ قوم زیادہ تر آزاد کشمیر اور پوٹھوہار کے علاقے میں آباد تھی۔ ان کا موجودہ علاقہ اس زمانے میں زیادہ تر جنگل تھا۔ لورہ آج کل ہزارہ میں ڈھونڈ قوم کا مرکزی موضع ہے۔ ترکی زبان میں لورہ کے معنی جنگل کے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے آخری عہد میں ریاستِ پکھلی کے ترکوں کے مابین ایک زبردست خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی جس میں سلطان مقرب خان حاکم دمتوڑ کا پلڑا بھاری رہا تھا۔ ترکوں کے زوال کے عنوان کے تحت اس خانہ جنگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دیگر ترک سرداروں کی درخواست پر اورنگ زیب عالمگیر نے ایک شاہی منصبدار سلطان مبارز الدین خان گکھڑ کو سلطان مقرب خان حاکم دمتوڑ کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے مامور کیا تھا۔ چنانچہ سلطان مبارز الدین خان نے سلطان مقرب خان کو شکست دی اور پھر شاہی فرمان کے مطابق کابل کے علاقے میں چلا گیا۔ اس فوجی کارروائی کے نتیجے میں یہاں آدمال گکھڑوں کا اثر و نفوذ زیادہ ہو گیا۔ پرگنہ فتحپور بابری پہلے سے ہی ان کی جاگیر میں شامل تھا۔ اب انہوں نے اپنی جاگیر کی سرحدیں علاقہ لورہ سے آگے بڑھ کر علاقہ ناڑہ بلکہ رجوعیہ تک وسیع کر لیں۔ اس طرح ڈھونڈ اور کرڑال دونوں اقوام ان کے ماتحت ہو گئیں۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی سرحدی علاقے میں بدامنی اور انتشار کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ترکوں کے اہم افراد خانہ جنگی میں ختم ہو چکے تھے اور ریاست پکھلی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے والیٔ پکھلی سلطان محمود خورد کے داماد سید جلال بابا نے چار ہزار سواتی لشکر کے ساتھ گل باغ کے دارالریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمہ قوم کے سلطان قاسم نے موجودہ علاقہ مظفر آباد

اور علاقہ لوٹی پر قبضہ کرلیا۔ تنولی قوم بھی بڑی تعداد میں علاقہ مہابن سے آگے بڑھ کر علاقہ تناول پر قابض ہوگئی۔ دریائے سندھ کے اس پار کے دیگر قبائل بھی یکے بعد دیگرے ریاست پکھلی اور پرگنہ ہزارہ قارلق کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ ۱۹۰۲ء کے لگ بھگ فرخ سیر کے زمانے میں جدون قوم نے دھتوڑ کے اہم قصبے پر قبضہ کرلیا۔ بغاوت و خانہ جنگی کے ان حالات کا اثر ڈھونڈا اور کرڑال اقوام کے علاقے پر بھی پڑا اور انہوں نے گکھڑوں کے خلاف آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

۱۷۲۸ء سے اس علاقے میں درانیوں کی پیش قدمی شروع ہوئی۔ درانیوں کا عہد شدید بدامنی کا دور تھا۔ گکھڑوں نے درانیوں سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اس لئے انہوں نے اس علاقے کی جاگیر انہیں کے پاس رہنے دی۔ ۱۸۱۴ء میں سکھ میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوئے۔ قبل ازیں وہ علاقہ راولپنڈی گکھڑوں سے چھین چکے تھے۔ گکھڑوں اور سکھوں کی باہمی کشمکش کے زمانے میں ڈھونڈا اور کرڑال اقوام بھی گکھڑوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ مورچہ قل خان کرڑال ساکن ناڑہ پہلا شخص جس نے گکھڑوں سے ٹکرلی اور موقعہ پاکر گکھڑ راجہ کو قتل کر دیا۔ تاریخ گکھڑاں اور مقامی روایت کے مطابق سکھوں کے عہد ہی میں ڈھونڈا اور کرڑال اقوام نے متحد ہوکر گکھڑوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مشہور گکھڑ سردار راجہ علی بہادر ایک لشکر لے کر لورہ کی جانب آگے بڑھا۔ لورہ کے قریب گڑھی کے مقام پر فریقین کے درمیان ایک لڑائی ہوئی جس میں راجہ علی بہادر زخمی ہوگیا اور گکھڑوں کو شکست ہوئی۔ بعدازاں راجہ تالی خان نے دوبارہ اس علاقے میں گکھڑوں کا اقتدار بحال کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اب ڈھونڈا اور کرڑال اقوام اپنے اپنے علاقے میں آزاد تھیں، لیکن انہیں زیادہ دیر تک آزادی کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ سکھ گکھڑوں اور میدان ہزارہ قارلق کی دیگر اقوام کو مغلوب کرنے کے بعد ڈھونڈا اور کرڑال اقوام کے علاقے پر بھی قابض ہوگئے۔ سکھوں کی کامیابی کا بڑا سبب پکھلی سرکار اور پرگنہ ہزارہ قارلق کی مسلمان اقوام کی باہمی چپقلش ہی تھی، جس طرح اس علاقے میں گکھڑ، ڈھونڈا اور کرڑال ایک دوسرے کی گردنیں مار رہے تھے، اسی طرح ترک، ترین اور تنولی ایک دوسرے سے مشت و گریبان تھے۔ آپس کی خانہ جنگی ہی سے تنگ آکر میدانِ ہزارہ قارلق کے ایک مشہور ترک سردار ہاشم خان نے سکھوں کو اس میدان پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ جب سکھ اس علاقے پر اپنا قبضہ مکمل کر چکے اس وقت مسلمان قبائل ہوش میں آتے، سکھوں کے ساتھ مسلمان قبائل کی کشمکش کے حالات اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔

کرڑال :

یہ قوم ہزارہ قدیم کی مشہور اقوام میں سے ایک ہے۔ ان کی اصل کے بارے میں یوں تو کئی قصے اور افسانے تواتر کے ساتھ بیان ہوتے چلے آرہے ہیں، لیکن کسی معتبر تاریخی شہادت کی عدم موجودگی میں ایسے قصوں کو تاریخ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ترکوں کے عہد کے مستند تاریخی ریکارڈ میں اس قوم کی اصل کے بارے میں کوئی قابل اعتماد بیان نہیں ملتا، اس لئے ڈھونڈ اور سراڑہ اقوام کی طرح ہمیں ان کی اصل تلاش کرنے کے سلسلے میں بھی انگریز مصنفین کے بیانات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ تاریخی حالات صرف انہی اقوام کے بند کئے جاتے رہے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی تاریخی کردار موجود ہوا ہو، البتہ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء کے زمانے میں ہزارہ پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تمام اقوام کے حالات رواج نامہ بندوبست، تاریخ ہزارہ، ہزارہ گزیٹیر اور مختلف علاقوں کی صورت دیہوں میں قلمبند کر دیئے تھے۔ اس زمانے میں کرڑال قوم کے تمام معتبر افراد نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ کلڑ شاہ یا کلڑ شاہ نامی ایک فرد کی اولاد ہیں اور اسی کی نسبت سے ان کو کرڑال پکارا جاتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ کلڑ شاہ کی اصل یا اس کے حالات زندگی کے بارے میں نہ تو کوئی تاریخی شہادت میسر ہے اور نہ ہی کرڑال خود اس کے متعلق کسی زبانی روایت پر متفق ہیں جہاں تک کلڑ شاہ اور کرڑال کے الفاظ کا تعلق ہے ان کے درمیان لسانی مطابقت پائی جاتی ہے۔ کلڑ کو عرف عام میں کرڑلو پکارا جاتا ہے۔ پنجاب اور ہزارہ کی زبانوں میں عام طور پر فضل کو فضلو، احمد کو احمدو اور کلڑ کو کرڑلو پکارا جاتا رہا ہے۔ کلڑ شاہ یا کرڑلو ایک ہندی الاصل لفظ ہے۔ غزنوی دور سے قبل کشمیر اور کابل کے تمام درمیانی علاقے میں تقریباً چار سو برس سے ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کی مضبوط بدھ اور ہندو سلطنتیں قائم رہ چکی تھیں اور ان کے حکمرانوں کو راجہ اور شاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ _____ کشن بدھ حکمرانوں کا لقب بھی کشن شاہ تھا۔ ترکی شاہیہ کے آخری حکمران لگاتورمن کے ہندو وزیر کا نام بھی کلڑ شاہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے زمانے تک شاہ نام کے ہندو خاندان ہزارہ میں موجود تھے؛ لہذا محض کلڑ شاہ یا کلڑ شاہ کے نام سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ صاحب ہمارے زمانے کے سید صاحبان کی طرح کے کوئی شاہ صاحب ہوتے ہوں گے یا یہ کہ وہ لازماً مسلمان ہی ہوتے ہوں گے۔

تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلڑ شاہ یا کرڑلو کی اولاد میں سے

غزنی خان پہلا معتبر کرڑال تھا جس نے ناڑہ کا مشہور موضع آباد کیا اور پھر اس کی اولاد یہیں پھلی پھولی اور رفتہ رفتہ اس موضع کو کرڑالوں کے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

کرڑالوں کی اصل کے بارے میں ہزارہ کے پہلے گزیٹیر کا مندرجہ ذیل بیان قابلِ غور ہے:[1]

"The Karrals were formely the subjects of Gokhars, from whome they emancipated themselves about two centuries ago. Originally Hindus, their conversion to Islam is of comparatively modern date. Thirty years ago their acquaintance with Mohammaden faith was still slight, and though they now know more of it, relics of their former Hindu faith are still observeable in their social habits"

کرڑالوں کی تاریخ دراصل اس وقت سے اجاگر ہوتی ہے جب سے انہوں نے گکھڑوں کے خلاف اپنی آزادی کی جدوجہد شروع کی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جدوجہد ان کے قبول اسلام کے بعد اس زمانے میں شروع ہوئی جبکہ ولایت پکھلی میں ترکوں کو زوال آچکا تھا اور یہاں درانیوں کی پیش قدمی کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ولایت پکھلی کے ایک ترک سردار سلطان مقرب خان حاکم دمتوڑ نے بغاوت کر دی تھی اور تاریخ گکھڑاں کے بیان کے مطابق اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیر نے ایک شاہی منصب دار سلطان مبارزالدین خان گکھڑ کو متعین کیا تھا۔ سلطان مبارزالدین خان نے سلطان مقرب خان کے مخالف ترک سرداروں کے تعاون سے اسے شکست دی۔ اس کارنامے کے سرانجام دینے کی وجہ سے اورنگ زیب عالمگیر نے سلطان مبارزالدین کو واشگل کی جاگیر عطا کر دی تھی۔ مبارزالدین خان دمتوڑ میں اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد

---

[1] ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء صفحہ ۴۹

کابل روانہ ہوا اور اسی علاقے میں متعین کر دیا گیا، لیکن اس گکھڑ راجے کی اس فوجی کارروائی کے نتیجے میں اس علاقے میں گکھڑوں کا عمل دخل زیادہ ہو گیا۔ پرگنہ فتحپور بابری (علاقہ راولپنڈی) پہلے ہی سے آدمال گکھڑوں کی جاگیر میں شامل تھا مگر سلطان مقرب خان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے نتیجے میں گکھڑوں کا حلقۂ اثر پرگنہ فتحپور بابری سے آگے بڑھ کر علاقہ لورہ، ناڑہ بلکہ رجوعیہ تک وسیع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ سید پور (علاقہ راولپنڈی) کے بعد خان پور بھی گکھڑوں کا ایک مرکزی مقام بن گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری دورِ حکومت سے درانیوں کی پیش قدمی کے زمانے تک یہی صورتِ حال قائم رہی اور گکھڑ، ڈھونڈ اور کرڑال اقوام کے حکمران بنے رہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ولایتِ پکھلی کی تمام اقوام ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ بلکہ دریائے سندھ کے دوسرے کنارے سے سواتی، تنولی اور افغان اقوام نے بھی ولایتِ پکھلی میں بطورِ یلغار داخل ہونا شروع کر دیا۔ ان اقوام کے دیکھا دیکھی ڈھونڈ اور کرڑال اقوام نے بھی گکھڑوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد شروع کر دی۔ غزنی خان ساکن ناڑہ کی اولاد میں سے مورچہ قلی خان پہلا کرڑال سردار تھا جس نے گکھڑ راجہ کے خلاف بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا۔ تاریخ ہزارہ میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے کہ ایک بار جبکہ قلی خان زمین کا معاملہ ادا نہ کر سکا تو گکھڑ راجہ نے اسے گرفتار کر کے اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا۔ مورچہ قلی خان گکھڑ راجہ کی اس بدسلوکی کی وجہ سے سخت برہم ہوا اور اس نے رہائی پاتے ہی گکھڑ راجہ کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد گکھڑوں کے خلاف بغاوت کی فضا پیدا ہو گئی۔

درانیوں اور سکھوں کا عہد گکھڑوں کے لئے ایک ابتلا کا زمانہ تھا۔ انہیں جہاں ایک طرف ان بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا، وہاں اندرونی طور پر ڈھونڈ اور کرڑال اقوام کی مزاحمت سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے گکھڑوں سے پوٹھوہار چھین لیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد سردار ہلکھا سنگھ نے راولپنڈی کے علاقے سے بھی گکھڑوں کو بے دخل کر دیا اور نجف خان گکھڑ سید پور سے خان پور منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ان حالات میں ڈھونڈ اور کرڑال اقوام نے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ لورہ کے قریب گڑھی کے میدان میں ایک گکھڑ سردار راجہ علی بہادر نے ان دونوں اقوام کے خلاف آخری لڑائی لڑی جس میں وہ زخمی ہوا اور چند دنوں بعد فوت ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد راجہ تالی خان نے اس علاقے پر دوبارہ گکھڑوں کا اقتدار بحال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکا۔ ناڑہ اور ستوڑہ کرڑالوں کے مرکزی مقامات بن گئے۔ بلکہ ان کا حلقۂ اثر دریائے سواں سے کلیات تک کے علاقے تک وسیع ہو گیا۔

بدقسمتی سے کرڑالوں کو زیادہ دیر تک آزادی کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے ہزارہ قارلق کو باضابطہ طور پر اپنی قلمرو میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب اس علاقے میں کرڑالوں اور سکھوں کے مابین کشمکش شروع ہوگئی۔ اسی دوران میں اس علاقے میں تحریک مجاہدین کے اثرات پھیلنے شروع ہوئے۔ ۱۸۴۵ء کے قریب اس تحریک کے ایک رہنما مولانا محمد قاسم نے کرڑالوں کے علاقے میں سکونت پذیر ہو کر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی۔ اسی زمانے میں کرڑالوں کا مشہور سردار حسن علی خان تھا۔ سکھوں کے خلاف کرڑالوں کے جہاد کے تفصیلی حالات اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔

بمبہ :

یہ ولایت پکھلی کی ایک قدیم قوم ہے۔ ترکوں کے عہد میں ان کی آبادی زیادہ تر موجودہ آزاد کشمیر کے علاقے میں تھی۔ ترکوں کے زوال کے زمانے میں اس قوم کے کچھ افراد علاقہ بوئی میں آکر آباد ہو گئے جہاں وہ ابھی آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس قوم کے کچھ افراد جہلم میں بھی آباد ہیں۔

تاریخ ہزارہ کا مصنف کیپٹن ویس لکھتا ہے کہ انگریزوں کے ابتدائی بندوبست کے زمانے میں بمبہ قوم کے بزرگوں نے بیان کیا تھا کہ وہ نسلاً عثمانی قریش ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ (عہد جہانگیری میں) سلطان کاشف علاقہ آزاد کشمیر میں آئے اور راجکوٹ کے مقام پر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے اس ملک میں آنے کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ سلطان کاشف دراصل بدخشان کے رہنے والے تھے کسی وجہ سے وہ اپنے بھائی تاجدین سے ناراض ہو گئے اور بدخشان سے نکل کر یہاں تشریف لے آئے۔ ان دنوں رعیت قوم ترک سے بہت نالاں تھی۔ چنانچہ انہوں نے سلطان کاشف کی آمد کو غنیمت جانا اور چند دیہات کے عوام نے مل کر معاملہ زمین سلطان کاشف کو دینا شروع کر دیا۔ ان دنوں قوم ترک کی طرف سے مسمی کمال خان اس علاقے کا حاکم تھا اور وہ بمقام کوڑمنگ، جو کہ موجودہ مظفر آباد کے قریب تھا، رہائش پذیر تھا۔ لوگ اس کے ظلم و ستم سے بہت تنگ تھے۔ کمال خان نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان کاشف سے کر دی، مگر کچھ عرصہ بعد وہ اسے دھوکے سے شکار کے بہانے باہر لے گیا اور قتل کروا دیا۔ سلطان کاشف کے قتل کے چھ ماہ بعد اس کا بیٹا سلطان قاسم پیدا ہوا۔ اس نے بڑے ہو کر اپنے نانا کمال خان ترک کو قتل کر کے اپنے باپ کا بدلہ لیا۔ اس طرح سلطان قاسم کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ اسی دوران میں چونکہ پکھلی خاص پر سواتیوں نے سید جلال بابا کی سربراہی میں قبضہ کر لیا تھا، اس لئے ترک

سُلطان قاسم کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکے اور وہ اس علاقے کا حکمران بن گیا۔

یہ ہے بمبہ قوم کے بعض بزرگوں کا وہ بیان جو انہوں نے ابتدائی بندوبست کے زمانے میں دیا اور جسے ویس صاحب نے تاریخ ہزارہ میں نقل کر دیا۔ اس سلسلے میں اگر ترکوں کا ایک بیان بھی نقل کر دیا ہوتا تو شاید ان کے درمیان مقابلہ و موازنہ کر کے اصل حقیقت کو پالینا آسان ہو جاتا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

اگر ہم بمبہ قوم کے بزرگوں کے مندرجہ بالا بیان کا تاریخی حقائق کی روشنی میں تجزیہ کریں تو اس کی صحت نہایت مشکوک نظر آتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۵۸۲ء میں شہنشاہ اکبر کی پہلی فوج نے کشمیر پر چڑھائی کی تھی اور کھکھہ اور بمبہ دونوں اقوام نے مل کر اکبری فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اس تاریخی واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۵۸۲ء یعنی اکبری دور میں کھکھہ اور بمبہ دونوں قومیں اس کثرت کے ساتھ اس علاقے میں موجود تھیں کہ انہیں اکبری فوج کے مقابلے کی جرأت ہوئی۔ اکبر بادشاہ جہانگیر کا باپ تھا؛ لہٰذا یہ بات قطعی غلط ہے کہ عہدِ جہانگیری میں بمبہ قوم کے مورثِ اعلیٰ سلطان کاشف بدخشاں سے چل کر کوٹلہ کے علاقہ راجکوٹ میں آباد ہوتے۔ علاوہ ازیں بمبہ قوم کے بزرگوں کے بیان کی داخلی شہادت بھی اسے مشکوک بنا رہی ہے۔ عجب معاملہ ہے کہ عہدِ جہانگیری یعنی ۲۷-۱۶۰۵ء کے درمیان سلطان کاشف راجکوٹ میں سکونت پذیر ہوتے ہیں۔ کمال خان ترک ان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر کے چھ ماہ بعد انہیں دھوکے سے قتل کرا دیتا ہے۔ پھر مقتول کا بیٹا بڑا ہو کر ۱۷۱۳ء کے لگ بھگ یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہدِ حکومت کے بعد اپنے نانا کمال خان کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیتا ہے اور بالآخر اس علاقے کا حکمران بن جاتا ہے۔ اسی تاریخ ہزارہ میں پکھلی اور قلعہ گلی باغ پر سیّد جلال بابا کے سواتی لشکر کے قبضے کا سن ۱۷۰۳ء بیان کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عہدِ جہانگیری سے عہدِ عالمگیری کے اختتام تک سلطان قاسم زندہ رہا تا آنکہ اپنے عہدِ پیری کے پچھلے حصے میں اُس نے اپنے نانا کو قتل کر کے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیا۔ اس حساب سے خدا جانے نانا صاحب نے کتنی عمر پائی ہوگی۔

تمام معتبر کتب تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جا سکتا ہے کہ عہدِ جہانگیری، عہدِ شاہجہانی اور عہدِ عالمگیری کے تقریباً ایک صد سالہ دور میں ولایت پکھلی کے ترک حکمران سُلطان نصیر الدین حسین خان، سُلطان شامان خان فاتح آقچہ اور سُلطان محمود خورد جیسے طاقتور سلاطین تھے۔ ان کے نام ابھی تک شاہی منصب داروں میں موجود ہیں۔ ان کے فوجی کارناموں کا ذکر اکبر نامہ، توزکِ جہانگیری، شاہجہان نامہ، مآثر الامرا جیسی بلند پایہ کتب تاریخ

میں موجود ہے؛ لہٰذا یہ بات قابلِ تسلیم نہیں کہ اس دور میں ان مضبوط سلاطین کی موجودگی میں ایک غریب الوطن شخص کا یتیم بچہ اتنی بڑی بغاوت کو کامیاب کر دکھاتا۔ بمبہ قوم کا تمام علاقہ شاہراہِ کشمیر کے اردگرد واقع تھا اور تقریباً ہر سال شہنشاہ اسی راستے سے کشمیر کے دورے پر روانہ ہوا کرتے تھے، اس لئے اس شاہراہ پر کسی قسم کی بدامنی یا بغاوت مرکزی حکومت کے لئے بھی ناقابلِ برداشت تھی اور اگر کوئی بغاوت ہوتی تو اس کا ذکر ضرور کتب تاریخ میں کیا جاتا۔

کتاب پنجابی مسلمان میں لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی لکھتا ہے کہ کھکھہ اور بمبہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے قرابت دار ہیں اور ان کا شجرہ نسب جنجوعہ قبیلے سے جا کر ملتا ہے۔ اس مصنف نے ان دونوں قبیلوں کے اکبری فوج کے مزاحمت کرنے کے تاریخی واقعہ کو بھی نقل کیا ہے۔ جنجوعہ قبیلہ کی اصل کے بارے میں واٹکلی نے یہ تاریخی روایت بھی نقل کی ہے کہ اس قبیلے کے مورثِ اعلیٰ کا نام راجہ مل تھا اور وہ ہندو شاہیہ گندھارا کے پال خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس نے غزنوی حملوں کے دوران میں غزنوی ترکوں کی افواج کی مزاحمت کی، لیکن شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے اسلام لانے کے موقعہ پر غزنویوں نے اسکے گلے کا جنجو اتار کر توڑ پھینکا اور اسی وجہ سے وہ جنجوعہ مشہور ہوا۔ اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہوئی۔ جنجوعہ کے بیٹے تھے، جن کے نام یہ ہیں دیر، جودھ، ککھا، ترنولی، دبوچاڑہ اور کالا۔ ان میں سے بمبہ قوم کی قرابت داری ککھا سے ہے اور وہی ان کا مادری قبیلہ ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب:

تاریخ ہزارہ اور کشمیر کے مطالعہ سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بمبہ قوم پرانے زمانے سے علاقہ آزاد کشمیر میں آباد تھی۔ ترکوں کے زوال یعنی ۱۷۱۳ء کے زمانے میں جبکہ سلطان محمود خورد سرحدی علاقے میں باغیوں کی سرکوبی کرتا ہوا شہید ہو چکا تھا اور یہاں ترکوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں پکھلی سرکار کے دوسرے علاقوں کی طرح علاقہ آزاد کشمیر میں بھی ترکوں کے خلاف بغاوت کی فضا پھیل چکی تھی۔ یہ علاقہ ترکوں کے عہد میں پکھلی سرکار کا ایک حصہ تھا اور اس کے ترک حاکم گلی باغ سے مقرر کئے جاتے تھے۔ گلی باغ پر سید جلال بابا کے سواتی لشکر کے قبضے کے بعد یہ علاقہ خود بخود اپنے مرکز سے کٹ گیا اور سلطان قاسم کے لئے بغاوت کو کامیاب بنانا آسان ہو گیا جس طرح سید جلال بابا سلطان محمود خورد والی پکھلی کے داماد ہونے کے سبب پکھلی پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ اسی طرح اس علاقے پر سلطان قاسم بھی کمال خان ترک کے داماد ہونے کے سبب اپنا حق ثابت کر رہا تھا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ترکوں کے معتمد ہونے کی بنا پر بمبہ قوم کو دوسری رعایا پر فضیلت

حاصل تھی؛ لہٰذا ترکوں کی خانہ جنگی اور ان کے زوال کے بعد اس علاقے میں وہی ان کے جانشین بنے۔

ترک سلاطین کی طرز پر بمبہ قوم کے سردار نے بھی اپنے لئے "سلطان" کا لقب اختیار کرلیا۔ یہ لقب اب تک ان کے بڑے بڑے خاندانوں میں مستعمل ہے۔ ترکوں کے زوال کے بعد بمبہ قوم کو اس علاقے میں عروج حاصل ہوگیا۔ آزاد کشمیر کا موجودہ دارالحکومت مظفرآباد اسی قوم کے ایک معتبر آدمی کا بسایا ہوا ہے۔ ترکوں کے زمانے میں کوڑمنگ کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ اب کوڑمنگ کا وجود باقی نہیں رہا، لیکن حکومت آزاد کشمیر کے صدر مقام ہونے کی وجہ سے مظفرآباد ایک ترقی یافتہ شہر بن گیا ہے۔ درانیوں کے غلبے سے قبل بمبہ قوم نے علاقہ بوئی، پونچھ، بالاکوٹ اور کشمیر کے درمیانی علاقے میں اپنا اقتدار قائم کردیا تھا اور وہ اس طرح ان علاقوں کی سب سے زیادہ باوقار قوم بن گئے تھے۔ ترک افراتفری کے عالم میں دور دراز علاقوں میں چلے گئے اور ان کی کوئی تنظیم باقی نہ رہی۔ ترکوں کی امیدیں کشمیر سے وابستہ تھیں جہاں درانیوں کی آمد تک مغل صوبیدار حکمرانی کر رہے تھے؛ لہٰذا ان کی خاصی تعداد نے کشمیر کا رُخ اختیار کیا۔ اب بھی کشمیر اور آزاد کشمیر کے کم و بیش اٹھارہ دیہات میں پکھلی وال اور دھنوڑی ترک آباد ہیں۔

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق سلطان قاسم نے علاقہ کوٹلی، گھوڑی، درّہ بالاکوٹ، بیرن گلی اور دوبیٹہ کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ان علاقوں میں اگرچہ سراڑہ، گوجر اور دیگر اقوام کے افراد بھی آباد تھے، لیکن وہ بمبہ قوم کی مزاحمت نہ کرسکے۔ کچھ عرصہ بعد سواتیوں نے علاقہ پکھلی سے آگے بڑھ کر درّہ بالاکوٹ کا علاقہ بمبہ قوم سے چھین لیا۔ اس زمانے میں سید جلال بابا اور مراد خان علاقہ پکھلی میں اور سلطان قاسم علاقہ مظفرآباد آزاد کشمیر میں سب سے زیادہ بااثر افراد تھے۔ ترکوں کے عہد میں کلیدی اسامیوں پر فائز رہتے ہوئے ان حضرات نے چونکہ حکمرانی کا کچھ نہ کچھ تجربہ بھی حاصل کیا ہوا تھا، اس لئے درانیوں کی آمد تک وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اپنے علاقے کا نظم و نسق چلاتے رہے۔

ترک اور مغل

مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ زمانۂ قبل از اسلام میں بھی تورانی النسل ترک اور مغل جنہیں ازمنۂ وسطیٰ میں تاتاری بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ افغانستان، پاکستان اور شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر صدیوں تک حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں وہ آفتاب پرستی، آتش پرستی اور اصنام پرستی کے کتنے ہی دور گزارنے کے بعد بالآخر ہندی تہذیب کو اختیار کر کے ہندو دھرم یا بدھ مت اختیار کر چکے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں انہیں از سرِ نو عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ سلطان محمود غزنوی پہلا ترک مسلمان حکمران تھا جس نے خلافتِ عباسیہ کی موجودگی میں ایک آزاد ترک مسلمان ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے بعد متعدد ترک قبائل جن میں غوری، سلجوقی، عثمانی، خاندانِ غلاماں کے متعدد حکمران، خلجی اور تیموری سبھی شامل ہیں، نہ صرف ہندوستان بلکہ چین سے لے کر یورپ، اور ماسکو سے لے کر افریقیائی ممالک تک صدیوں تک حکمران رہے۔ ہندوستان میں ترکوں کی حکمرانی کا زمانہ سات سو برس سے کم نہیں۔ ولایتِ پکھلی پر ترکوں کا ایک ہی تموئی قزلق قبیلہ تین سو برس تک مسلسل حکمرانی کرتا رہا؛ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ترکوں کی اصل اور ہندوستان میں ان کی آمد، بالخصوص پکھلی سرکار میں ان کی آبادکاری کے سلسلے میں چند حقائق بیان کر دیے جائیں۔ کچھ لوگ ترکوں اور مغلوں کے امتیاز کو بھی نہیں جانتے، اس لئے ان دونوں اقوام کی باہمی مماثلت اور ان کے اختلافات کو واضح کرنا بھی ضروری دکھائی دیتا ہے۔

لغوی طور پر ترک کے معنی لوہے کی ٹوپی یعنی خود کے ہیں۔ ٹومسن نے اس لفظ کا معنی قوت اور باس کیا ہے۔ ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ ترکوں کے اصل وطن توران میں ایک خود نما پہاڑ ہے جسے ترک کہا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قسطنطنیہ کے علاقے میں ترک نامی ایک دریا بھی موجود ہے

جس کی لمبائی تین سو میل اور چوڑائی بعض مقامات پر پانچ سو گز ہے۔ ترکوں کے قدیم شجرہ نسب اور ان کی مشہور قومی روایت کے مطابق ترک چونکہ ترک بن یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لیئے وہ ترک مشہور ہوتے ہیں۔ بظاہر لفظ ترک کے ان مفہومات کے درمیان کچھ تضاد نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت ان کے درمیان گہرا ربط معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر لغوی مفہوم کے اعتبار سے یافث بن نوح علیہ السلام کے بیٹے کا نام ترک رکھا گیا ہو اور پھر اسی معروف شخصیت کے نام پر ایک دریا یا پہاڑ کا نام رکھا گیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مشہور شخصیتوں کے ناموں پر ہمیشہ سے مقامات کے نام رکھے جاتے ہیں۔ مشہور روایت یہ ہے کہ ترک بن یافث توران کے ایک مقام عیسیٰ کل Issyk-kul کے قرب وجوار میں پیدا ہوتے تھے۔ طوفانِ نوح کے بعد نوح علیہ السلام نے جودی پہاڑ سے اُتر کر توران کے علاقے میں نخجوان کا مشہور شہر آباد کیا تھا اور پھر یہیں سے ان کی اولاد مختلف اطراف میں پھیلتی چلی گئی تھی۔

اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ دانش گاہِ پنجاب کے بیان کے مطابق ہمیں تیسری صدی عیسوی میں ترکوں کی اصل سرزمین توران میں ترکوں کے پانچ ابتدائی قبیلوں کا نام ملتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔ قیرغیز، کیماک، قپچاق، تغزغز اور قرلق۔ ان میں سے قپچاق ان ترکوں کو پکارا جاتا ہے جو صحرا کے علاقے کے رہنے والے ہوں۔ دشتِ قپچاق انہی کے نام سے مشہور ہے۔ ترکی زبان میں قرلق Karluke ان ترکوں کو کہا جاتا ہے جو برفستانی علاقے کے علاقے رہنے والے ہوں۔ ابتدائی زمانے میں قرلق دریائے ارتش کے دہانے کے قریب اور اس کے بالائی مجری کے علاقے میں مسکن پذیر تھے۔ عربی زبان میں قرلق کو خرلخ اور خلخ Khalukh کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ قرلق ترک آگے بڑھتے چلے گئے۔ بنوامیہ کے دور میں قرلق ترک ہی بلادِ اسلامیہ کے قریب ترین ہمسائے تھے۔ محمود کاشغری نے قرلق اور اوغوزی قبیلہ کو ایک ہی قبیلہ شمار کیا ہے جو بالکل درست ہے۔ اسی کتاب کی ایک اور جگہ ترکوں کا ایک شجرہ نسب درج کیا گیا ہے۔ یہ دراصل تیموریوں کا شجرہ نسب ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اوغوز خان Oghuz Khan ترکوں کا ایک مشہور و معروف جدِ امجد تھا۔ اسی کے نام سے قرلق ترکوں کی اوغوزی شاخ مشہور ہوئی۔ شجرہ نسب میں اوغوز خان کا نام امیر تیمور کی ستائیسویں پشت میں آتا ہے۔ اوغوز خان کا تعلق چونکہ قرلق قبیلے سے تھا، اس لیئے محمود کاشغری نے اوغوزی اور قرلق ترکوں کو ایک ہی قبیلہ شمار کیا ہے۔

بنوامیہ کے زمانے میں قرلق ترک فرغانہ، بخارا، نسف، کیش اور سمرقند کے علاقے میں آباد تھے۔

یہی وجہ تھی کہ انہیں سب سے پہلے اسلام اور اسلامی زندگی سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ۷۰۵ء سے ۷۱۳ء تک کے درمیانی عرصے میں بنو امیہ کا مشہور جرنیل قتیبہ قرلقوں کے اہم ترین علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس وقت بخارا اور سمرقند میں بدھ خانقاہیں موجود تھیں۔ ترکوں میں سے بعض آفتاب پرست اور بعض بدھ مت کے پیروکار تھے۔ انہی قرلقوں کے مشہور علاقہ کشنیا کی وجہ سے کشن خاندان کو شہرت ملی تھی۔ کشنیا علاقہ صوغد کا ایک مشہور قصبہ اور ضلع تھا۔

ترکوں کے حکمرانوں کے لئے مختلف ادوار میں مختلف القابات استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ خان، قاغان، قازان، تگین، ترخان، یبغو، نویان وغیرہ کے القابات قدیم زمانے سے استعمال کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ شرفا کے لئے میرزا، بیگ، آفندی، خواجہ اور دیوان کے القابات استعمال ہونے لگے۔ اب تک مختلف ترک خاندانوں میں ان القابات کا استعمال جاری ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے بیان کے مطابق خلافت راشدہ میں ترکوں[1] کے متعلق یہ پالیسی اختیار کی گئی تھی کہ "ترکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، جیسا کہ انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔" (ابن الفقیہ: ۳۱۴، ابن خرداذبہ ۲۶۲۔ یاقوت معجم ۸۳۸)

یہ پالیسی آنحضرت کے اس ارشاد کے مطابق کی گئی تھی کہ "ترکوا الترک کما ترکوکم" یعنی ترکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، جیسا کہ انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ ترکوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض اقوال بھی منسوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا "تعلموا لسان الترک فان لھم ملکا طوالا" (ترکوں کی زبان سیکھو، اس لئے کہ ان کے مقدر میں مدت دراز تک حکمرانی لکھ دی گئی ہے) اردو دائرہ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ترک از خود مشرف باسلام ہوتے۔ ان کے اسلام لانے کا سلسلہ بنو امیہ کے دور سے شروع ہوا اور دسویں صدی تک جاری رہا۔

دسویں صدی کے آغاز میں سلطان محمود غزنوی نے غزنی میں پہلی بار ایک مضبوط اور آزاد ترکی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ غزنویوں کے بعد غوری، سلجوقی، خلجی، عثمانی، قراغانی، خوارزمی، ایوبی اور تیموری ترک صدیوں تک اسلامی تہذیب کے علمبردار بن کر مشرق و مغرب کے بیسیوں ممالک پر حکمرانی کرتے رہے۔ خلافت

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب جلد ششم صفحہ ۲۲۶

عباسیہ کے زوال کے بعد ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ کا آغاز ہوا۔ سلطان سلیم اوّل ترکوں کا پہلا مسلمان خلیفہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء تک ترک ہی خلافتِ اسلامیہ کے علمبردار بنے رہے۔ آئندہ صفحات میں ہندوستان میں ترکوں کے مشہور شاہی خاندانوں کا ایک مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں تاریخِ اسلام بڑی حد تک ترک مسلمانوں ہی کے عہد کی تاریخ ہے۔

جہاں تک لفظ مغل کا تعلق ہے، اس کا استعمال برِصغیر میں بڑا غلط ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے تاریخِ ہند کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ترکوں کی مشہور تاریخی روایت کے مطابق مغل کا لفظ اس مغل خان کے نام سے مشہور ہوا تھا جو تیموریوں کے شجرہ نسب کے مطابق ترک بن یافث کی اولاد تھا۔ اس مغل خان نے ابتدائی طور پر منگولیا یا مغولستان میں ایک ریاست قائم کی تھی جو لوگ منگولیا کے رہنے والے تھے، انہیں چینیوں کی اصطلاح میں منگول کہا جاتا تھا۔ یہی لفظ منگول مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مغول اور پھر مغل مشہور ہوگیا۔ نسلی طور پر لفظ منگول یا مغول کا اطلاق منگولیا کے باشندوں پر ہی ہوتا تھا۔

گیارھویں صدی تک منگولیا کے باشندے خانہ بدوش قبائلی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بارھویں صدی میں پہلا منگول حکمران قتلا قاغان Qutula Kaghan تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے بعد منگولوں میں سب سے بڑا حکمران تموچین (چنگیز خان) پیدا ہوا۔ چنگیز خان نسلاً ترک تھا اور اس کے آباؤ اجداد چند پشتوں سے منگولیا کے علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔ منگول حکمران چنگیز خان نے اپنے لئے ترکوں ہی کے بڑے خان کا لقب "قاغان" اختیار کیا تھا۔ چنگیز خان نے لفظ مغول کو سرکاری اصطلاح کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ لفظ مغول کے اس استعمال کے سلسلے میں روسی مصنف بارتھولڈ لکھتا ہے:

> "According to the testimony of Meng. Hang the word Mongol was under Chingiz Khan an official term only, and entirely unknown to the nation itself, still in official documents of Yuan dynesty, the Mongols and the peoples amalgamated with them are still called in China Mongols,

in Mongolia Tartars. By adopting the term Mongol for his tribe, Tomuchin (Chingiz Khan) declared himself "the successor of Qutula Qaghan."[1]

اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ درس گاہِ پنجاب نے بھی یہی لکھا ہے کہ چنگیز خان بھی امیر تیمور کی طرح ترکی النسل تھا لیکن اس کے آباؤ اجداد ہجرت کر کے مغولستان کے شمالی علاقے کی طرف چلے گئے تھے؛ لہٰذا چنگیز خان کی زبان ترکی کی بجائے مغولی بن گئی تھی۔ مستند حوالہ جات کے ساتھ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ میں لکھا ہے:

"تیمور اور اس کی اولاد کی طرح چنگیز خان بھی اپنے آپ کو ترک سمجھتا تھا، حالانکہ اس کی مادری زبان مغولی تھی۔ جب وہ افغانستان میں تھا اور ان علمائے حق میں سے جو اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ قاضی وحید الدین نے رسول اللہؐ کی وہ حدیث پڑھی جو ترکوں سے متعلق تھی، تو چنگیز خان نے اسے اپنے ہی متعلق تصور کیا اور رسول اللہ صلعم کے لئے "محمد یلواج" (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلمات ادا کئے۔"[2]

چنگیز خان کے ایجاد کردہ سکوں اور اس دور کی ترکی شاعری سے بھی اس کے ترکی النسل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ امیر تیمور کے مورخ نظام الدین شمنی اور اس دور کے اوغور مصنفین کی تحریروں کے علاوہ رشید الدین، شرف الدین اور الغ بیگ میرزا کابلی کے مرتب کردہ تمام تیموری اور چنگیزی شجروں سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر تیمور اور چنگیز خان کا شجرہ نسب قبل خان کے باپ تومنائی خان یا تومنہ خان پر جا کر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ اس کتاب میں امیر تیمور کے منسلک کردہ نسب سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتے گی چنگیز خان کے دور میں لفظ منگول یا مغول کے سرکاری اصطلاح کے طور پر استعمال کئے جانے سے، صرف منگولیا بلکہ چنگیز خان کی تمام تاتاری افواج کے لئے لفظ مغل کا استعمال عام ہو گیا۔ اب اس سے مراد منگولیا کے قدیم باشندے نہ تھے، بلکہ چنگیز خان کی افواج مراد تھیں، جن میں منگولیا اور توران کے سپاہی شامل تھے۔

چنگیز خان مشرف باسلام نہیں ہوا تھا، وہ اسلامی تہذیب سے روشناس ہونے کے باوجود وسط

---

[1] Turkistan Down to Mongol Invasion, Barthold

[2] اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ دانش گاہ پنجاب کراسہ چنگیز خان صفحہ ۱۰۱-۷۰-۳۸۲۷۷

ایشیا کے قدیم شمنی مذہب کا پجاری رہا۔ اس مذہب میں بُت پرستی موجود تھی اور تورانی النسل اقوام میں اسے عرصۂ دراز سے مقبولیت حاصل تھی۔ اپنے مغول کی رہنمائی کے لئے چنگیز خان نے اوغور رسم الخط میں یاسا کا اپنا قانون نافذ کیا۔ اس قانون کی وضاحت یا تشریح کے لئے چنگیز خان کے بلیک یعنی ملفوظات استعمال کئے جاتے تھے۔ یاسا اور بلیک کو ماخذِ قانون تصور کیا جاتا تھا۔ تومنائی خان تک چنگیز خان کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ تموچین چنگیز خان بن سیوکای بہادر بن پرتان بہادر بن قبلہ خان بن تومنائی خان۔ ترکی اور مغولی زبانوں کے تلفظ اور لب و لہجہ کے فرق کی وجہ سے بعض شجروں کے ہجے تبدیل ہو گئے ہیں۔

وہ قبائل جنہیں چنگیز خان نے ۱۲۰۶ء میں "مغول" کے نام سے جمع کر لیا تھا اور جن پر اس کی قوت کا دارومدار تھا، چیاؤ حصو گوتین کی یادداشت میں جسے جنوبی چین کی حکومت کی طرف سے ایلچی کے طور پر چنگیز خان کے پاس بھیجا گیا تھا۔ محض "تاتار" کے عمومی نام سے مذکور ہیں۔ چنگیز خان کے خاندان اور قبیلے کا نام قرا تاتار تھا (قرا خان تموچین چنگیز خان اور امیر تیمور دونوں کا ایک نامور جدِ امجد تھا) دوسرا گروہ آق تاتار کے نام سے مشہور تھا اور تیسرے گروہ کا نام وحشی تاتار تھا، آگے چل کر یہ تینوں گروہ کئی قبیلوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ ان سب کو انوس و اویماق مغل پکارا جاتا تھا۔

چنگیز خان کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا چغتائی خان اس کا جانشین بنا، وہ بُدھ مت کا شیدائی تھا، لیکن سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اُس نے اپنے باپ کے قوانینِ یاسا کو نافذ کر رکھا تھا۔ اس کا دور اہلِ اسلام کے لئے ابتلا کا دور تھا، لیکن اس نے حکومت کے تمام عہدے منگولوں کی بجائے ترکوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ اس کے بعد بھی چغتائی حکمرانوں پر ترکی تہذیب کے اثرات اتنے غالب ہوتے چلے گئے کہ آخری چغتائی حکمران مغولی زبان نہیں سمجھتا تھا اور اس نے ترکی ہی کو عدالت کی زبان قرار دے رکھا تھا۔ امیر تیمور کے مندرجہ بالا مؤرخین کی بیان کردہ حکایت کے مطابق چنگیز خان کے پردادا قُبل خان اور امیر تیمور کے جدِ امجد قاچولی بہادر دونوں تومنائی خان کے بیٹے تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں یہ طے پایا تھا کہ آئندہ تخت کا وارث قُبل خان کی اولاد سے ہوا کرے گا اور اس کا وزیر قاچولی بہادر کی اولاد سے ہوا کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عہد نامہ علی سلطان کے عہد میں گم ہو گیا۔ ظفر نامہ، اکبر نامہ، روضۃ الصفاء، اور آدابِ عالمگیری میں امیر تیمور کے جدِ امجد قاچولی بہادر کا ایک خواب بھی نقل کیا گیا ہے، جو اس حکایت کی تائید کرتا ہے۔ اس حکایت اور خواب کو چونکہ تواتر کے ساتھ مندرجہ بالا کتب میں بیان کیا جاتا رہا ہے، اس لئے ان سے کم از کم یہ ثابت ہوتا

ہے کہ مورخین کے نزدیک چنگیز خان اور امیر تیمور نسلاً دونوں ترک تھے اور تومنائی خان پر جاکر ان کا شجرہ نسب ایک دوسرے سے مل جاتا تھا۔ چنگیز خان نے صرف سرکاری اصطلاح کے طور پر اپنے عساکر کا نام مغول رکھا تھا اور وہ خود نسلاً منگول نہ تھا۔ چنگیز خان کے عہد سے اردگرد کے ممالک شمال کی طرف سے پیش قدمی کرنے والے ہر فاتح جوان بخت کے لئے مغول یا مغل کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ چنگیز خان کے مغولوں نے کوریا سے آرمینیا تک اور تبت سے دریائے تبیل تک ہر ملک میں اپنی طاقت اور عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ عرصہ دراز تک حالت یہ ہوگئی کہ جب بھی شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا کوئی لشکر دکھائی دیتا، لوگ 'مغولاں آمدند' 'مغولاں آمدند' کا شور بپا کر دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ آج تک ظہیر الدین بابر کی بنا کردہ تیموری ترکوں کی سلطنت کو سلطنت مغلیہ ہی کے نام سے جانتے ہیں، حالانکہ تمام کتب تاریخ اور عظیم تیموری حکمرانوں کی توزکات اس بات کا بین ثبوت پیش کر رہی ہیں کہ امیر تیمور ترک تھا نہ کہ منگول یا مغل۔

ترکوں کا اصل وطن توران کی وہی ازلی و ابدی سرزمین ہے جس سے زمانہ قبل از اسلام میں آرین، ستھین، پارتھین، ہن اور کشن اقوام آندھی طرح اٹھیں اور سمندر کی خوفناک طوفانی لہروں کی طرح مشرق و مغرب میں پھیلتی چلی گئیں۔ لفظ توران ایک ایرانی اصطلاح ہے جس کا اطلاق اس ملک پر ہوتا ہے جو ایران کے شمال مشرق میں واقع ہے اور جسے دریائے آمول ایران سے جدا کرتا ہے۔ شاہنامے میں بیان کی گئی روایت کے مطابق افراسیاب جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے ترک مگر نسلاً تورین فریدوں کی نسل سے تھا، اس علاقے کا بادشاہ تھا جسے توران کہتے ہیں۔ فریدوں اپنے بیٹے سلم، تور اور ایرج کو اس وقت یہ نام دیتا ہے جبکہ ان کی سیرت معلوم کرنے کے لئے ان کی آزمائش کر لیتا ہے۔ سب سے بڑا بیٹا جو ضرر اٹھائے بغیر خطرے سے نکل آتا ہے۔ اسے مغرب کے علاقے عطا ہوتے ہیں اور وہ خاور خدائی لقب پاتا ہے۔ دوسرا بیٹا تور جو جری ثابت ہوتا ہے، اسے توران عطا کر دیا جاتا ہے اور وہ توران شاہ کہلاتا ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا ایرج جو اتنا ہی دلیر ہے جتنا کہ خردمند ہے، اسے دشت گرداں اور ایران عطا ہوتے ہیں اور وہ ایران خدائی لقب پاتا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ تور کے توران شاہ بننے کی وجہ سے ترکوں کا آبائی وطن توران مشہور ہوا۔

امیر تیمور کے زمانے میں ایک بزرگ تھے جن کا نام ترکستان تھا۔ امیر تیمور چونکہ بزرگوں کا بہت قدر دان تھا، اس لئے اس نے ان کا ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروایا جو 'حضرت ترکستان' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی نام سے اس علاقے کا نام مشہور ہوا۔ تیموری دور میں ترکستان توران کے ملک کا ایک شہر تھا۔ رفتہ رفتہ انیسویں

صدی تک توران کی بیشتر سرزمین کا نام ترکستان مشہور ہوگیا۔ روس میں سوشلسٹ انقلاب کے وقت ترکستان متحارب خانگیوں میں بٹا ہوا تھا؛ لہٰذا مضبوط روسی حکمرانوں کے لئے اس پر قبضہ جمالینا کچھ دشوار نہ تھا؛ چنانچہ روس نے توران کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا اور اس کا نام روسی ترکستان پڑگیا۔ اسی طرح چین نے توران کے دوسرے حصے پر قبضہ کرلیا اور وہ چینی ترکستان کے نام سے مشہور ہوگیا۔

توران وہ مردم خیز خطہ ہے جس کی پُرشکوہ سرزمین سے ترک اسلام کا بازو بنے شمشیر زن بن کر اٹھے خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد اگر اللہ تعالیٰ ترکوں کو اسلام کی حفاظت کے لئے نہ کھڑا کردیتا تو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے ساتھ ہی تاریخِ اسلام کا شاندار باب ختم ہوجاتا۔ توران سے جہاں ایک طرف غزنوی، سلجوقی، غوری، خلجی، عثمانی اور تیموری حکمرانوں جیسے جہانگیر و جہاں دار حکمران اٹھے، وہاں اسی کی مقدس سرزمین سے امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث قاضی خان (تنجیوان) صاحبِ ہدایہ جیسے فقیہہ، شیخ شہاب الدین، سہروردی، خواجہ بختیار کاکیؒ اور خواجہ کمال خجندی جیسے مشہور زمانہ صوفیا اور علمائے دین بھی پیدا ہوئے۔ دسویں صدی عیسوی سے ترک مسلمانوں کا عروج شروع ہوا اور وہ توران سے نکل کر اردگرد کے ممالک فتح کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ چشمِ فلک نے وہ زمانہ بھی دیکھا کہ برما کی سرحدوں سے لے کر یورپ میں وی آنا (VIENNA) تک اور چین سے لے کر جنوبی ہند اور افریقیائی ممالک تک ہر ملک میں ترک سلاطین اور ترک خلفا کے ناموں کا خطبہ و سکہ رائج تھا۔ انہوں نے صدیوں تک اہلِ یوروپ اور کافر مغلوں (منگولوں) کے تباہ کن حملوں سے اسلامی دُنیا کا دفاع کیا، حتیٰ کہ اہلِ یورپ پر ثابت ہوگیا کہ وہ خشکی کی راہوں سے ایشیائی ممالک کا استحصال نہیں کرسکتیں۔ سلجوقیوں، غوریوں اور بالآخر عثمانیوں نے اہلِ یوروپ کے سامنے اپنی قوتِ بازو کی ایک ایسی مضبوط دیوار کھڑی کردی وہ مایوسی کے عالم میں خطرناک سمندری راہوں کے ذریعے ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارتی اور سیاسی تعلقات کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ ایشیائی اور افریقیائی ممالک پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے بعد ترک ہی سب سے زیادہ یوروپی اقوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔

جہاں تک برِصغیر ہند و پاکستان کا تعلق ہے۔ صحابۂ رسول کے مبارک قدم بمشکل بلوچستان تک پہنچ سکے تھے۔ بنوامیہ کے دور میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور راجہ داہر کو شکست دے کر کراچی اور ملتان کے درمیانی علاقے پر اس نے عربوں کی سیاسی برتری قائم کردی، لیکن بنوامیہ کی اندرونی رقابتوں کی وجہ سے محمد بن قاسم کو اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنا پڑا اور آخر کار اس کی موت جیل میں واقع ہوئی۔ عربوں کی پیش قدمی کا سلسلہ

رُک گیا۔ درحقیقت یہ ترک ہی تھے جو صوبہ سرحد کے دروں سے گزر کر ہندوستان میں آگے بڑھے اور انہوں نے چند صدیوں میں شرک اور بُت پرستی کے تمام مرکزی مقامات میں توحید کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

صدیوں تک مشرق و مغرب میں ترکوں کی عظمت کا طوطی بولتا رہا، مگر اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جبکہ یوروپی اقوام صنعتی اور سیاسی انقلابات کی بھٹیوں سے گزر کر مادی ترقی کی منزلیں جلد جلد طے کر رہی تھیں۔ ترک ہر جگہ داخلی انتشار اور بدنظمی کا شکار تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں سیاسی برتری حاصل کر لی۔ رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکمران گروہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر آخری تاجدارِ ہند کو تخت سے معزول کر کے تیموری ترکوں کی عظمت کا آخری چراغ گل کر دیا۔ اہلِ یوروپ کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر عثمانیوں نے خود ہی خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس سلسلے میں اسلامیانِ ہند نے تحریک چلائی، لیکن ان کی کوششیں کارگر نہ ہو سکیں اور ترکی یوروپ کی ایک تیسرے درجے کی لادین ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔

سوشلسٹ روس نے ترکوں کے داخلی انتشار اور بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر ترکستان میں پیش قدمی شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے روسیوں نے جبر و تشدد کے ذریعہ ترکوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ جن ترکوں نے اسلام ترک کر کے سوشلزم قبول کرنے سے کھلم کھلا انکار کیا، انہیں یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور یا پھر ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے ترکوں کو سیاسی اور معاشی طور پر تباہ کر کے اپنا غلام لینے پر ہی اکتفا کیا تھا، لیکن روس نے ترکستان میں ترکوں کو لسانی اور جغرافیائی طور پر چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور قومیتوں میں تقسیم کر کے ان کی قومی وحدت کے امکان ہی کو سرے سے ختم کر ڈالا۔ جب اس پر بھی روس کو اطمینان نہ ہوا تو اس نے سفید روس کی آبادی کو ترکستان کے وسیع علاقے میں منتقل کرنا شروع کر دیا تاکہ بتدریج ترکوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے۔ روسیوں نے امیر تیمور کے شاندار محل کو شفاخانہ اور مال گودام میں بدل دیا۔ امام بخاری کی مسجد میں سوشلسٹ روسیوں نے اپنے گھوڑے باندھے۔ پرتھ یونیورسٹی کے پروفیسر ویمبرے کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ترکستان پر روسی تسلط سے زیادہ کاری ضرب اسلام پر گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں کبھی نہیں لگی۔ چینیوں نے چینی ترکستان کا نام بدل کر سنکیانگ رکھ دیا ہے۔ انہوں نے بھی ترکوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو روسی ترکستان میں روس نے اختیار کیا تھا۔ غازی انور بیگ پاشا وہ آخری ترک جرنیل تھے جنہوں نے ترکستان کا دفاع کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ آج سات کروڑ سے زیادہ ترک روس کے سُرخ سامراج کے آہنی پھندے میں گرفتار ہیں۔ مگر آج ان میں اتنی سکت باقی نہیں کہ وہ اپنی آزادی کے لئے اندرونِ ملک سے کوئی

آواز بلند کر سکیں اور نہ ہی عالمی انسانی برادری کی طرف سے ان کی آزادی کے حق میں کوئی آواز اُٹھتی ہے۔

ترکوں اور مغلوں کی اصل اور ان کے قدیم ملک توران کا مختصر تعارف کرانے کے بعد اب برِصغیر میں ترکوں کی پیش قدمی اور ان کی مشہور سلطنتوں کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس تاریخی پس منظر میں ولایت پکھلی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جا سکے۔

٭

سلطان محمود غزنوی کے حملے

بنو عباس کے زوال کے ساتھ ساتھ ترکوں کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا تھا۔ ۹۳۳ء میں ترکوں نے پہلی بار غزنی کی آزاد ترکی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس ترکی اسلامی ریاست کا بانی سلطان محمود غزنوی کا والد امیر سبکتگین تھا جسے [illegible] کی امارت [illegible] ملی تھی۔ امیر سبکتگین ابتداءً ایک مملوک ترک تھا۔ دُنیا بھر میں یہ پہلی آزاد ترکی اسلامی ریاست تھی جو خلافت بنو عباس کی موجودگی میں قائم ہوئی اور ترکوں کے عروج کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ چونکہ سلطان محمود [illegible] ہونے میں کسی مورخ کو کوئی شبہ نہیں، اس لئے اس کے توارث کے تفصیلی حالات بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

غزنوی ترکوں کے عروج سے قبل کشمیر سے لمغانات (کابل، غزنی اور جلال آباد کا درمیانی علاقہ) تک کے [illegible] ہندو شاہیہ گندھارا کے پال حکمرانوں کی مضبوط سلطنت قائم تھی۔ صوبہ سرحد اور سلطنتِ ٹیکسلا کا وسیع علاقہ اسی سلطنت میں شامل تھا۔ پال خاندان کے حکمران نسلاً تاتاری تھے، لیکن ان کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے اس علاقے میں آباد تھے اور انہوں نے ہندی تہذیب کو اختیار کر لیا تھا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ کشتری بن گئے تھے۔ سنسکرت زبان میں پال کے معنی محافظ اور نگہبان کے ہیں؛ لہٰذا انہوں نے اپنے لئے اسی لقب کو استعمال کرنا مناسب خیال کیا۔ ہندو شاہیہ گندھارا کا دارالحکومت ہنڈ Ohind تھا جسے کچھ عرصہ بعد انہوں نے لاہور تحصیل صوابی میں منتقل کر دیا۔ عرب مصنفین ہنڈ کو اوہنڈ، لاہور تحصیل صوابی کو الہوار اور لدھا کو القندھار لکھتے رہے ہیں۔ ترک لاہور کو لہاؤور پکارتے تھے۔ بعض مورخین نے غلطی سے لاہور تحصیل صوابی کو لاہور پنجاب تصور کیا ہے، مگر سر اولف کیرو نے کافی حد تک اس مغالطے کو دُور کر دیا ہے۔

وادیٔ پشاور یعنی گندھارا کا علاقہ غزنوی حملوں سے قبل صدیوں سے بُدھ مت اور ہندو دھرم کا گہوارہ

---

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخِ اسلام، مرتبہ ولیم ایل لینگر، ترجمہ غلام رسول مہر، صفحہ ۹، جلد اوّل

رہ چکا تھا۔ پشاور بدھ مت کے کُشن علمبردار مہاراجہ کنشک کا دارالحکومت بھی رہ چکا تھا۔ کابل ترکی شاہیہ کے بُدھ حکمرانوں کا تقریباً دو سو برس تک دارالحکومت بنا رہا۔ قبل ازیں چار سدہ کو یونانیوں اور ساسانیوں کا مرکزی مقام بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہنڈ اور لاہور بدھ مت اور ہندو دھرم دونوں کے مرکزی مقامات رہ چکے تھے۔

البیرونی کو غزنوی دور کی تاریخ پر اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے غزنوی حملوں کے دوران میں پورے بارہ برس تک ہندوستان کی سیاحت کی اور پھر کتاب الہند لکھ کر اس دور کی ہندو تہذیب کے بارے میں اہم ترین معلومات جمع کر دیں۔ البیرونی کے بعد اس دور کی تاریخ پر عتبی کا درجہ ہے۔ ان دونوں کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں افغان اور پٹھان مشرف باسلام نہیں ہوتے تھے۔ البیرونی صاف صاف لکھتا ہے کہ غزنوی حملوں کے زمانے میں تمام سرحدی علاقے میں بسنے والے باشندے "وحشی جنگجو ہندو قبائل ہیں"۔

راجہ جے پال نے غزنی کی اٹھتی ہوئی ترکی اسلامی ریاست کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا؛ لہٰذا اسے اس کی ابتدا ہی میں کچل ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس غرض کے لئے راجہ جے پال نے ۹۷۳ء اور ۹۷۹ء میں غزنی پر چڑھائی کی، لیکن ترکوں نے امیر سبکتگین کی رہنمائی میں نہ صرف اپنی ریاست کا موثر دفاع کیا، بلکہ راجہ جے پال کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ متعصب ہندو اور انگریز مؤرخین نے سلطان محمود غزنوی کو تو جی بھر کے لالچی، متعصب اور ظالم قرار دیا ہے، لیکن راجہ جے پال کے جارحیت کے ارتکاب کو دیدہ دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے امیر سبکتگین کی وفات کے بعد عنانِ حکومت سنبھالی اور راجہ جے پال کو کچلنے کے لئے جہاد کا اعلان کر دیا۔

جب راجہ جے پال کو یقین ہو گیا کہ اس کی فوج غزنویوں کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتی تو اس نے ترکوں کا مقابلہ کرنے کی ایک نئی سیاسی چال چلی۔ اس زمانے میں افغانوں کا ایک مشہور سردار شیخ حمید تھا جو مذہباً قرامطہ تھا۔ قرامطی عقائد کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا اتنا ہی دشمن ہو سکتا تھا، جتنا کہ خود راجہ جے پال تھا۔ راجہ جے پال نے شیخ حمید کو بُلا کر اسے ملتان اور لمغان کے علاقے کی امارت سونپ دی۔ اس تدبیر کا مقصد ترک مسلمانوں کے مقابلے میں افغانوں اور پٹھانوں کی ایک مضبوط دیوار حائل کرنا تھا۔ راجہ جے پال اپنے مقصد میں کامیاب رہا، اور اُس نے ترکوں کے مقابلے میں افغانوں اور پٹھانوں کی ایک بڑی تعداد کی حمایت حاصل کر لی۔ اس تدبیر سے شیخ حمید افغانوں کا پہلا امیر مقرر ہوا۔ قبل ازیں افغان حکمرانی سے قطعاً ناآشنا تھے۔

البیرونی اور عتبی کے بیانات کے مطابق پہلے تو کوہِ سلیمان اور ہندوکش کے افغانوں سے سلطان محمود غزنوی

کو جنگ لڑنی پڑی اور پھر انہیں مطیع کرنے کے ساتھ ساتھ راجہ جے پال اور اس کے ان افغان حمایتیوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں پشاور کے نزدیک راجہ جے پال کو شکست فاش دی۔ تاوانِ جنگ ادا کرنے کے بعد اسے رہائی بخشی گئی، لیکن دوبار شکست کھانے کے بعد اُس نے سخت ندامت محسوس کی اور چتا میں جل کر مر گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے آنند پال نے گوالیار، کالنجر اور اجمیر کے راجاؤں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ افغانوں کی بڑی تعداد پہلے ہی اس کی حامی تھی۔ اس طرح ہندوؤں کا ایک جم غفیر ۱۰۰۲ء میں لاہور تحصیل صوابی کے سامنے حضرو کے میدان میں جمع ہو گیا۔ غزنوی فوج کے دائیں بازو کی کمان ارسلان جاذب کے پاس تھی، اور بائیں بازو کا کمانڈر عبداللہ طائی تھا۔ لڑائی کے آغاز میں سلطان محمود غزنوی نے چھ ہزار تیر اندازوں کو دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا، لیکن تیس ہزار برہنہ پا اور ننگے سر شمشیر زن کھوکھروں نے اس تندی کے ساتھ ترکوں کے قلب پر حملہ کر دیا کہ ترک فوج کی صفیں الٹتی دکھائی دینے لگیں، لیکن عین اس نازک مرحلے پر سلطان محمود نے قلب کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور ترک لشکر نے نعرۂ تکبیر کی گونج میں کفار پر زبردست حملہ کر دیا۔ آنند پال کی متحدہ فوج اس حملہ ترکانہ کی تاب نہ لا سکی اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ارسلان جاذب اور عبداللہ طائی دو دن تک کفار کا تعاقب کرتے رہے۔ سرحدی علاقے میں یہ فیصلہ کن جنگ تھی۔

شیخ حمید نے قرامطی عقائد سے توبہ کر کے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی، لیکن درپردہ اس کی تمامتر ہمدردیاں پال حکمرانوں کے ساتھ تھیں۔ شیخ حمید کے بعد اس کے پوتے ابوالفتح داؤد نے پھر وہی طریق الحاد اختیار کر لیا اور اسلامی عقیدے سے روگردانی کر لی۔ جب سلطان محمود غزنوی نے بھیرہ کی تسخیر کے بعد واپسی کا عزم کیا تو ابوالفتح داؤد نے غزنوی فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی؛ چنانچہ ۱۰۰۵ء میں سلطان محمود غزنوی نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ ابوالفتح داؤد نے ہتھیار ڈال دیئے اور قرامطی عقائد سے توبہ کر کے اسلامی قوانین جاری کرنے کا عہد کیا، لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر اپنے عہد سے پھر گیا۔ لہٰذا سلطان محمود غزنوی نے دوبارہ ملتان پر قبضہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ غور میں نظر بند کر دیا، وہیں قید کی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔ اس سلسلے میں تاریخ فرشتہ" اور بدایونی کے مندرجہ اقتباسات قابلِ غور ہیں:

"[1] راجہ جے پال نے سلطان محمود غزنوی کے حملوں کو روکنے کے لئے افغانوں کی مدد لی اور شیخ حمید نامی

---

[1] تاریخ ہند مصنفہ عبدالقادر بدایونی صفحہ ۲۰۰

افغان سردار کو لمغان اور ملتان کا بندوبست سپرد کیا۔ اس وقت سے افغان اقتدار اور حکمرانی کی طرف مائل ہوئے۔"

"[1] سلطان محمود غزنوی نے راجہ جے پال اور دوسرے اسیروں کو باج و خراج قبول کر کے رہائی بخشی اور بہت سے افغان رئیسوں کو تہ تیغ کیا اور بعضوں کو چاکروں میں منسلک فرما کر معاودت کی۔"

"[2] شیخ حمید کا پوتا ابوالفتح داؤد بن نصیر بن شیخ حمید جو کہ ملاحدہ میں سے تھا۔ ابتدا میں اپنے باپ دادا کی سنت پر عمل کر کے اپنے آپ کو سلطان کے ملازمین میں شمار کرتا تھا۔ . . . . . انفسی میں مروی ہے کہ جب ابوالفتح داؤد سلطان محمود غزنوی کی آمد کی خبر سن کر سراسیمہ ہوا اور آنند پال کو سلطان کے ارادے سے خبردار کیا اور اس سے کمک چاہی اور اس نے اس کی مدد پر ہمت باندھی، لاہور سے پشاور روانہ ہوا اور اپنے امیروں کی ایک جماعت بھیج کر سلطان کی سدِ راہ کی۔ سلطان محمود یہ ماجرا دیکھ کر غضب ناک ہوا اور لشکر کو آنند پال کی جنگ اور اس کے لشکر کی پامالی کا حکم دیا۔ . . . . . اور ابوالفتح داؤد نے جب دیکھا کہ مقدم ملوک ہند کو کیا پیش آیا تو ناچار مقاومت کی صلاح نہ دیکھی قلعہ بند ہوا اور عجز و زاری کا دروازہ مفتوح کر کے متعہد ہوا کہ میں ہر سال بیس ہزار درم سرخ بلا عذر داخل کروں گا اور احکام شرعی جاری کر کے مذہب الحاد سے احتراز کروں گا۔"

"[3] سلطان محمود غزنی دوبارہ غزنی سے ملتان آیا اور اسے جبر و قہر سے مفتوح کیا اور بہت سے قرامطہ اور ملاحدہ کو تہ تیغ کر کے دارالبوار پہنچایا اور بتوں کے ہاتھ اور پاؤں قطع کئے اور داؤد بن نصیر کو زندہ گرفتار کر کے اپنے ہمراہ غزنی لے گیا اور غور کے قلعے میں نظر بند کر دیا، یہاں تک کہ وہ اس میں ہلاک ہوا۔"

اس سلسلے میں مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی فرماتے ہیں:

"[4] جے پال نے حمید لودھی کو ملتان پر قابض ہونے اور قریشی خاندان کا خاتمہ کرنے میں مدد پہنچائی اور اس طرح سبکتگین کے لئے قرامطہ کی مسلم کش طاقت کی ہمت افزائی کر کے خود سبکتگین کی رعایا میں سے مضبوط سرحدی قبائل کو حریف بنا کر کھڑا کر دیا۔"

---

[1] تاریخ فرشتہ اردو طبع اول نول کشور صفحہ ۳۶

[2] تاریخ فرشتہ اردو، طبع اول نول کشور صفحہ ۳۷

[3] تاریخ بدایونی صفحہ ۱۹۹

[4] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۸۰ طبع سوم

مندرجہ بالا مشہور کتبِ تاریخ کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی دور میں سرحدی اور پنجابی باشندے اوّل اوّل مشرف باسلام ہونا شروع ہوئے تھے۔ طبقاتِ ناصری (راورٹی انگلش صفحہ ۴۷ ایڈیشن) انسائیکلوپیڈیا تاریخِ اسلام (I, 51) کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوہِ سلیمان کے علاقے میں بھی سلطان محمود غزنوی کو کافر افغان باشندوں سے جنگ کرنی پڑی تھی۔ ان واقعات سے ان حضرات کی غلطی واضح ہو سکتی ہے جو افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری کو قابلِ اعتماد سمجھ کر یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ قیس بن عبدالرشید کی اولادِ افغان باشندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دور سے افغانستان کے علاقے میں تبلیغِ اسلام یا جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھے۔

بہرحال یہ بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے تمام مسلمان بلکہ غیر مسلم باشندوں کو بھی اپنی افواج میں شامل ہونے کا موقع دیا۔ چنانچہ اس کی افواج میں نہ صرف افغان بلکہ آوان، گکھڑ اور راجپوت سبھی شامل تھے۔ غزنی میں جہاں ایک طرف پانچ وقت کی آذانوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، وہاں ہندوؤں کے سنکھ بجنے کی آوازیں بھی بلند ہوا کرتی تھیں۔ سلطان محمود غزنوی نے ابتدائی طور پر سیوک پال المعروف نواسہ شاہ اور تلک نامی ایک ہندو ہی کو اپنی ہندی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا تھا، لیکن ان کی غداری ثابت ہو جانے کے بعد اس نے اپنے غلام ایاز کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ غزنوی فوج میں دس ہزار ہندو سپاہی شامل تھے۔ ان ہندو سپاہیوں کی اکثریت افغانستان، سرحد، اعوان کاری اور علاقہ گکھڑ سے ہی بھرتی کی گئی تھی۔

کشمیر کا راجہ سنگرام بسا اوقات آنند پال کے بیٹے تری لوچن پال اور اس کے بھائی بھیم پال کی مدد کرتا رہتا تھا۔ کشمیر اس زمانے میں سرحد اور پنجاب کے بھگوڑے ہندوؤں کی پناہ گاہ بن چکا تھا، اس لئے غزنوی فوجوں نے سلطان محمود اور سلطان مسعود کے زمانے میں تین بار کشمیر پر چڑھائی کی، لیکن کشمیر کے مشہور قلعے موہر کوٹ اور لوہر کوٹ اور ہندانہ شدید برفباری کی وجہ سے فتح نہ ہو سکے۔ ایک بار غزنوی فوج ہزارہ قدیم کے علاقے میں راستہ بھول گئی اور اسے شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ غزنوی دور میں پہلی بار ولایتِ پکھلی میں اسلام کا تعارف ہوا، لیکن ترک اس زمانے میں اس علاقے پر قبضہ نہ جما سکے۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح گزر گئے۔ نندکوٹ اور موہر کوٹ نام کے مواضعات اب بھی مری کے قریب موجود ہیں۔

غزنوی حملوں کے ساتھ ہندوستان میں نامور علمائے دین اور صوفیائے کرام بغرضِ تبلیغ تشریف لائے جن میں سے حضرت علی الہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ زیادہ مشہور

ہیں۔ امام اسمٰعیل بخاریؒ کے ایک ہی وعظ سے لاہور میں ایک ہزار ہندو مشرف باسلام ہوئے۔ لاہور تحصیل صوابی کی اہمیت ختم ہوگئی اور لاہور پنجاب اسلامی تہذیب کا گہوارہ بن گیا۔ ہندی فتوحات کی وجہ سے عباسی خلیفہ نے سلطان محمود غزنوی کو "یمین الدولہ غازی سلطان محمود غزنوی" کا لقب عطا فرمایا۔

سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملے کے زمانے میں بالائی ہزارہ کشمیر کے زیر اثر تھا اور زیریں ہزارہ پر راجہ جے پال کی حکمرانی قائم تھی۔ کشمیر میں شنکر ورمن Shankaravarman ترکی شاہیہ کا آخری بدھ حکمران تھا جس سے ۱۰۲۱ء میں ہندو شاہیہ کے برہمن لالیا نے اقتدار چھین لیا تھا۔ اس طرح سلطنت ٹیکسلا کے علاقے کے علاوہ ولایت پکھلی اور ولایت کشمیر کا علاقہ ہندو شاہیہ گندھارا کے حکمرانوں کے ماتحت ہوگیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی اور مہاراجہ انند پال کے درمیان فیصلہ کن جنگ ولایت پکھلی کے آخری سرے پر یعنی حضرو کے میدان میں لڑی گئی، اس لئے اسی وقت سے ولایت پکھلی میں اسلام متعارف ہونا شروع ہوا جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے، اس زمانے میں بالائی ہزارہ کشمیر کے تابع تھا۔ موجودہ مری کا علاقہ بھی کشمیر ہی کے تابع تھا اور کشمیر کی سرحد یہیں سے شروع ہو جاتی تھی۔ موہر کوٹ اور نندکوٹ کے مشہور قلعے ولایت پکھلی کے اسی حصے میں واقع تھے۔ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں مجھے ولایت پکھلی کے اہم حصوں کی سیاحت کرنا پڑی۔ اسی سیاحت کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ موہر کوٹ اور نندکوٹ کے سرحدی قلعے اسی علاقے میں تعمیر کئے گئے تھے۔ مری سے چند میل کے فاصلے پر پنجاب کی سمت میں اب بھی انہی ناموں سے موہر کوٹ اور نندکوٹ کے مواضعات آباد ہیں۔ ان مواضعات کے محل وقوع کو ملاحظہ کر کے معلوم کیا جا سکے کہ وادی کشمیر کو جانے والے قدیم راستے کو کنٹرول کرنے کے لئے یہ مقامات نہایت موزوں تھے۔ کشمیری حکمرانوں نے ان قلعوں کی حفاظت کا ایسا معقول انتظام کر رکھا تھا کہ سلطان محمود غزنوی اور سلطان مسعود غزنوی کی افواج ان کا محاصرہ کرنے کے باوجود ان سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

سلطان محمود غزنوی نے افغانستان کے رہنے والے ان باشندوں میں سے کچھ افراد کو سرحد اور پنجاب کے بعض علاقوں میں آباد کر دیا جو اس وقت اسلام لا چکے تھے۔ وفادار افغان، آوان اور دوسری اقوام کو فوجی مناصب اور جاگیریں عطا کی گئیں۔

سلطان محمد غوری کے حملے

غزنوی دور میں سوری ترکوں نے غور کے علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی اور ان کی طرف سے اسی ریاست کا ایک امیر شنسب نامی حکمرانی کرنے لگا تھا۔ امیر شنسب غوری ترکوں کا مورث اعلیٰ تھا۔ جہاں سوز معز الدین اور شہاب الدین اسی کی اولاد تھے۔ دسویں صدی تک غوری ملحد تھے، حالانکہ ان ارد گرد بسنے والے غزنوی، سلجوقی اور قراخانی ترک مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ غزنوی فوجوں میں ملازمت کرنے کی وجہ سے غوریوں کو جنگ اور حکمرانی کا تجربہ ہو چکا تھا۔ غزنویوں کے زوال کے بعد غوریوں کے اقتدار کا دور شروع ہوا۔ سلطان محمد غوری نے کم و بیش چھ بار ہندوستان پر فوج کشی کی، لیکن ۱۱۹۲ء کی ترائن کی لڑائی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ کے ساتھ ہندوستان کے ایک سو پچاس راجاؤں اور رانوں کی تین لاکھ اسپ سوار، تین ہزار ہاتھی سوار اور بے شمار پیادہ سپاہ کو شکست دے کر ہندو راجاؤں کی کمر توڑ دی۔ راجپوت پرتھوی راج جیسے تجربہ کار جرنیل کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مردانہ وار لڑے۔ کھوکھروں نے غزنوی دور کی طرح اس بار بھی بہادری کے جوہر دکھائے اور دوپہر تک یہی دکھائی دے رہا تھا کہ گزشتہ سال کی طرح اس بار پھر غوری فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ جب محمد غوری نے دیکھا کہ راجپوت کسی طرح بھی اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹا رہے تو اس نے اپنی فوج کو ایک فوجی چال کے تحت چند فرلانگ پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ غوری فوج کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر ہندوؤں نے یہ سمجھا کہ غوری فوج پسپا ہو رہی ہے، لہٰذا وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر غوری فوج پر بے تحاشا حملے کرنے لگے۔ پانچ ہزار برہنہ پا اور ننگے سر کھوکھروں نے تلواروں اور نیزوں سے ترکوں کے قلب پر دیوانہ وار حملہ کر دیا۔ عین اس وقت غوری نے بارہ ہزار ریزرو اسپ سوار فوج کو دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ راجپوت اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر میدانِ جنگ میں ان کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔

پرتھوی راج میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ لیکن سرسوتی کے مقام پر غوری سواروں نے اسے جالیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کا بھائی کھانڈے رائے میدانِ جنگ ہی میں قتل ہو چکا تھا۔ اس لڑائی نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں حکمرانی کا منصب صدیوں تک کے لئے ترک مسلمانوں کے پاس چلا گیا ہے۔

۱۲۰۶ء میں جبکہ سلطان محمد غوری لاہور سے غزنی واپس ہو رہا تھا تو جہلم کے مقام پر چند کھوکھروں نے دھوکے سے اسے عین اس حالت میں شہید کر دیا، جبکہ وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ فرشتہ نے غلطی سے کھوکھر کو گکھڑ لکھ دیا ہے۔ قدیم مؤرخین میں سے بعض مؤرخ کھوکھر، گکھڑ، کھٹڑ، اور کاکڑ کے ہندی الاصل الفاظ میں تمیز نہیں کر سکے جس کی وجہ سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔

چونکہ سلطان محمد غوری کی اپنی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لئے وہ اپنے مملوک ترکوں ہی کو اپنے بیٹے کہا کرتا تھا۔ سلطان محمد غوری نے ان مملوک ترکوں میں سے اکثر کو توران کے علاقے سے خریدا تھا اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر انہیں سلطنت کے اہم ترین مناصب پر فائز کر دیا تھا۔ ان مملوک ترک سرداروں نے ہندوستان میں شاندار فوجی کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ سلطان محمد غوری نے اپنے انہی ترک سرداروں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ ان مملوک سرداروں میں سلطان قطب الدین ایبک، یلدوز، قباچہ اور بختیار خلجی اہم ترین عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان محمد غوری کی شہادت کے بعد ترک سرداروں نے باہمی مشاورت سے سلطان کی وصیت کے مطابق سلطان قطب الدین ایبک کو اپنا حکمران منتخب کر لیا اور اس طرح خاندانِ غلامان کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔

موضع مانک رائے کی صورتِ دیہی کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سلطان محمد غوری کے حملوں کے زمانے میں ہزارہ اور پکھلی کے علاقوں میں سربن سنگھ، نتھا سنگھ اور مان سنگھ نامی تین راجے حکمرانی کر رہے تھے۔ ان میں سربن سنگھ زیادہ بہادر اور قوی راجہ تھا۔ سربن سنگھ نے مانکرائے سے چل کر مارگلہ کے مقام پر غوری فوج پر حملہ کر دیا، لیکن سلطان کی فوج نے شکست دی اور وہ لڑائی میں مارا گیا۔ غوری فوج کا قبل ازیں اس علاقے میں پیش قدمی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن اس واقعہ کے بعد سلطان محمد غوری کا ایک جرنیل اصالت خان غوری فوج کو لے کر ہزارہ اور پکھلی کے علاقے پر حملہ آور ہوا۔ اس زمانے میں مانکرائے ہی اس علاقے کا مرکزی مقام تھا۔ مٹھا رام اور مربند رام اس قصبے کی معروف شخصیتیں تھیں۔ غوری فوج نے انہیں اس علاقے سے باہر نکال کر اپنا قصبہ جما لیا۔ بعد ازیں اصالت خان آگے بڑھا اور پکھلی خاص کے علاقے میں مان سنگھ

نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن مان سنگھ کو بھی شکست ہوئی؛ چنانچہ اصالت خان کی رہنمائی میں پہلی بار اس علاقے میں اسلام کو مکمل طور پر غلبہ حاصل ہوا۔

سلطان محمد غوری کی شہادت کے بعد حالات میں عظیم تغیر رونما ہوا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے اپنی تمام تر توجہ دہلی کی طرف مبذول کر دی اور پھر اس کے جانشینوں نے بھی بنگال اور جنوبی ہند کی سمت میں اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر کشمیری حکمرانوں نے ولایت پکھلی کے بالائی حصے پر اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ سلطنتِ دہلی کے زمانے میں یہی صورتِ حال قائم رہی۔

ترکوں کے مشہور شاہی خاندان

غزنوی خاندان:

اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ امیر سبکتگین[1] تھا جو کہ ایک مملوک ترک تھا اور جسے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے الپتگین نے غزنی کی امارت سونپ دی تھی۔ امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا لائق بیٹا سلطان محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔ غزنی کی ریاست درحقیقت پہلی آزاد ترکی اسلامی ریاست تھی جو خلافتِ بنو عباس کی موجودگی میں قائم ہوئی۔ اس خاندان کے کل پندرہ حکمران گزرے ہیں جنہوں نے غزنی اور لاہور کے دارالحکومتوں سے ۳۸۲ھ تا ۵۸۲ھ بمطابق ۹۶۰ء تا ۱۱۵۰ء تک افغانستان اور شمالی ہند پر حکمرانی کی۔ اس طرح ان کی حکمرانی کا کل عرصہ تقریباً ایک سو نوے سال بنتا ہے۔ غزنوی حملوں کی بدولت ہندوستان میں ان کے پیشروں کے لئے ہندی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ غزنوی دور سے قبل اسلام کا تعارف بمشکل بلوچستان اور سندھ کے علاقے تک ہو سکا تھا۔ غزنویوں کے زمانے میں افغانستان، سرحد اور پنجاب کے تمام علاقوں میں ترکوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ لاہور اسلامی تہذیب کا نمونہ بن گیا۔ افغانستان اور پنجاب کے باشندے جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

اگرچہ غزنوی افواج نے ہزارہ قدیم کے علاقے سے گزر کر کشمیر کے مشہور پہاڑی قلعوں (نندنہ، موہر کوٹ، اور نند کوٹ) پر چڑھائی کی، مگر غزنویوں کے پیشِ نظر ولایتِ پکھلی یا کشمیر پر اپنا اقتدار قائم کرنا نہ تھا، بلکہ وہ دراصل ان بھگوڑے ہندو راجاؤں کی گوشمالی کرنا چاہتے تھے جو سرحدِ پنجاب کے علاقے سے بھاگ کر ان قلعوں میں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ اسلام ولیم ایل لینگر، ترجمہ غلام رسول مہر، جلد اوّل صفحہ ۸۳

قلعہ بند ہو جاتے تھے۔ راجہ آنند پال کے ساتھ غزنوی افواج کی فیصلہ کن جنگ بھی ولایت پکھلی کے آخری سرے (حضرو) پر لڑی گئی تھی، اس لئے ابتدائی طور پر اسی زمانے میں یہاں اسلام متعارف ہوا۔ امیر سبکتگین، سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی اس خاندان کے مشہور حکمران تھے۔ ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کی حملوں کی اس قدر دھاک بیٹھ چکی تھی کہ ہندوستان بھر کے راجے اور مہاراجے اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اب تک افغان، آوان، گکھڑ اور پختون اقوام کے مورخ بڑے فخر سے یہ بیان کرتے چلے آتے ہیں کہ ان کے بزرگ غزنوی دور میں مشرف باسلام ہو کر غزنوی افواج میں بھرتی ہوتے تھے اور سلطان محمود غزنوی نے ان کی اعلیٰ خدمات کی بدولت انہیں جاگیریں اور مناصب عطا کئے تھے۔

غوری خاندان:

یہ وہ ترک[1] تھے جو غزنوی دور سے بہت پہلے علاقہ غور میں آباد چلے آرہے تھے۔ ابتدائی زمانے میں غوری سوری ترکوں کے تحت تھے۔ سوری ترکوں ہی نے غوریوں کے مورث اعلیٰ شنسب کو علاقہ غور کی امارت عطا کی تھی۔ غزنوی دور کے غلبے کے زمانے میں غوری مشرف باسلام ہوتے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے غزنوی افواج میں شمولیت اختیار کی اور اس طرح انہیں ترکستان سے لے کر ہندوستان تک ہر علاقے میں جنگ لڑنے کا تجربہ حاصل ہو گیا۔ غزنوی دور سے پہلے علاقہ غور کے ارد گرد کے رہنے والے غزنوی، قراخانی اور سلجوقی ترک اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن غوری غزنویوں کے غلبے تک بدستور ملحد رہے۔ اسلام قبول کرنے اور غزنوی افواج میں لڑائی کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد غوریوں کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ غزنوی اور سلجوقی ترکوں کے بعد افغانستان اور شمالی ہندوستان میں ان کے جانشین بن گئے۔ جہانسوز، معز الدین اور شہاب الدین اس خاندان کے مشہور حکمران تھے۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے ۵۸۲ھ تا ۶۰۲ھ یعنی ۱۱۸۱ء تا ۱۲۰۶ء تک افغانستان اور شمالی ہند کے اکثر علاقوں پر حکمرانی کی۔ غوری افواج میں بھی افغانستان اور پنجاب کے باشندوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ ترائن کے معرکے میں افغان اور پنجابی باشندے دونوں اطراف سے لڑ رہے تھے۔

---

[1] آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، سمتھ صفحہ ۲۷۳، ۱۵۲، میڈیول انڈیا، ایشوری پرشاد صفحہ ۲۰۰، ترکستان ڈاؤن ٹو منگول انویژن صفحہ ۳۳۸

غوریوں کے اثرات پنجاب سے آگے بڑھ کر دہلی تک جا پہنچے۔ چونکہ سلطان محمد غوری کی اپنی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس لئے وہ اپنے ترک غلاموں ہی کو اپنے بیٹے پکارتا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک، یلدوز، قباچہ اور بختیار خلجی اسکے مشہور ترک غلام تھے جنہوں نے اس شہادت کے بعد باہمی مشورت سے سلطان قطب الدین ایبک کو اپنا حکمران منتخب کرلیا اور اس طرح ہندوستان میں خاندانِ غلاماں کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔

کچھ لوگ غوری ترکوں کو صرف اس لئے افغان سمجھنے لگے ہیں کہ وہ موجودہ افغانستان کے علاقے غور میں آباد تھے، حالانکہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اس زمانے میں افغانستان نام کا کوئی ملک تھا ہی نہیں۔ یہ ایک ایسا غلط مفروضہ ہے جس کی تردید پرانی معتبر کتبِ تاریخ کے علاوہ سر اولف کیرو (دی پٹھان صفحہ ۱۲۲) نے کر دی ہے۔ سر اولف لکھتا ہے:

[1]

> The Ghorids who under Muizzuddin Mohammad Ghori conquerred northern India for Islam in A.D 1192 are by some, including Afghan biographers, believed to have been Turks."

غوری سلطنت کی تمام کلیدی آسامیاں ترکوں ہی کے پاس تھیں اور اس کی وصیت کے مطابق وہی اس کے جانشین بنے۔ بعض مصنفین نے افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے غوریوں کو بنی اسرائیل قرار دیا ہے، لیکن اس روایت کو بیشتر مورخین، جن میں سید جمال الدین افغانی بلکہ موجودہ افغان حکومت بھی شامل ہیں، رد کر چکے ہیں، ان کے دلائل کا خلاصہ اسی کتاب میں ترین قوم کے عنوان کے تحت درج کر دیا گیا ہے۔

غزنویوں کے زوال کے زمانے میں ہندو راجپوت راجے اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ انہوں نے شمالی ہند پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ ان راجاؤں نے اسی پرتھوی راج کے پرتلے جمع ہو کر ترائن کے میدان میں غوری افواج کا منہ پھیر دیا تھا لیکن سلطان محمد غوری نے ہمت نہ ہاری اور دوسرے سال پرتھوی راج کو شکست فاش دے کر ہندوؤں کے اقتدار کے سارے امکانات ختم کر دیئے

---

[1] کیرو — دی پٹھان صفحہ ۱۱۷، ۱۲۲

اسی زمانے میں حضرت معین الدین چشتی اجمیرؒ کے راجپوتوں کے مرکزی مقام میں تبلیغ اسلام کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ولایت پکھلی میں بھی غوریوں کا اقتدار قائم ہوگیا، لیکن اس کے بعد خاندانِ غلاماں کے حکمرانوں نے اس علاقے کی طرف کوئی توجہ نہ دی جس کی بنا پر بالائی ہزارہ کا تمام علاقہ ایک بار پھر کشمیر کے ماتحت ہوگیا۔

خاندان غلاماں:

اس خاندان کے ترک حکمرانوں کی حکمرانی کا آغاز سلطان محمد غوری کی شہادت کے بعد ہوا، جیسا کہ سطورِ بالا میں لکھا جا چکا ہے۔ اس خاندان کے بانیوں نے سلطان محمد غوری کے زمانے میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ سلطان نے مملوک ترکوں میں سے چن چن کر باصلاحیت افراد کو اپنی افواج میں اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے، چونکہ اس کی اپنی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی، اس لئے وہ انہی مملوک ترک سرداروں کو اپنے بیٹے کہا کرتا تھا اور اس کی شہادت کے بعد وہی اس کے وارث بنے۔ سلطان قطب الدین ایبک، التمش اور بلبن خاندانِ غلاماں کے مشہور حکمران تھے۔ خلجی اور تغلق بھی انہی میں سے تھے۔ تاریخ ہند میں اس خاندان کی حکومت ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی کے نام سے مشہور ہوئی۔ سلطان قطب الدین ایبک اس ترکی سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے اپنی ہندی فتوحات کی یادگار کے طور پر دہلی میں قطب مینار تعمیر کروایا تھا۔ سلطنتِ دہلی کے زمانے میں دہلی کو پہلی بار ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا مرکزی مقام بننے کا شرف حاصل ہوا۔ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ترکوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن قرار دے کر دہلی کے دارالحکومت سے اس پر حکمرانی کا آغاز کیا تھا۔ قبل ازیں غزنوی اور غوری ادوار میں دہلی یا لاہور کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ ۶۰۲ھ سے ۶۸۹ھ یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۱ء تک خاندانِ غلاماں کے حکمران بڑی کامیابی کے ساتھ شمالی ہند پر حکومت کرتے رہے۔ اس دور میں ہندوستان کے باشندوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب پہلے کی طرح ترک ہندوستان میں فتوحات حاصل کرنے کے بعد واپس غزنی یا توران نہیں جا رہے۔ بلکہ اب انہوں نے اسی ملک کو اپنا وطن بنا کر اس کی دولت اسی پر خرچ کرنی شروع کر دی ہے۔ اس سلطنت کے ترکوں کا سب سے بڑا کارنامہ کافر مغولوں کے حملوں سے ہندوستان کا دفاع کرنا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ منگولیا کے مغولوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا اور ان کے عساکر سمندر کی طوفانی لہروں کی طرح وسط ایشیا سے نکل کر ساری مہذب دنیا کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ہندوستان پر ان مغولوں نے کل بارہ بار چڑھائی کی، لیکن سلطنتِ دہلی کے قابل حکمرانوں نے ہر بار بڑی پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ

کیا۔ سلطان بلبن اور سلطان علاؤ الدین نے مغل عساکر کو بار بار شکست دے کر ملک سے باہر نکال دیا۔ انہی مغلوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سلطان محمد المعروف سلطان شہید نے جام شہادت نوش کیا تھا اور پیچھے ہٹتے وقت مغل حضرت امیر خسرو کو قیدی بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ اتفاق سے منگولیا کے ان جفاکش اور بے رحم باشندوں و چنگیز خان نے اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا اور پھر توران کو فتح کر کے اس نے اپنی تمام افواج کو الوس و اویماق مغول کے نام سے منظم کر لیا۔ اب دنیا بھر میں ان چنگیزی مغولوں کے مقابلہ کی ہمت کسی ملک و قوم میں نہ تھی۔ چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کے زمانے تک یہ مغول اسلام کے جانی دشمن بنے رہے۔ انہوں نے بغداد، سمرقند اور بخارا جیسے گنجان آباد شہروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ خود چنگیز خان خوارزم شاہ کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے سندھ کے کنارے تک آن پہنچا تھا، لیکن سلطنت دہلی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھا اور سوات میں سردیوں کا موسم گزارنے کے بعد واپس توران چلا گیا۔

اس زمانے میں بالائی ہزارہ کشمیر کے تابع رہا اور ہزارہ زیریں آئینی طور پر سلطنت دہلی سے منسلک رہا۔

خلجی خاندان:

اس خاندان کے حکمران ترکوں کے مشہور قبیلہ خلج سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے وہ خلجی مشہور ہوئے۔ ترکی زبان میں ترکی تلوار کو خلج کہتے ہیں اور یہی لفظ خلج اس قبیلہ کی وجہ تسمیہ بنا۔ مشہور رُوسی مستشرق بارتھولڈ لکھتا ہے کہ ترکوں کا خلجی قبیلہ اوغوزی ترکوں کے چوبیس قبیلوں میں سے ایک مشہور قبیلہ ہے۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے اور کتاب المسالک استخری نے بھی خلجیوں کو ترکوں کا ایک قبیلہ قرار دیا ہے، مگر کچھ لوگوں نے لفظ خلجی کو غلزئی تصور کر کے سخت غلطی کھائی ہے اور اس طرح خلجیوں کو غلزئی افغان بیان کر دیا ہے۔ افغان مورخین کی اس مشہور روایت کے مطابق جسے مخزن افغانی کے مصنف سے لے کر سراولف کیرو تک تمام افغان مورخ بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ غلزئی افغان مسماۃ متوبی بی دختر تبان افغان کی اولاد میں سے ہیں۔ باپ کی طرف سے وہ شاہ حسین غوری کی اولاد ہیں جو غریب الوطنی کی

لہ انسائیکلوپیڈیا تاریخ اسلام، ولیم لینگر، ترجمہ غلام رسول مہر جلد اول صفحہ ۸۳۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۱۵۲، ہسٹری آف میڈیول انڈیا از ایشوری پرشاد صفحہ ۲۰۸، ۲۱۲، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۹۱

حالت میں شیخ بتان کے پاس رہائش پذیر ہو گیا تھا اور پھر بعد میں شیخ نے اپنی بیٹی متوبی بی اس سے بیاہ دی تھی۔ روایت یہ ہے کہ مسماۃ متوبی بی کے پہلے بیٹے کا نام شیخ بتان نے "غل زئے" یعنی چور کا بیٹا رکھا تھا، چنانچہ مسماۃ متوبی بی کے اسی بیٹے کی اولاد غلزئی مشہور ہوئی۔ شاہ حسین غوری افغانوں میں آباد ہو گیا اور اس کی اولاد افغان مشہور ہوئی۔ شیخ بتان نے مسماۃ متوبی بی کے دوسرے (جائز) بیٹے کا نام "لوئے دے" رکھا جو بڑا ہو کر لودھی مشہور ہوا اور اس کی اولاد بھی لودھی کہلائی۔ اس روایت کے مطابق لودھی افغان اسی "لوئے دی" کی اولاد ہیں۔

مسٹر اولف کیرو نے لفظ خلج اور غلزئی کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ترکی اور عربی لغات کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے وہ لفظ خلج کا مادہ دریافت نہ کر سکا۔ عربی زبان میں خرلخ اور خلج کے الفاظ نہ تو خلجیوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور نہ ہی غلزئیوں کے لئے بلکہ جیسا کہ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ نے بیان کر دیا ہے۔ عرب مصنفین ترکوں کے مشہور قبیلہ قرلق کو خرلخ یا خلج پکارتے تھے۔ ترکوں کا قرلق قبیلہ اموی اور عباسی دور میں بلادِ اسلامیہ کا قریب ترین ہمسایہ قبیلہ تھا اور عباسی حکمران بسا اوقات اسی قبیلے سے فوجی امداد حاصل کیا کرتے تھے۔ ترکوں میں اسی قرلق قبیلہ نے اسلام لانے میں پہل کی تھی۔ فرشتہ، برنی، طبقاتِ اکبری، طبقاتِ ناصری اور تاریخ فیروز شاہی نے بھی خلجیوں کو ترکوں کا قبیلہ خلج قرار دیا ہے؛ لہٰذا مندرجہ بالا مورخین کے بیانات اور تحقیقات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

خلجی ترکوں نے ۱۲۹۰ء سے ۱۳۳۱ء تک شمالی ہند پر حکمرانی کی، ان کا دارالحکومت دہلی تھا اور ان کی فتوحات کا سلسلہ بنگال اور جنوبی ہند تک پہنچ گیا تھا۔ جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی اس خاندان کے مشہور حکمران تھے۔ انہوں نے کافر مغلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں سخت سزائیں دینے کے بعد ملک سے باہر نکال دیا۔ ان کے دور میں ملک میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ حضرت امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیاء اور قاضی علاء الملک اس دور کی مشہور علمی شخصیتیں تھیں۔

تغلق خاندان:

ترکی زبان میں تغلق کے معنی علمبردار ہیں۔ اس زمانے کی لڑائیوں میں علمبرداری کا جلیل القدر عہدہ فوج کے اعلیٰ سپہ سالاروں کو دیا جاتا تھا۔ چونکہ ترکوں کے اس خاندان کے جدِ امجد تغلق یعنی علمبردار تھے!

لہٰذا وہ اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ دہلی کے اس شاہی خاندان کی حکمرانی کا کُل عرصہ تقریباً ۹۲ سال بنتا ہے۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق اس خاندان کے مشہور حکمران تھے۔ تغلق حکمران ۱۳۲۰ء سے ۱۳۹۰ء تک بڑے استقلال کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ دکن اور بنگال تک کے دور دراز علاقوں تک پہنچا تھا، لیکن آخری تغلق حکمرانوں کے زمانے میں ملک خانہ جنگی کا شکار ہوگیا۔ راجپوت اور لودھی سردار بھی اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ جس رُخ کھوکھر پنجاب میں سر اٹھا چکا تھا اور ایسا دکھائی دینے لگا تھا کہ سلطنتِ دہلی ہندوؤں کی طاقت کا چیلنج قبول کرنے سے عاجز ہو رہی ہے۔ ان حالات میں توران سے پیش قدمی کرتے ہوئے امیر تیمور نے تین اطراف سے نوّے ہزار ہزار جات کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ تیموری حملے کے بعد اس فیروز شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور اقتدار لودھیوں کو منتقل ہوگیا۔ لودھیوں کے اقتدار میں آنے سے کچھ عرصہ قبل خضر خان کا خاندان بھی برسرِ اقتدار رہا۔

خاندانِ مغلیہ:

ترکوں کے اس مشہور تیموری خاندان کا بانی ظہیر الدین بابر تھا۔ بابر کا والد ترکستان کی مشہور ریاست فرغانہ کا حکمران تھا۔ باپ کی طرف سے بابر امیر تیمور کی اولاد تھا اور والدہ کی طرف سے وہ چنگیز خان سے نسبی تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا شجرہ نسب یہ ہے: بابر ابن عمر شیخ مرزا ابن ابوسعید سلطان ابن سلطان محمد ابن میراں شاہ ابن امیر تیمور کورگان۔ بابر کا یہ شجرہ نسب توزکِ بابری، اکبر نامہ، ہمایوں نامہ، شاہجہان نامہ، توزک جہانگیری اور دیگر تمام معتبر کتبِ تاریخ میں درج کیا ہوا ہے؛ لہٰذا بابر کے ترک النسل ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں۔ امیر تیمور اور چنگیز خان کا شجرہ نسب تومنائی خان پر جاکر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر تیموری مغل نہیں، بلکہ ترک تھے تو انہیں اس ملک میں مغل کیوں پکارا جاتا ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امیر تیمور کی پیدائش سے تقریباً ستر سال پہلے چنگیز خان نے منگولیا کے عوام پر اقتدار حاصل کرکے سرکاری اصطلاح کے طور پر اپنے عساکر کا مغول تجویز کیا تھا۔ ترک اور مغل کے عنوان کے تحت چنگیز خان کی اس سرکاری اصطلاح کا مفصل تذکرہ کر دیا گیا ہے جسے وہاں دیکھ لینا مفید ثابت ہوگا۔ چنگیز خان کے مغول میں تمام تاتاری قبائل شامل تھے۔ ان کی اُردوئے الترن (سنہری فوج) دنیا بھر کی ممتاز فوج تھی۔ ستر سال کے عرصے میں چنگیز خان اور آلِ چنگیز خان نے دُنیا بھر میں اپنی طاقت اور سطوت کا سکہ جما دیا تھا۔ لفظ مغل

بہادری، جفاکشی اور اولوالعزمی کا نشان بن گیا تھا۔ چنگیزی مغولوں نے اس دور کی مہذب دنیا کے کم و بیش چالیس لاکھ انسانوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ انہوں نے بغداد اور بخارا جیسے اسلامی مراکز کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ انہوں نے کوریا سے آرمینیا تک اور تبت سے دریائے قبیل تک ہر ملک میں دہشت کی فضا قائم کر دی تھی۔ حالت یہ تھی کہ شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہر فاتح کے لئے لفظ مغل کا استعمال ہونے لگا، لوگ حملہ آور فوجوں کو دیکھتے ہی "مغولان آمدند" "مغولاں آمدند" کا غلغلہ بلند کر دیتے۔ ظہیر الدین بابر اپنی توزک میں اصل مغولوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود جب اس نے ہندوستان فتح کیا تو لوگوں نے اسے مغل ہی پکارنا شروع کر دیا۔ یہ وہ نام تھا جسے سنتے ہی بڑے بڑے بہادروں کا زہرہ آب ہو جاتا تھا۔

[1] ولیم ارسکن لفظ مغل کے اسی غلط استعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان منگولوں یا مغلوں نے اپنے زوالِ حکومت کے بعد دنیا میں کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا اور ہندوستان میں ترک ایرانی قبائل کے سامنے ان کی خدمات قابلِ ذکر نہیں، لیکن اس کے باوجود لفظ مغل ہر اس فاتح جواں بخت اور مرد شمشیر زن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس نے شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کی سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جس حکومت کی بنیاد چغتائی ترکوں نے ڈالی۔ ہم آج اس سلسلہ بابری کو بھی سلطنتِ مغلیہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

حد یہ ہے کہ توزکِ بابری بھی سلطنتِ مغلیہ کا بانی منگولوں یا مغلوں سے حد درجہ نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان کی زبان، لباس اور بود و باش کے طریقوں پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے، لیکن ہندوستان میں لوگوں نے بابر کو مغل ہی پکارا اور اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہوئی۔

سلطنتِ مغلیہ ہندوستان میں تیموری ترکوں کی سب سے زیادہ شاندار اور باوقار سلطنت تھی، اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں اس کی سرحدیں برما میں تناسرین سے دکن تک کشمیر سے بدخشاں تک اور بدخشاں سے جنوبی ہند کے آخری حصے تک وسیع تھیں۔ اس سلطنت کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں ظہیر الدین بابر نے رکھی، اور ۱۸۵۷ء میں آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر کو تخت سے معزول کر کے انگریزوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ نصیر الدین

---

[1] ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد، ولیم ارسکن، اردو ترجمہ حسین انور صفحہ ۵۴

ہمایوں، جلال الدین اکبر، نور الدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہان، محی الدین اورنگزیب اس سلطنت کے مشہور زمانہ فرماں روا تھے۔

یہاں ہم نے ترکوں کے صرف ان خاندانوں کا مختصر تعارف کرایا ہے جو برِ صغیر ہند و پاکستان پر مختلف ناموں کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ دیگر ایشیائی، افریقی اور یورپی ممالک کے ترک شاہی خاندانوں کا تعارف کرانے کے لئے ایک مستقل مضمون بلکہ ایک کتاب درکار ہے، مگر مجموعی طور پر ترکوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جب تک توران کی سرزمین میں زندگی بسر کرتے رہے۔ انہیں زیادہ شہرت اور عظمت حاصل نہ ہوسکی۔ لیکن جوں ہی انہوں نے توران سے نکل کر بیرونی دنیا کے کسی ملک میں قدم رکھا، ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔ سر ڈینسن راس Denison Ross نے ترکوں کو اسی عظمت کے بارے میں مشہور ترک حکمران افراسیاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ترک کی مثال توران کی سرزمین میں اس موتی کی طرح ہے جو سمندر کی تہ میں صدف کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے، لیکن جب اسے سمندر سے باہر نکالا جاتا ہے تو وہ بادشاہوں کے تاج اور دلہن کے کان کی زینت بن جاتا ہے۔ ترکوں کی اسی کیفیت کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں بیان فرمایا تھا ؎

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
مہتاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے

ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

٭

خطِ تاریخ

(پکھلی)

۵۷۰ء		ولادت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
۷۱۲ء	ترکی شاہیہ کابل	محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ
۷۴۰ء		ولایت پکھلی پر کشمیریوں کا حملہ
۹۳۳ء	ہندو شاہیہ گندھارا لاہور تحصیل صوابی	غزنی کی ترکی اسلامی ریاست کا قیام
۱۰۰۱ء	غزنوی دور	سلطان محمود غزنوی کا حملہ
۱۱۹۲ء	ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی	سلطان محمد غوری کا حملہ
۱۳۹۸ء		امیر تیمور کا حملہ اور ولایت پکھلی میں قرلق ترکوں کی آبادکاری۔
۱۴۷۲ء	ولایت پکھلی پر ترکوں کی حکمرانی	تنولیوں کی آمد
۱۴۹۵ء		شہاب الدین بابر کی آمد
۱۵۲۱ء		ظہیر الدین بابر کا ہزارہ قارلق پر قبضہ
۱۵۵۰ء		میرزا حیدر ترک کا پکھلی پر حملہ
۱۵۵۴ء		غازی چک کا حملہ

۱۵۸۹ء		پکھلی کا سلطنتِ مغلیہ سے الحاق
۱۵۹۰ء	ولایتِ پکھلی پر ترکوں کی حکمرانی	نصیر الدین حسین خان والیٔ پکھلی کی بغاوت
۱۶۴۰ء		سلطان شادمان خان والیٔ پکھلی کی منصبداری
۱۶۶۶-۶۷ء		قلعہ چھپا بخل پر یوسف زئیوں کا غلبہ
۱۶۷۴-۷۵ء		میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم
۱۷۰۳ء		ترکوں کی خانہ جنگی
۱۷۱۳ء		قلعہ گل باغ پر سید جلال بابا کے سواتی لشکر کا قبضہ
۱۷۵۰ء	درانیوں کا غلبہ	احمد شاہ ابدالی کا ولایتِ پکھلی پر قبضہ
۱۸۱۸ء		سکھوں کا ولایتِ پکھلی پر قبضہ
۱۸۳۳ء		سید احمد بریلوی کی شہادت
۱۸۴۵-۴۸ء		لنڈی مسلمانی
۱۸۴۸-۴۹ء		انگریزوں کا ولایتِ پکھلی پر قبضہ
۱۹۴۷ء		قیامِ پاکستان

ترکی فتوحات کے اسباب

گزشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ برِصغیر ہند و پاکستان پر ترک مسلمانوں کے حملوں کا آغاز کی ابتدا میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا اور ان حملوں کا سلسلہ سولہویں صدی تک جاری رہا۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر حکمران نے کچھ نہ کچھ علاقہ ضرور فتح کیا اور تعجب یہ ہے کہ ماسوائے ترائن کی پہلی لڑائی کے ترک مسلمانوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ تاریخِ ہند کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ترکی فتوحات کے چند اسباب یہ تھے:

۱۔ ترک ایک ترقی یافتہ اسلامی تہذیب کے علمبردار تھے جو بقول علامہ اقبال مرحوم سامی باپ اور آریائی ماں سے پیدا ہوئی تھی۔ اس تہذیب کی بنیاد قرآن و سنت پر اٹھائی گئی تھی اور اس میں عجمی تہذیبوں کے وہ تمام عناصر شامل تھے جو شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے مباحات کی قبیل سے تھے اور جو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے انسانیت کے لئے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ اس طرح اسلامی تہذیب میں بہترین انسانی تجربات اور مشاہدات کا ماحصل وحیِ الٰہی کا تابع بنا کر سمو دیا گیا تھا۔ توحید، رسالت اور معاد کے اسلامی عقائد میں عقلِ سلیم کے لئے پرکشش اپیل موجود تھی۔ حلال و حرام کے حدود، دیوانی و فوجداری قوانین اور اسلامی معاشرہ کے معاشرتی انصاف کے عملی مظاہرے نے ہندی باشندوں کو زندگی کی صراطِ مستقیم دکھا دی تھی۔ محمود و ایاز کے ایک ہی صف میں کھڑے ہو جانے کا منظر چھوت چھات اور ذات پات کے مارے ہوئے انسانوں کے لئے بہت دلفریب اور نرالا تھا۔ اسلامی تہذیب کی انہی خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کے عام باشندوں کی ہمدردیاں بہت جلد فاتحین کے ساتھ ہو گئیں۔ بعض اوقات ہندو سپاہی ترک سپاہ میں شامل ہو کر ہندو راجاؤں کے خلاف لڑتے رہے۔

ترکوں نے تمام لڑائیاں جہاد کے جذبے کے تحت لڑیں۔ ان کا مقصد محض سیاسی غلبہ حاصل کرکے معاشی مفادات حاصل کرنا ہی نہ تھا، بلکہ وہ شرک و بُت پرستی کے تمام مراکز میں اسلام کو غالب کرنا چاہتے تھے۔ اگر جنگ کا مقصد غلبۂ اسلام نہ ہوتا تو علماء دنیوی لڑائیوں کو کبھی جہاد فی سبیل اللہ قرار نہ دیتے۔ ترک حکمرانوں کے شاہی القابات میں لفظ "دین" کا استعمال اسی حقیقت کی نشان دہی کرتا تھا۔ شہاب الدین، جلال الدین، نصیر الدین، نور الدین، ظہیر الدین اور محی الدین وغیرہ جیسے تمام شاہی القابات ثابت کرتے ہیں کہ ترکوں کے عہد میں دینِ اسلام کی اہمیت کیا تھی۔ ترکوں کی مسلمان افواج جذبہ جہاد سے لڑتی تھیں، لیکن ان کے دشمنوں کے دلوں میں نہ تو جذبۂ جہاد تھا اور نہ ہی انہیں مکمل عوامی تائید حاصل تھی۔

۲۔ ترکوں کی فتوحات کا دوسرا بڑا سبب ان کی گھڑسواری اور برق رفتاری تھی۔ راجپوت تلوار کے دھنی تھے۔ لیکن ترک دنیا بھر کے مانے ہوئے شاہسوار تھے۔ نیزہ بازی ان کا پیدائشی فن تھا۔ شمشیر زن راجپوتوں نے ہر لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھائے، لیکن وہ کسی صورت ترک شاہسواروں کے حملۂ ترکانہ کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ پشاور، حضرو، ترائن اور پانی پت جیسی تمام لڑائیوں میں ترکوں کی آخری فتح ہمیشہ گھڑسوار فوج کے حملے سے ہوئی۔ ترکی افواج کی شیطم اوان کا طریق جنگ بھی ہندی افواج سے بہتر تھا۔ ترکی طلغمہ Turkish Tulughma دشمن کی بڑی تعداد کو پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔

۳۔ ترکوں کی فتوحات کا تیسرا سبب یہ تھا کہ وہ توران کی پُرشکوہ اور آب و ہوا میں پلے ہوئے مردانِ کوہستانی تھے۔ ان میں بہادری، جفاکشی اور اولوالعزمی کی تمام صفات موجود تھیں۔ ان کی خوراک میں گوشت کا بڑا عنصر موجود تھا۔ ان کے مقابلے میں وادیٔ سندھ، پنجاب اور وادیٔ گنگا کے میدانی علاقوں کے پلے ہوئے دال خور سپاہی تھے۔ ان ہندو سپاہیوں کے خون میں وہ گرمیٔ رفتار نہ تھی جو ترک خون میں موجود تھی۔

ہندو مؤرخین نے ترکی فتوحات کا ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان ایک متحدہ ملک نہ تھا اور اس کے حکمران اکثر باہمی عداوتوں اور انتشار میں مبتلا رہتے تھے: لہٰذا وہ کبھی متحد ہو کر بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں نہ آسکے، لیکن یہ دلیل تاریخی حقائق کی روشنی میں بے وزن ثابت ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تمام عالمِ اسلام یا پورا توران متحد ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہو گیا ہو، بلکہ ہمیشہ ہوا یہ ہے کہ توران کی سرزمین سے کوئی ایک حکمران اٹھا اور اس نے چند ہزار سپاہی لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تقریباً ہر لڑائی میں مسلمان افواج کی تعداد ہندو افواج سے کم تھی۔ ترک افواج کی سپلائی لائن بہت لمبی ہوا کرتی تھی۔ انہیں رسد

بہم پہنچانے اور سپاہیوں کی کمی کو پورا کرنے کے بڑے مشکل مسائل درپیش ہوا کرتے تھے۔ وہ مقامی باشندوں کی زبان بھی نہیں جانتے تھے اور انہیں ہمیشہ اپنے وطن سے بہت دُور دشمن کی اجنبی سرزمین پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ترک ہندوستان کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں سے ناآشنا تھے۔ اس زمانے میں ایسے اجنبی ماحول میں جنگ کرنا ایک قلیل التعداد فوج کے لئے آسان نہ تھا، جنگ جیتنے کے لئے جس مضبوط جسم، پختہ کردار اور بلند ذہن کی ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ ہندو سپاہی کے مقابلے میں ترک سپاہی میں بدرجہ اتم موجود تھا اور یہی صفات اس کی فتح کا اصل سبب تھیں۔

اسلامی تہذیب کا غلبہ

آج تاریخ کے طلباء کو یہ مطالعہ کر کے حیرت ہوتی ہے کہ ترک مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی سرزمین توران سے زمانۂ قبل از اسلام میں متعدد قومیں اٹھیں۔ ان اقوام نے صدیوں تک برِصغیر کے اہم حصوں، بالخصوص شمالی ہند پر بھی حکمرانی کی، لیکن بالآخر ہندی تہذیب میں ایسی مدغم ہوئیں کہ ان کی اپنی قدیم تہذیب یکسر ختم ہوگئی اور ان کا الگ وجود تک بھی باقی نہ رہا۔ غالب اقوام نے ہندو دھرم یا بُدھ مت قبول کر لیا اور عموماً وہ کھشتری ذات میں داخل ہوگئیں جو محکوم اقوام فاتحین کے ہمراہ ہندوستان وارد ہوئی تھیں، انہیں کمتر ذاتوں میں جذب کر لیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی آمد سے قبل یہاں بسنے والے تمام قبیلوں اور اقوام کو مؤرخین نے ہندی الاصل باشندے بیان کیا ہے، حالانکہ نسلی طور پر ان کی اکثریت تورانی یا ایرانی تھی، مگر ترک مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں اسلامی تہذیب کو ایسا غلبہ حاصل ہوا کہ سکھوں اور انگریزوں کی غلامی کے ادوار گزارنے کے بعد بھی افغانستان اور پاکستان کے علاقوں میں اب بھی اسلامی تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اور یہیں سے احیائے دین کی تحریکیں بار بار اٹھتی رہی ہیں۔ یہاں اسلامی تہذیب کو مندرجہ ذیل صورتوں میں غلبہ حاصل ہوا۔

اشاعتِ اسلام:

غزنوی دَور میں حضرت علی الہجویریؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ اور امام اسمٰعیل بخاری جیسے بزرگ علماء و صوفیا سرزمینِ ہند میں بغرضِ تبلیغ تشریف فرما ہوئے۔ ان کے بعد مسلسل علماء و صوفیاء کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت سید علی ترمذی المعروف

پیر بابا اور سید علی ہمدانی جیسے بزرگ وقفے وقفے کے بعد تشریف فرما ہوتے رہے۔ جہاں ترک فاتحین ایک ہی طرف اپنی تلوار کے زور سے علاقوں پر علاقے فتح کرتے جاتے تھے، وہاں جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کے ذریعے علماء و صوفیاء ذہن اور من کی دُنیا کو مسخر کرتے چلے جاتے تھے۔ لاہور اور دہلی کو اسلامی تہذیب کا نمونہ بنا دیا گیا۔ ملک بھر میں مساجد، مدارس، اور خانقاہوں کا جال بچھا دیا گیا۔ بعض اوقات یہ تینوں ادارے ایک ہی مقام پر تعمیر کر لئے جاتے تھے۔ ان میں عبادت، تبلیغ و تدریس اور تزکیۂ نفس کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وضو، طہارت اور عبادت کے اسلامی طریقے ہندوستان کے باشندوں کے لئے بالکل نئے اور نرالے تھے۔ بچے کی تعلیم کی ابتدا رسم بسم اللہ خوانی سے اور بچی کی تعلیم کی ابتدا رسم زرفشانی سے کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم کی درس گاہ کا نام مکتب اور اعلیٰ تعلیم کی درس گاہ کا نام مدرسہ تھا۔ فنی اور تکنیکی تعلیم کے لئے الگ ادارے موجود ہوتے تھے، جن کو کارخانے کا نام دیا گیا تھا۔ طلباء کے قیام و طعام کا انتظام مفت کیا جاتا تھا۔ حکمران اور صاحبِ ثروت حضرات ان تعلیمی اداروں کو جاگیریں، عطیات اور وظیفے عطا کرتے تھے۔ قرآن خوانی، حدیث، فقہ اور تفسیر جیسے علوم اعلیٰ مدارس کے نصاب کے اہم مضامین ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ درس نظامی کو مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ مدرسہ کے ساتھ ہی دارالافتاء بھی ہوا کرتا تھا جو عدالتوں کی رہنمائی کے لئے فتوے جاری کیا کرتا تھا۔ مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم اگرچہ لازمی تھی، لیکن ملک کی علمی اور دفتری زبان فارسی تھی۔ علماء نے انتھک محنت سے قدیم علوم کے تراجم فارسی زبان میں کر دیئے تھے۔

قانون:

ترکوں کے عہد میں فقہ حنفی ہی کو ملکی اور شخصی قانون کا درجہ حاصل رہا۔ مدارس میں زیادہ تر اسی قانون کو شاملِ نصاب کیا گیا اور مسلمانوں کی عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے دیا کرتی تھیں۔ ہر قابلِ ذکر شہر میں مفتی اور قاضی موجود ہوتے تھے اور وہ شرعی قانون کے مطابق دیوانی اور فوجداری مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ ملک میں عام طور پر قانون کی بالادستی قائم تھی۔ بادشاہ اور والیانِ ریاست بسا اوقات خود بھی مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اسی طرح شرعی قانون حکمرانوں کی مطلق العنانیت پر پابندی عائد کر دیتا تھا اور لوگوں کے حقوق محفوظ ہو جاتے تھے۔ اکبر بادشاہ اور علاؤالدین خلجی نے شرعی قانون کی پابندی سے انحراف کیا۔ لیکن بالآخر فتح شرعی قانون ہی کو حاصل ہوئی۔ مساجد میں مسلمان حکمرانوں کے نام کا خطبہ رائج کیا جاتا تھا اور ملک میں انہی کے

نام کا سکہ جاری ہوا کرتا تھا۔

چونکہ ملک کے دفاع کی ذمہ داری غیر مسلموں پر نہیں عائد ہوتی تھی، اس لئے انہیں ملک کے مالی اخراجات میں حصہ دار بنانے کے لئے جزیہ ادا کرنے کا پابند کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے مقدمات کے فیصلے ان کے اپنے قوانین اور رسومات کے مطابق ان کی اپنی پنچائتیں کیا کرتی تھیں۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ قانون کے نفاذ کے لئے ہر شہر میں قاضی، کوتوال، دیوانِ ریاست، شہنائے منڈی، تحصیل دار، تھانیدار، قانون گو اور دیگر اہلمد اور اہل کار موجود ہوا کرتے تھے۔ شاہی منصب دار قانون کے نفاذ کے ذمہ دار ہوا کرتے تھے۔ عورتوں، غلاموں اور ذمیوں کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو از روئے شریعت ان کے لئے مقرر ہوا کرتے تھے۔ ذمیوں میں سے باصلاحیت افراد کو ریاست کی اہم اسامیوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔ ایسی کوئی مثال نہیں کہ ہندوؤں کو جبر کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ دہلی جیسے اسلامی دارالحکومت میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال تک ہندو اکثریت میں ہوتے۔ صرف امیر تیمور کی ایک ایسی مثال ہے کہ اُس نے اِس شہر میں ہندو اکثریت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن دہلی میں شیخ کٹھو کی عالمانہ بحث سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے قتلِ عام کا فیصلہ بدل دیا۔

چند صدیوں میں شرک و بُت پرستی کے تمام اہم مراکز میں توحید کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ وادیٔ کابل، وادیٔ پشاور، وادیٔ سندھ کے تمام علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت وجود میں آگئی۔ وہ ہندو علما جو اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کر رہے تھے۔ ان کے اذہان بھی شعوری طور پر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے کلام سے اسلامی تعلیمات کا اظہار شروع کر دیا۔ بھگتی تحریک کے بڑے بڑے رہنما جن میں بھگت کبیر، سائیں تلسی داس، اور گورو نانک جیسے حضرات بھی شامل ہیں، توحید کے اسلامی تصور سے اتنے متاثر ہوئے کہ بعض اوقات ان کا کلام رومیؒ، سعدیؒ، عطارؒ اور غزالیؒ کا ترجمہ دکھائی دیتا ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی زندگی میں ایک عظیم سماجی انقلاب رونما ہونے لگتا تھا۔ دال خور، گوشت خور بن جاتے، ستی کی رسم ادا کرنے والے بیوہ کی شادی پر آمادہ ہو جاتے، بُت پرستی کرنے والے خدا پرست بن جاتے، ننگے پاؤں پھرنے والے جوتا پہننے لگتے، چھوت چھات کرنے والے ہر ذات کے مسلمان کے ساتھ عبادات اور مجالس میں یکجا ہو جاتے اور ترک دنیا کے معتقد لوگ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر مردِ میدان بن جاتے۔ ہندی باشندوں کی زندگی میں یہ انقلاب تلوار کے زور سے نہیں، بلکہ وحیِ الٰہی کی تعلیمات کے زور سے رونما ہوا۔

صاحبقران امیر تیمور کورگان کا حملہ

امیر تیمور ترکوں کے اس شاہی خاندان کا مورثِ اعلیٰ ہے جس نے ظہیر الدین بابر سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً تین سو برس تک مسلسل ہندوستان پر حکمرانی کی۔ یہ خاندان دنیا میں خاندانِ مغلیہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب جیسے عظیم حکمران پیدا ہوئے۔ اس خاندان کی سلطنت میں تمام برِ صغیر جس میں افغانستان، پاکستان اور ہندوستان تینوں ممالک شامل تھے۔ ایک متحدہ ملک کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اس طرح تاریخ میں پہلی اور شاید آخری بار برِ صغیر ایک ہی مرکزی حکومت کے تحت وجود میں آیا تھا، اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کے حالات ذرا تفصیل سے بیان کر دیئے جائیں جس نے دنیا میں یہ تاریخی کارنامہ سرانجام دیا۔ ولایتِ پکھلی کے ترک سلاطین بھی تیموریوں ہی کی ایک شاخ تھے؛ لہذا ہمارے مرکزی موضوع کے لحاظ سے بھی امیر تیمور کی شخصیت، اس کے خاندان اور اس کے حملے کے حالات اور نتائج سے باخبر ہونا ضروری ہے۔

جن مؤرخین کو قدیم ترک قبائل کی تاریخ پر سند کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں جرجانی، رشید الدین، نظام الدین شمسی اور اُغور مصنفین کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ شمالی چین کے سیاح اور سفراء کی یادداشتیں بھی قدیم ترکوں کے حالات معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ دسویں صدی کے بعد کا زمانہ ترک مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ہے، اس لئے اس کے بعد کی تاریخ زیادہ روشن ہے۔ کتب تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں ترک قوم کے پانچ قبیلے تھے، جن کے نام یہ ہیں۔ قیرغیز، کیماک، تفزغز، قپچاق اور قرلق KARLUKE قرلق ترکی زبان میں ان ترکوں کو کہتے ہیں جو اصلاً برفستانی علاقے کے باشندے ہوں، اُنہی قرلقوں میں اوغوز خان جیسا عظیم ترک حکمران پیدا ہوا تھا جس کے

نام پر اس کی اولاد اوغوزی کہلائی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اوغوزی قبائل کی تعداد چوبیس تک پہنچ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ محمود کاشغری نے قرلق اور ابتدائی اوغوزی قبیلہ کو ایک ہی قبیلہ شمار کیا ہے۔ امیر تیمور کا شجرہ نسب اسی اوغوز خان تک پہنچتا ہے۔ پھر اسی اوغوز خان Oghuz Khan کی اولاد میں ایلخان جیسا نامور بہادر پیدا ہوا۔ امیر تیمور خود فخر سے کہا کرتا تھا کہ "ما از دودِ خانۂ ایلخانیم" پھر ایلخان کے خاندان میں اس کی اولاد میں ایرادچی برلاس پیدا ہوا جو امیر تیمور کا ساتواں دادا تھا، اس کے نام پر اس کی اولاد برلاس مشہور ہوئی۔ امیر تیمور برلاس قبیلہ کی مشہور شاخ قراوکین میں پیدا ہوا تھا جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے قراوکین مشہور ہوئی تھی۔ ترکی زبان میں قراوکین خوبصورت کو کہتے ہیں۔ امیر تیمور کا شجرہ نسب یہ ہے:

امیر تیمور بن امیر طراغائی بن الینگیر بہادر بن ایجل نویان بہادر بن قراچار نویان بہادر بن سوغو چچین بن ایرادچی برلاس بن قاچولی بہادر بن تومنائی خان بن یایسنفر خان بن قائدو خان، بن دوتبین خان، بن بوقاقان، بن بوزنجر بن الانقوا، بن ساجوتھ بہادر بن یلدوز خان، بن منگلی خان بن تیمور تاش، بن ایلخان، بن تنگیز خان، بن منگلی خان، بن یلدوز خان، بن آیی خان، بن کن خان بن اوغوز خان بن قراخان خان، بن مغل خان، بن النجہ خان ثانی، بن کیوک خان، بن دیپ باقوی بن النجہ اول بن ترک بن یافث بن نوح علیہ السلام۔

یہ شجرہ نسب نظام الدین شمسی، الغ بیگ مرزا، اکبر نامہ اور دیگر متعدد کتبِ تاریخ میں محفوظ ہے۔ مغولی اور ترکی زبانوں کے لب ولہجہ اور تلفظ کے فرق کی وجہ سے بعض ناموں کے ہجوں میں کچھ نہ کچھ فرق پیدا ہوتا رہا ہے۔ مختلف شجروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان اور امیر تیمور کا شجرہ نسب تومنائی خان پر جاکر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ ظفر نامہ تیموری، روضۃ الصفا اور اکبر نامہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ تومنائی خان کے دو بیٹے تھے ایک کا نام قبل خان اور دوسرے کا نام قاچولی بہادر تھا۔ حکمرانی کا منصب قبل خان کی اولاد میں رہا اور وزارت کا منصب قاچولی بہادر کی اولاد کے پاس رہا۔ اندازہ یہ ہے کہ امیر تیمور کا والد امیر برکل اس خاندان میں پہلی بار مشرف باسلام ہوا تھا۔ چنگیزی خاندان میں ہلاکو کے پوتے غازان کے عہد سے اسلام قبول کیا جانے لگا۔

اگرچہ امیر تیمور کے آباؤ اجداد عظیم المرتبت امراء تھے لیکن حکمرانی کا منصب جو

کے پاس تھا۔ امیر تیمور کے دور میں اس حکمران خاندان کا مشہور حاکم سلطان حسین تھا جس نے امیر تیمور کو اپنی بیٹی بیاہ دی تھی، اسی وجہ سے امیر تیمور کورگان مشہور ہوا۔ ترکی زبان میں کورگان داماد کو کہتے ہیں۔ ترک اور مغل کے عنوان کے تحت تاریخی حوالہ جات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ چنگیز خان نسلاً ترک تھا، منگول نہ تھا، اس کے آباؤ اجداد شمال کی طرف ہجرت کر کے منگولیا میں آباد ہوتے تھے۔ چنگیز خان نے لفظ مغول کو سرکاری اصطلاح کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا، اسی نسبت سے یہ لفظ مشہور ہوا تھا۔ یہ چنگیزی مغولوں کے رعب اور دبدبے کا اثر تھا کہ شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہر حملہ آور کی فوج کو دیکھ کر ہر طرف "مغولاں آمدند" کا غلغلہ بلند ہو جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اب تک تیموری ترکوں کی آخری سلطنت کو سلطنتِ مغلیہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

امیر تیمور سمرقند کے قریب کیکش کے قصبہ میں پیدا ہوا، اس زمانے میں سمرقند، صوغد، فرغانہ اور بخارا کے علاقوں میں قرلق ترکوں کی اکثریت آباد تھی۔ اوغوزی ترکوں کی کئی شاخیں وجود میں آ چکی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے بسا اوقات لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ ۱۳۶۹ء میں ترک خوانین کی ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی جس میں مولانا زین الدین کی تجویز پر امیر تیمور کو امیر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد سے تا دم تک تیمور اپنے آپ کو امیر ہی کہلواتا رہا۔ مشاورت کے اختتام پر امیر تیمور کے مرشد سید برکہ نے دعا مانگی۔ تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور دنیا کی تسخیر کا عزم کیا۔ تیمور کا قول تھا کہ یہ "یہ مسکون ایک بڑے شہزادے کے عزائم کے سامنے کیا چیز ہے، جیسا کہ خدا ایک ہے، اسی طرح بادشاہ بھی ایک ہونا چاہیے۔" امیر تیمور کے سرخ جھنڈے پر اس کا اپنا نشان ⁂ تھا اور اس پر ترکی زبان میں لکھا تھا "قوت بستی" یعنی انصاف طاقت ہے، یہ تین اطراف یعنی جنوب مغرب اور شمال کو گھیرے ہوتے تھا۔ دوسرے حکمرانوں یا شہنشاہوں کے طریقے کے برعکس وہ اپنے سرکاری مراسلوں کی ابتدا یوں کرتا تھا "من تنکری قلی تیمور" یعنی میں خدا کا بندہ تیمور۔ اس سے تیمور کے ذہن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک لڑائی میں اس کا ایک پاؤں زخمی ہو گیا تھا، اس لئے مغربی مصنفین نے اسے تیمور لنگ پکارنا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اگر اتنی خوبیوں والا فاتح یورپ میں پیدا ہوتا تو مغربی مصنفین خدا جانے اسے کن کن القابات سے نوازتے۔ دنیا بھر کے بائیس ممالک اور چوالیس قومیں امیر تیمور کے ماتحت تھیں۔

⁂

تیموری حملے کے اسباب:

۱۳۹۸ء میں تیموری حملے سے قبل ہندوستان کے سیاسی حالات بڑے ابتر تھے۔ ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی رُو بہ زوال تھی۔ فیروز شاہ اس سلطنت کا آخری مضبوط حکمران تھا۔ ۱۳۸۶ء میں اس کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت انتشار کا شکار ہوگئی۔ فیروز شاہ کے وزیر خانِ جہاں نے جو تلنگانہ کا ایک نومسلم تھا، باغیانہ روش اختیار کرلی۔ ۱۳۹۴ء سے ۱۳۹۷ء تک فیروز شاہ کے نوجوان پوتے محمود تغلق اور اس کے ایک رشتہ دار نصرت شاہ کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی جاری رہی۔ افغان سردار بھی اقتدار کے خواہش مند تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنا طاقت ور نہ تھا کہ وہ ہندو راجاؤں کے چیلنج کا سامنا کر سکتا۔ مسلمان رؤسا کی اسی کشمکش اور اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ہندو راجے ایک بار پھر اپنی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ پنجاب میں راجہ جسرتھ کھوکھر اتنا سرکش ہوگیا تھا کہ تمام مسلمان امرا اس سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔

امیر تیمور دراصل چین پر فوج کشی کی تیاریوں میں مصروف تھا، لیکن ہندوستان کے ان مخدوش حالات نے اس کی توجہ ادھر مبذول کردی۔ امیر تیمور کا خیال یہ تھا کہ دہلی جیسے اہم شہر میں مسلمان اقلیت کا ہندو اکثریت کے اندر گھرا رہنا نہ صرف ان مسلمانوں کے لئے بلکہ خود اس کی سلطنت کے دفاع کے لئے بھی تشویشناک تھا۔ اس وقت ہندوستان پر حملہ نہ کرنا ہندوؤں کے غلبے کو نئے سرے سے دعوت دے دینے کے مترادف تھا؛ لہٰذا امیر تیمور نے چین پر چڑھائی کرنے کے منصوبے کو وقتی طور پر ترک کر کے ۱۳۹۸ء میں تین اطراف سے ہندوستان پر حملہ کردیا۔ اس حملے میں نوّے ہزار جات اس کی افواج میں شامل تھے۔

حالات:

تیموری حملے سے قبل اس کا پوتا سلطان محمد کابل کا حکمران تھا اور اس کے اثرات پکھلی تک موجود تھے، جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔ سلطان محمد نے پکھلی ہی میں حضرت سید علی ہمدانی کا اس وقت استقبال کیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی، جبکہ وہ کشمیر کے دورۂ تبلیغ سے واپس

لوٹ کر افغانستان کو سفر کر رہے تھے۔ امیر تیمور نے شہزادہ پیر محمد جہانگیر کو تیس ہزار سپاہ کا کمانڈر بنا کر دستو راست کی کمان اس کے سپرد کی اور اسے ہرات کی راہ سے ملتان پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ملتان میں ہندو اور افغان سرداروں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی۔ امیر تیمور نے اپنی فوج کے دوسرے حصے کو جو تیس ہزار سپاہ پر مشتمل تھا۔ امیرزادہ سلطان محمد کی کمان میں دیا اور اسے دست چپ کا کمانڈر بنا کر کوہ کشمیر کے دامن یعنی ولایت پکھلی سے گزر کر لاہور پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور خود ملتان کی فتح کی خوشخبری سننے کے بعد چوبیس ستمبر ۱۳۹۸ء کو درۂ خیبر کی راہ سے ہندوستان کی طرف آگے بڑھا، اُس نے دھنکوٹ کے مقام پر جو کالا باغ کے قریب ہے۔ دریائے سندھ کو عبور کیا۔ تیموری افواج پل کو پلہ پر ایک دوسرے سے مل گئیں۔ بارہ دسمبر ۱۳۹۸ء کو امیر تیمور دہلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت ایک لاکھ ہندو اسیرانِ جنگ اس کے قبضے میں تھے۔ راجہ جسرتھ کھوکھر نے تلنبا اور دیپالپور کے درمیانی علاقے میں تیموری افواج سے مقابلہ کیا، مگر بُری طرح شکست کھانے کے بعد بھاگ کر اپنے باپ شیخا کھوکھر کے پاس چلا گیا۔ تیموری حملے کے بھگدڑ کے دوران میں دونوں باپ بیٹے نے مل کر لاہور پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخا کھوکھر کی غداری ثابت ہو گئی؛ لہٰذا اس کا سر اڑا دیا گیا اور جسرتھ کھوکھر کو قیدی بنا کر واپسی پر امیر تیمور سمرقند لے گیا۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد ہی جسرتھ کھوکھر جان بچا کر وطن واپس لوٹا۔

دہلی میں ملو خان اور سارنگ بندوقوں کی قوت پر بھروسہ کر رہے تھے۔ جب وہ امیر تیمور کے مقابلے کے لئے آگے بڑھے تو ان کی افغان فوج کو دیکھتے ہی ہندو اسیرانِ جنگ نے خوشی سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ یہ منظر دیکھ کر امیر تیمور سخت غضب ناک ہوا اور اسے شبہ پیدا ہو گیا کہ عین حالتِ جنگ میں یہ ایک لاکھ ہندو اسیرانِ جنگ دشمن سے نہ مل جائیں؛ لہٰذا اُس نے ان سب کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ سلطان محمود اور اقبال خان کو ایک ہی ہلے میں تیموری سپاہ نے شکست دے دی۔ شاید دہلی اس کے حکم سے تباہ کر دی جاتی، لیکن شیخ کھٹو کی عالمانہ بحث سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے عام معافی کا فرمان جاری کر دیا اور قیدیوں کو رہائی بخش دی۔ نو جنوری ۱۳۹۹ء[9] کو امیر تیمور نے میرٹھ کے ہندو مرکز پر حملہ کر دیا اور تیس مارچ تک سوالیک کے دامن کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے تمام قلعوں اور گڑھوں کو پامال کرتا ہوا جموں جا پہنچا، چونکہ کشمیر کے حکمران سکندر بت شکن نے پہلے ہی اس کی اطاعت تسلیم کر لی تھی، اس لئے امیر تیمور نے کشمیر پر چڑھائی قدمی نہیں کی اور واپس اٹک روانہ ہو گیا۔

اُب ہندوستان میں اس کے مقابلے کی کوئی طاقت باقی نہ تھی؛ لہٰذا وہ یہاں ایک پائیدار نظام حکومت قائم کر سکتا تھا، لیکن اسے آذربائیجان کے علاقے سے تشویش ناک خبریں موصول ہوئیں جن کی بنا پر اس نے اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ کر واپس روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جلدی میں مفتوحہ علاقے مختلف امراء کو بخش دیئے۔ دیپالپور اور ملتان کا علاقہ خضر خان کو عطا کرنے کے بعد امیر تیمور نے اس سے کہا "دہلی بھی ہم نے تجھے بخش دی۔"

نتائج

ہندوستان میں زیادہ عرصہ قیام نہ رکھ سکنے کی وجہ سے امیر تیمور اگرچہ یہاں کوئی پائدار نظام حکومت قائم نہ کر سکا، تاہم اس نے ہندوستان پر فوج کشی کا بڑا مقصد . . . . . ہندوؤں کی قوت کو توڑنا حاصل کر لیا۔ اس حملے نے ہندوؤں پر ثابت کر دیا کہ اب اگر انہوں نے دوبارہ سرکشی کی، تو انہیں کچل ڈالنے کے لئے ہندوستان کی سرحد پر ایک ایسا طاقت ور مسلمان حکمران موجود ہے جو ہر قسم کی بغاوت کو دبا دینے کی پوری صلاحیت اور طاقت رکھتا ہے، جن امراء کو امیر تیمور نے مفتوحہ علاقے عطا کئے، انہوں نے ان علاقوں میں امیر کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔ توزکِ تیموری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر فوج کشی سے قبل اس معاملہ پر تیمور اور اس کے امیرانِ لشکر کے درمیان کافی بحث و تمحیص جاری رہی کہ آیا فتح کرنے کے بعد ترک افواج کو وہاں آباد کر دینا چاہیئے یا نہیں۔ امیرانِ لشکر کی رائے یہ تھی کہ ایسا کرنے سے ان کی اولادیں ہندی معاشرے میں مدغم ہو کر اپنی فوجی ترکیب سے خارج ہو جائے گی اور اس طرح بالآخر تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ امیر تیمور نے گہرے غور و فکر کے بعد اہم سرحدی علاقوں میں ترک قوم کے افراد کو آباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا تاکہ ان اہمیت والے علاقوں میں ترک قوم کا مستقل غلبہ قائم کر دیا جائے۔ جن علاقوں کو ترکوں کی آبادکاری کے لئے منتخب کیا گیا، ان میں ولایتِ پکھلی، ملتان اور بلوچستان کا اہم سرحدی علاقہ شامل تھا۔ امیر تیمور نے ولایتِ پکھلی میں قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو اس ملک کی پاسبانی کے لئے متعین کیا۔ یہ ہزارہ منگ دہلی پر حملے کے دوران میں اس کے ہمرکاب تھی۔ میدانِ ہزارہ قارلق کا تمام علاقہ اس ہزارہ منگ کے افسروں کو جاگیر کے طور پر عطا کیا گیا۔ اس طرح اس ملک میں پہلی بار ترک مستقل طور پر آباد ہوئے۔ یہی واقعہ ہزارہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ آئندہ اوراق میں

انہی ترکوں کی آبادکاری کے تفصیلی حالات ایک الگ عنوان کے تحت بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس ملک میں ترکوں کی آبادکاری کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ ملک یعنی ولایتِ پکھلی کشمیریوں کے تسلط سے آزاد ہو گئی اور اس وسیع تیموری قلمرو کا ایک حصہ بن گئی جو دہلی سے ماسکو تک کے تمام درمیانی ممالک پر مشتمل تھی۔ چونکہ کشمیری حکمران امیر تیمور کی اطاعت تسلیم کر چکا تھا، اس لئے وادیٔ کشمیر بھی ان ترکوں کے زیرِ اثر آ گئی۔ کابل سے سرینگر اور لاہور سے سرینگر جانے والی شاہراہِ کشمیر پر امیر تیمور نے اس ہزارہ منگ کا زبردست پہرہ بٹھا دیا۔

نظامِ حکومت

تیموری افواج کی تنظیم اور اس کے سیاسی نظام کے اصولِ تفصیل کے ساتھ ظفرنامہ تیموری اور توزکِ تیموری میں بیان کئے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر تیمور نے چنگیزی یاسا اور ایران کے نظامِ حکمرانی کے قواعد سے بھی استفادہ حاصل کیا تھا۔ فوج میں سب سے نچلا درجہ سپاہی کا ہوا کرتا تھا۔ دس سپاہیوں پر ایک اون باشی، دس اون باشیوں پر ایک یوز باشی اور دس یوز باشیوں پر ایک بیگ باشی ہوا کرتا تھا۔ اس طرح بیگ باشی ایک ہزارہ منگ کا کمانڈر ہوا کرتا تھا۔ ہر بیگ باشی کو ایک جھنڈا، شاہی گھوڑا اور نقارہ عطا کیا جاتا تھا۔ امیر تیمور کی ذاتی پلٹن کا نام الغ منگ یعنی ہزارہ کلاں تھا۔ بیگ باشیوں سے اوپر تومان اگاسی (دس ہزاری) دیوان بیگی امیر الامراء کے عہدے ہوا کرتے تھے۔ رسالہ کے ہر سوار کو دو گھوڑے، ایک کمان، ایک بھرا ہوا ترکش، ایک آرہ، ایک کلہاڑہ، دھاگہ اور کپڑا سینے کے لئے دس سوئیاں دی جاتی تھیں۔ ہر ہزارہ منگ کو برانغار، جرانغار، ہراول قراول، چپاول اور ترکی طلغہ جیسے دستوں سے منظم کیا جاتا تھا۔ امراء کو تنخواہوں کے عوض جاگیریں عنایت کرنے کا بھی رواج موجود تھا۔ ہر مہم سے پہلے امراء اور شاہزادوں کے اجلاس طلب کئے جاتے اور امیر کی طرف سے ضروری ہدایات اور احکامات جاری کئے جاتے تھے۔

مملکت کا غیر فوجی نظام بھی مکمل تھا۔ سب سے اوپر دیوان بیگی کا عہدہ تھا اور اس کے ماتحت عرض بیگی اور چار وزیر ہوا کرتے تھے۔ پہلا وزیر ٹیکسوں، محاصل اور پولیس کا کام کیا کرتا تھا۔ دوسرا وزیر فوج کی تنخواہ اور رسد کا انچارج ہوا کرتا تھا اور تیسرا فوجی ریکارڈ (رجسٹرات اعداد و شمار)

اور وراثت کے معاملات پر نگاہ رکھتا تھا۔ پولیس اور جاسوسی کا محکمہ اتنا منظم اور عمدہ تھا کہ اس کے ذریعے امیرِ مملکت کے ہر حصے کے حالات سے بخوبی آگاہ رہتا تھا۔ اگرچہ مملکت کا مسلمہ قانون شریعتِ اسلامیہ ہی تھی، لیکن چنگیزی یاسا کے بعض قوانین پر بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر جزوی کارروائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

شخصیت و کردار

متعصب عجمی اور مغربی مورخین نے امیر تیمور کو گڈریا، وحشی اور ظالم حملہ آور قرار دیتے ہوئے چنگیز خان کے دوش بدوش لا کھڑا کیا ہے، لیکن تاریخ کے مصدقہ اور قابلِ اعتماد ریکارڈ سے ان متعصب مصنفین کے یہ ریمارک غلط ثابت ہوتے ہیں۔ امیر تیمور کا والد اور اس کے بزرگ کئی پشتوں سے چغتائی سلطنت کے معزز امراء اور وزراء رہ چکے تھے۔ وہ ترکوں کے مشہور برلاس قبیلہ کی قراوکین (بمعنی سورت شاخ) میں پیدا ہوا۔ اس نے شہر سبز جیسے خوبصورت قصبے میں آنکھ کھولی، اسے اپنے قابلِ والدین کے علاوہ سلطان حسین جیسے اعلیٰ مدبر اور حکمران کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ اس نے جوانی کے زمانے میں سید برکی جیسے مشہورِ زمانہ پیرِ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ترک خوانین کی تاریخی مجلس شاورت میں مولانا زین الدین جیسے جید عالمِ دین نے اس کی امارت کی زبردست تائید کی تھی۔ بے مثال فتوحات حاصل کرنے کے باوجود امیر تیمور نے شاہی لقب اختیار کرنے کی بجائے اپنے آپ کو مسلمانوں کا امیر کہلانا ہی پسند کیا اور آخر دم تک امیر ہی کہلواتا رہا۔

اس کے دربار میں اگرچہ غیر ملکی علماء اور صناع بھی موجود تھے، لیکن سرکاری زبان ترکی ہی تھی۔ یوگر حروف اگرچہ بدھ دور کے یادگار تھے، لیکن بعض علماء کی مخالفت کے باوجود امیر تیمور نے انہیں باقی رکھا۔ امیر تیمور کے سرخ جھنڈے پر "رستی رستی" (انصاف طاقت ہے) کے الفاظ اس کی انصاف پسندی کا مظہر تھے۔ تمام مفتوحہ ممالک میں تجارت کے مفادات کی حفاظت کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔ افسروں کو حکم تھا کہ وہ ماتحت عملہ کی بہتری کے لئے ہر وقت کوشاں رہیں۔ اعلیٰ افسروں کو ہدایت تھی کہ وہ قانون کے نفاذ اور ٹیکسوں کی وصولی کے سلسلے میں نرمی سے کام لیں۔ امیر تیمور نے سمرقند، نارا اور کیش کی ترقی اور خوبصورتی کے لئے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ اس کی تعمیر کردہ مساجد

شفاخانے، خانقاہیں اور لائبریریاں بڑی حیران کن تھیں۔ عبادت گاہوں اور رفاہِ عامہ کے اداروں کے لئے وظیفے اور جاگیریں عطا کئے جاتے تھے۔ یہ ادارے اور ان کا عمدہ انتظام امیر تیمور کی علم دوستی اور اس کی تعمیری صلاحیتوں کا کھلا ثبوت ہے۔

ماسکو یونیورسٹی کے پروفیسر اوشانن Oshanan نے ایک اور پروفیسر کی ہمراہی میں امیر تیمور کی قبر اکھیڑ کر اس کی لاش اور ہڈیوں کا معائنہ کیا۔ ان پروفیسروں کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ امیر تیمور بلند قامت، متناسب اعضا اور مہیب آواز رکھنے والا خوبصورت جوان تھا۔ ایک لڑائی میں اس کا ایک پاؤں زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لنگ کر کے چلتا تھا۔

مورخین کا یہ بیان بالکل درست ہے کہ تیمور سے زیادہ شان و شوکت والا ترک اور کوئی نہیں گزرا۔ یوں تو تیمور کا دربار زمانے بھر میں اپنی مثال آپ تھا، لیکن اس کا کھلی فضا کا دربار ترکوں کی تاریخ میں بے مثال تھا۔ کھلے کیمپ میں ہر طبقہ کے افراد اپنے اپنے خیمہ نصب کرتے۔ مرکزی خیمہ کی قیادت میں ہر خاندان، ہر وزیر اور قوبان اگاسی کے خیمے نصب کئے جاتے۔ خیموں پر خوبصورت رنگین جھنڈے اس طرح لہلہا رہے ہوتے کہ سارا کیمپ ایک تختۂ گل معلوم ہوتا تھا۔ مرکزی خیمہ کی گنبد نما گول چھت ہوا کرتی اور آدمی کی کلائی جتنے موٹے بارہ نیلے اور سنہری ستون اسے اٹھاتے ہوتے تھے۔ خیمہ کے دونوں طرف برآمدے ہوتے جن کے چھ چھ ستون تھے۔ پانچ سو سے زیادہ سرخ رسّے اس عمارت کو سنبھالتے تھے۔ خیمہ کے بیرونی پردے پشمی تھے جن میں سیاہ، زرد اور سفید دھاریاں تھیں۔ اندر سُرخ طلائی قالین تھا۔ چاروں کونوں میں بڑے بڑے عقاب بنائے ہوتے تھے۔ ان کونوں کے ستون ہلال اور بدر سے مزین تھے۔ اس قلعہ نما خیمے کے گرداگرد رنگ دار اونچی دیوار تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بُرج اور مینار بنے ہوتے تھے۔ یہ خیمے دعوتوں اور خوش باشی کا مرکز تھے۔ خیموں کے باہر سبز اور سُرخ رنگے ہوتے ہاتھیوں کے تماشے، گھوڑ دوڑیں اور دوسری کھیلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

ابن خلدون جیسے جہاندیدہ اور محقق عالم نے امیر تیمور سے ملاقات کی اور وہ اس کے حُسنِ سلوک، ذہانت اور اعلیٰ علمیت سے متاثر ہوا۔ امیر تیمور نے دہلی میں قتلِ عام کا حکم دے دیا تھا، لیکن شیخ کھٹو کی عالمانہ بحث سے متاثر ہو کر اس نے یہ کہا کہ جس شہر میں شیخ کھٹو جیسا عالم رہتا ہو، اسے برباد کرنا مناسب نہیں۔ اُس نے اصفہان کے فتح کے موقع پر حکم دے دیا تھا کہ جس محلے میں علماء یا تعلیم یافتہ

لوگ موجود ہوں وہ محفوظ رہیں۔ تیمور نے حلب اور ہرات کے مشہور فلسفیوں سے علمی بحثیں کیں اور جنہوں نے اس سے اختلاف رائے کیا، اُس نے انہیں قیمتی تحفوں سے نوازا۔ جب مشہور عالم شمس الدین اور محمد جزائری اور شیخ بخاری دشمن کے دربار سے گرفتار ہوتے، تو اُس نے اُن سے حُسنِ سلوک کیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ سب اس کے دشمن ہیں۔ ایک دفعہ جب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ سے اس کا گزر ہوا تو اس نے خانقاہ کی خاک اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر ملی اور اس طرح اہل اللہ کے احترام کا ثبوت پیش کیا۔

تیمور کے اقوال آج بھی میدانِ سیاست کے جواں مردوں کو مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ اس کی اولوالعزمی کا اندازہ اس کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ "یہ رُبع مسکون ایک عظیم شہزادے کے عزائم کے سامنے کیا چیز ہے، جیسا کہ خدا ایک ہے، ویسے بادشاہ بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔" اس کی عجز و انکساری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی خط و کتابت میں شاہی القابات، استعمال کرنے کی بجائے ہمیشہ "من تنگر قلی تیمور" (میں خدا کا بندہ تیمور) کے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا۔ آج کی نسبت اُس زمانے میں سلطنت کے استحکام کے لئے قوت کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرنا پڑتا تھا، اس لئے تیمور کا سوانح نگار اس کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے "ملک را اگر قرار خواہی کرد، تیغ را بیقرار باید کرد" یعنی ملک کو اگر قرار دلانا چاہتے ہو تو تلوار کو بے قرار کرنا ہوگا۔ کچھ لوگ امیر تیمور کے قتل اور غارت گری کے واقعات کو دلیل بنا کر اسے ظالم اور جابر حکمران کی حیثیت دینے پر مُصر ہیں، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تیمور ایک ایشیائی شہزادہ تھا اور اسے اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے اس قسم کی کارروائیاں کرنی پڑتی تھیں۔ اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ٹھوس مثالوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ تیمور کی قتل و غارت گری کی تمام کارروائیاں ہمیشہ کسی نہ کسی نقصان کی جوابی کارروائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ "جس حکمران کی عزت اس کے اس کوڑے سے کم ہو جو وہ استعمال کرتا ہے، وہ حکومت کے لائق نہیں۔"

یہ امیر تیمور کی پُر وقار شخصیت اور مضبوط کردار ہی کا اعجاز تھا کہ سرزمین توران کے تمام الوس و اویماق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس کی قیادت میں ترک فاتح جہاں بن کر اٹھے اور چند برسوں کے اندر اندر دنیا بھر کے باسٹھ ممالک اور چوالیس اقوام ان کی مطیع و فرمانبردار بن گئیں۔ تیمور کی وفات

کے بعد تقریباً تین صدیوں تک برِ صغیر ہند و پاکستان اور افغانستان کی تاریخ بڑی حد تک تیموری ترکوں ہی کی تاریخ بنی رہی۔ امیر تیمور کو اپنے آبائی قصبے اور اپنے دار الحکومت سمرقند سے بہت دلچسپی تھی۔ ان شہروں کو ترقی دینے کے لئے اس نے دمشق کے شہریوں، حلب کے مشہور جولاہوں، انگورہ کے پارچہ بافوں، ارضِ روم کے زرگروں، جارجیا کے سناروں اور ہندوستان کے کاریگروں کو سمرقند میں آباد کیا۔ محتاط اندازے کے مطابق سمرقند کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار تھی اور تیمور کے زمانے میں یہ شہر تمام ایشیائی تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ تیمور کو عمدہ عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ من جملہ دیگر عمارات کے تبریز کی مسجد، شیراز کا محل، بغداد کا مکتب اور حضرت ترکستان (شیخ احمد یسوی) کا مقبرہ اس فن کے ساتھ امیر تیمور کے شغف کا بیّن ثبوت ہیں۔ امیر تیمور کیش کی طرف زیادہ مائل تھا، اس لئے اس نے طویل جدّ و جہد کے بعد اس قصبے کو "قبلۃ العلم والادب" بنا دیا۔ آک سرائے کا محل تعمیر کرنے میں مسلسل دس برس صرف ہو گئے۔ باغِ شمال اور باغِ نو کے محلات اپنی لطافت اور کاریگری کے لحاظ سے زمانے بھر میں ممتاز تھے۔ امیر تیمور نے سمرقند کی شاہی مسجد کو بہت بلند سطح پر تعمیر کروایا۔ بابر لکھتا ہے کہ قرآن کی ایک آیت اس کے بڑے دروازے پر اس قدر بڑے حروف سے لکھی گئی کہ دو کوس کی مسافت سے پڑھی جا سکتی تھی۔ ۱۹۱۸ء کے سوشلسٹ انقلاب اور سرزمین توران پر روسی قبضے کے وقت تک امیر تیمور کی بنا کردہ عمارات موجود تھیں۔ روسیوں نے شاہی محل کو شفاخانہ میں بدل دیا اور مساجد کا وہی حشر ہوا جو بخارا میں امام بخاریؒ کے مقبرے اور مسجد بخارا کے ساتھ ہو چکا تھا۔

پروفیسر ویمبرے کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ امیر تیمور کے ترقیاتی کارناموں کے پھل اس کے بچوں اور پوتوں کی تاریخ یعنی خاندانِ تیموریہ میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ علم اور سائنس کو قومی رنگ دینا اور پھر ترکوں کو اس اونچے مقام پر لے آنا جہاں وہ کبھی نہ پہنچے تھے، امیر تیمور کا ذاتی کارنامہ تھا۔

٭

قرلق ترکوں کی آبادکاری

گزشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ تیموری حملے سے قبل ترکوں کے حملوں کا رُخ بالعموم وادی سندھ سے گزر کر وادیٔ گنگا کے علاقے کی طرف ہوا کرتا تھا۔ غزنوی افواج تین بار بھگوڑے ہندو راجاؤں کی گوشمالی کے لئے کشمیر کے پہاڑی قلعوں پر حملہ آور ہوئیں، مگر ان کا مقصد کشمیر یا پکھلی پر قبضہ جمانا نہ تھا۔ غوری حملے کے دوران میں ہزارہ قدیم کے حکمران سُربن سنگھ نے مارگلہ پہنچ کر سلطان محمد غوری کی فوج پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس کے ساتھ غوری جرنیل اصالت خان پکھلی کی طرف آگے بڑھا اور مان سنگھ کو شکست دے کر اس علاقے پر قابض ہوا۔ ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی کے زمانے میں ہزارہ زیریں اس کے تابع رہا، لیکن بالائی ہزارہ پر کشمیر کی بالادستی قائم رہی۔ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں کہ تیموری حملے سے قبل ہزارہ قدیم میں کبھی ترکوں کی مستقل آبادکاری ہوئی ہو۔

۱۳۹۹ء کے تیموری حملے سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے علاقہ پکھلی خاص میں ہمیں تیموری ترکوں کی موجودگی کے آثار بہاؤالدین مٹو کی کتاب سُلطانی اور توزک تیموری سے ملتے ہیں۔ ۱۴۱۶-۱۳۹۳ء کے درمیانی عرصے میں کشمیر کا حکمران سکندر بُت شکن تھا جو اسی شاہ میرزا کی اولاد سے تھا جس نے کشمیر میں کوٹہ رانی کے زمانے میں اقتدار حاصل کیا تھا۔ سکندر بُت شکن کے زمانے میں کشمیر میں اسلام کی اشاعت زوروں پر تھی۔ سیّد علی ہمدانی اور ان کے فرزند علما و مشائخ کے گروہوں کو ہمراہ لے کر کشمیر میں تشریف فرما ہوئے، اور ان کی تبلیغ دین کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہوا۔ بہاؤالدین مٹو نے حضرت سید علی ہمدانی کے کشمیر سے واپسی کے سفر کو فارسی اشعار میں قلمبند کیا۔ ان اشعار میں امیر تیمور کے پوتے امیرزادہ سلطان محمد کی پکھلی میں موجودگی اور اس کے حضرت سیّد علی ہمدانی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا واقعہ موجود

ہے۔ اشعار یہ ہیں ؎

شاہ برزد قدم چو ماہِ جلی
از رہِ بارہ مولا در پکھلی
شاہ چو سلطان محمد آں جا بُود
او شہنشاہ ملکِ معنیٰ بُود
بر ارادت بہ شاہ دست زدہ
شعلہ بر نفسِ خود پرست زدہ
ماند بر پا بہ مہماں داری!!
یافت توفیق خدمت از باری
چند روزے کہ شاہ آں جا بُود
اُو بہ خدمت گریش بر پا بُود
سیدش ہم عنانِ خویش گرفت
رہِ یوسف زئی بہ پیش گرفت

ترجمہ: حضرت سید علی ہمدانیؒ ماہِ روشن کی مانند بارہ مولا سے آگے چل کر پکھلی کی طرف آگے بڑھے۔ سلطان محمد وہاں موجود تھا، وہ ولایتِ مغلوی کا شہنشاہ تھا، اس نے حضرتؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کا مرید بن گیا۔ اس طرح اس نے اپنے نفس خود پرست پر ایک شعلہ گرا دیا۔ اس نے خدا کی توفیق سے حضرتؒ کی مہمان نوازی کی۔ چند روز تک جبکہ حضرت نے پکھلی میں قیام فرمایا۔ سلطان محمد اُن کی خدمت میں حاضر رہا۔ پھر آپ نے اسے ہمراہ لیا اور علاقہ یوسف زئی کے راستے آگے بڑھے (اس زمانے میں علاقہ یوسف زئی افغانستان میں تھا اور یوسف زئی وہیں آباد تھے)

پکھلی سے سلطان محمد آپ کے ہمراہ روانہ ہوا اور کافرستان کے علاقہ کنار میں آپ فوت ہو گئے۔ اس وقت کافرستان کا حاکم سلطان محمد خضر شاہ آپ کے پاس موجود تھا اور اس کی دعوت پر آپ نے چند روز اس کے پاس قیام بھی فرمایا تھا۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ امیرزادہ سلطان محمد ابن میراں شاہ اور امیرزادہ سلطان محمد ابن پیر محمد جہانگیر دونوں امیر تیمور کے پوتے تھے اور وہ اس کی زندگی ہی میں افواج کی کمان کر رہے تھے۔

امیر تیمور نے سلطان محمد ابن میراں شاہ کو منگولیا کی اہم سرحد کا کمانڈر مقرر کیا ہوا تھا۔ مٹو کے مندرجہ بالا اشعار سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیموری حملوں سے کچھ عرصہ قبل تیمور کے اثرات پکھلی تک پہنچ چکے تھے، وہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اس علاقے کا نام پکھلی ہی تھا۔ اس سے ان لوگوں کی یہ غلط فہمی دُور ہونی چاہیئے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ سترھویں صدی میں جب سواتی یہاں داخل ہوتے تو انہیں نے اپنے مورثِ اعلیٰ پکھال کے نام پر اس کا نام پکھلی رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطان پکھال ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ سواتیوں کے حالات ایک عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں درج کئے جا رہے ہیں۔ یوسف زئی اس زمانے میں افغانستان کے علاقے میں آباد تھے، انہیں بہت بعد میں تقریباً پندرھویں صدی کے نصف میں ایک تیموری شہزادے الغ بیگ ثانی نے جو ظہیر الدین بابر کا چچا تھا، افغانستان کے علاقے نکالا، تب وہ اپنے موجودہ علاقے کی طرف آئے۔ یوسف زئیوں کے دباؤ کی وجہ سے کچھ سواتی باشندے پناہ لینے کے لئے پکھلی کے علاقے میں داخل ہوتے، مگر یہ سواتی پناہ گزیں تھے جو بطور یلغار نہیں آتے تھے۔ اس وقت یہاں قرلق ترک حکمران تھے اور پکھلی آباد تھی۔ سواتی بطور یلغار سترھویں صدی میں ۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا کے لشکر میں بھرتی ہو کر پکھلی پر قابض ہوتے۔ ان واقعات کی روشنی میں ان لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سواتیوں نے اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا نام پکھلی رکھا۔

علاقہ پکھلی میں تیموری حملہ سے قبل ترکوں کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں توزکِ تیموری کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:

> [1] ہندوستان فتح کرنے کے لئے میں نے (امیر تیمور نے) اپنے امیرانِ لشکر اور فرزندانِ دلبند سے مشورہ کیا؛ چنانچہ انہوں نے مجھے مختلف مشورے دیئے۔ امیرزادہ پیر محمد جہانگیر نے ہندوستان کو فتح کرنے اور وہاں کے مال و دولت سے عالمگیر ہونے کا مشورہ دیا۔ سلطان محمد امیرزادہ رستم نے ہندوستان کے محکم قلعوں، مسلح سپاہ اور آدمیوں کا شکار کرنے والے ہاتھیوں، وہاں کے دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں سے عہدہ برآ ہونے کے سامان کی تیاری کا مشورہ دیا۔ . . . . . اس کے برعکس بعض امیران لشکر تسخیر ہندوستان

---

[1] توزکِ تیموری اُردو صفحہ ۴۷، ۶۵، ۶۶

کے بارے میں مذبذب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے ہندوستان فتح کر لیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی، تو ہمارے بیٹے اور پوتے اپنی فوجی ترکیب سے خارج ہو جائیں گے اور اس طرح ہماری نسل تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

"اب دوبارہ صلاح و مشورہ کے بعد طے پایا کہ امیرزادہ پیر محمد جہانگیر جو دستِ راست کا سپہ سالار بھی ہے اور کابل کا حکمران ہے، تیس ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان جائے اور ملتان پر قبضہ کر لے۔ سلطان محمد امیرزادہ رستم کو حکم ہوا کہ وہ تیس ہزار سواروں کے ساتھ دستِ چپ کا سپہ سالار بن کر کوہِ کشمیر کے دامن سے صوبہ لاہور پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھے اور میں خود بتیس ہزار سواروں کے ساتھ آگے بڑھا۔"

بہاؤالدین مٹو کے مندرجہ بالا اشعار اور توزکِ تیموری کے ان اقتباسات کو باہم ملا کر پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان محمد ۱۳۹۸ء کے تیموری حملے سے کچھ پہلے پکھلی میں موجود تھا۔ اگر ولایتِ پکھلی کے قدیم حدود اربعہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، جو اکبر نامہ، آئینِ اکبری، توزکِ جہانگیری اور سیرۃ المتاخرین جیسی کتب میں بیان کیا گیا ہے، تو صاف نظر آتا ہے کہ ولایتِ پکھلی کا ایک حصہ کوہِ کشمیر کا دامن تھا؛ لہٰذا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اسی علاقے سے گزر کر سلطان محمد کو لاہور کے صوبے پر حملہ آور ہونے کا حکم ملا تھا۔

کچھ مورخین کا خیال یہ ہے کہ سلطان محمود کو میسرے کا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ محمد کے لفظ کو سہواً محمود لکھ دیا گیا ہو۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ترک تیموری حملے سے بھی بہت پہلے ہی پکھلی میں آباد تھے۔ غزنوی، غوری اور چنگیزی افواج کی پیش قدمی کے زمانے میں ترک شمال ہند کے ہر حصے تک پہنچ چکے تھے، لیکن جہاں تک ترکوں کی قرلق قوم کا تعلق ہے، ان کی آبادکاری کا تاریخی ثبوت امیر تیمور کے حملے کے بعد ہی ملتا ہے۔

بہرحال یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں نوے ہزار رجات کے ساتھ تین اطراف سے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کشمیر کا حکمران سکندر بت شکن تھا، اُس نے بلا حیل و حجت امیر تیمور کی اطاعت تسلیم کر لی۔ امیر تیمور نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے سفرِ دہلی سے واپسی پر اٹک کے مقام پر اس کی خدمت میں حاضر ہو؛ چنانچہ سکندر بت شکن وقتِ مقررہ پر اٹک کے مقام پر پہنچ گیا، مگر اسے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تیمور کے دربار میں یہ افواہ گرم تھی کہ سکندر ایک ہزار گھوڑوں کے تحفے کے ساتھ امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ یہ ایک افواہ ہی تھی اور درحقیقت اس کے پاس کوئی ایسا تحفہ نہ تھا۔ اس لئے وہ شرمندگی اور

گھبراہٹ کے عالم میں امیر تیمور سے ملاقات کئے بغیر بھاگ گیا۔ کشمیر پہنچ کر اس نے چند معتبر اور دانا آدمیوں کے ہمراہ اپنے بیٹے شاہی خان کو امیر تیمور کی خدمت میں سمرقند روانہ کر دیا۔

شاہی خان کو امیر تیمور نے بہت پسند کیا اور اسے وہیں اپنے دربار میں اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ شاہی خان متواتر سات سال تک امیر تیمور کی خدمت میں رہا اور اس کی وفات کے بعد ہی کشمیر واپس لوٹا۔

سمرقند جیسے ترقی یافتہ شہر اور تیموری دربار میں سات سال کا طویل عرصہ گزار کر شاہی خان نے حکمرانی کے اسرار و رموز سیکھنے کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں مفید معلومات حاصل کیں؛ چنانچہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد جب وہ کشمیر کا حکمران بنا تو اس نے اپنے سمرقند کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کشمیر میں قابلِ قدر اصلاحات نافذ کیں۔ قبل ازیں کشمیر کے حکمران اور عوام بیرونی دُنیا کے ترقیاتی کارناموں سے ناآشنا تھے۔ اس طرح شاہی خاندان کی اصلاحات کے ذریعے کشمیر میں ایک سماجی انقلاب رونما ہوا۔

ہزارہ کی وجہ تسمیہ کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے کہ امیر تیمور نے ہندوستان سے واپسی کے وقت پکھلی میں قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو متعین کر دیا تھا اور میدانِ ہزارہ قارلق جاگیر کے طور پر اسے عطا کر دیا تھا۔ اس سے قبل پکھلی پر کشمیر کا اثر غالب تھا۔ اس ولایت میں اپنی ہزارہ منگ کو متعین کر کے دراصل امیر تیمور نے شاہراہِ کابل اور شاہراہِ کشمیر پر زبردست پہرہ بٹھا دیا تھا؛ چونکہ یہ تاریخی واقعہ تمام معتبر کتبِ تاریخ میں موجود ہے؛ لہٰذا اس میں کوئی اشتباہ نہیں، البتہ قرلق قبیلہ کے ترکوں کے بارے میں چند اہم حقائق پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرلقوں کی اصل کے بارے میں اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کا بیان ہے:

"[1] مغربی ترکوں کے مشرق اور ان کے علاقے کے اندر کوہِ الطائی تک اور دریائے ارتش کے بالائی مجری کے درمیان بقول ٹامسن (Z. D. M. 78-172) قُرلق Karluke رہتے تھے جن کے ترکی النسل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ....."

---

[1] اُردو معارفِ اسلامیہ دانش گاہ پنجاب جلد ۶ صفحہ ۲۱۷، ۲۱۶

۷۶۶ء میں مغربی ترکوں کے علاقے ان کے قبضے میں چلے گئے۔ اس وقت ان کا حکمران یبغو abghu کہلاتا تھا۔"

"[1] قرلق کا نام عربی میں خرلخ اور فارسی میں خلخ لکھا جاتا ہے۔ دراصل اسی سردار کو طخارستان کا جبغو کہا گیا ہے۔ . . . . . اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت (ساتویں صدی میں) قرلقوں کی ایک جماعت ان علاقوں میں جو دریائے آموں کے جنوب میں واقع ہیں پہنچ گئی تھی، جہاں وہ اب بھی موجود ہے۔"

اُردو دائرہ کے ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرلق ترکوں کے قدیم ترین قبیلوں میں سے ایک مشہور قبیلہ ہے اور وہ ساتویں صدی عیسوی میں بھی حکمرانی کر رہے تھے، چونکہ اوغوز خان قرلق تھا، اس لئے محمود کاشغری نے قرلق اور اوغوزی قبائل کو ایک ہی قبیلہ شمار کیا ہے۔ ترکی زبان میں قرلق سے مراد وہ ترک ہیں جو برفستانی علاقے کے رہنے والے ہوں۔ امیر تیمور اور چنگیز خان دونوں کا شجرہ نسب اوغوز خان تک پہنچتا ہے۔ اُردو دائرہ نے وضاحت سے لکھا ہے کہ قرلق ترک ہی بلادِ اسلامیہ کے قریب ترین ہمسائے تھے، اس لئے انہوں نے تمام ترکوں میں اسلام لانے میں پہل کی۔ ترکوں کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ بنو امیہ کے دور سے شروع ہوا اور دسویں صدی تک جاری رہا۔ مغل دور میں ولایت پکھلی کے قرلق ترکوں کو مختلف کتبِ تاریخ میں قارلُغ، قرلُوق، قرلُوغ اور قارلُق کے طور پر لکھا اور بولا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان بھر میں ترکوں کا یہ واحد قبیلہ تھا جو دورِ زوال تک اپنے قدیم نام سے پکارا جاتا رہا۔

مشہور روسی مستشرق بارتھولڈ Barthold نے اپنے تاریخی مضمون Turkistan Down to Mongol Invasion میں قرلق ترکوں کے تفصیلی حالات صفحہ نمبر ۷۰، ۱۷۷، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۲۴، ۲۵۴، ۳۲۱، ۳۲۶، ۳۳۳-۴، ۳۳۶، ۳۶۲، ۴۱۱، ۴۱۴، اور ۴۴۲ پر درج کئے ہیں۔ اس مضمون کو E J B نے پسند کیا اور اسے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا گیا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرلق ترکوں کو سیر دریا، سمرقند، کدار، الترار باندھ، فرغانہ، اور بخارا تک کے علاقوں پر سالہا سال تک بالادستی حاصل تھی۔ دریائے وخش ان کے علاقے سے

---

[1] اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ دانش گاہِ پنجاب جلد ۶ صفحہ ۲۲۱

گزرتا تھا۔ امیر تیمور کا آبائی قصبہ کیش سالہا سال سے اوغوزی قرلقوں کے قبضے میں تھا۔ عباسی خلیفہ المنتصر اور المنصر کے درمیان خانہ جنگی کے زمانے میں المنتصر قرلق ترکوں کے پاس امداد کی درخواست لے کر گیا تھا۔ اُن کے سینبعو نے اس کی امداد کی؛ چنانچہ ۱۰۰۳ء میں اوغوزی کثرت سے مشرف باسلام ہوتے۔ اُموی اور عباسی ادوار میں سمرقند، صوغد، فرغانہ اور بخارا کے درمیانی علاقے قرلقوں کے مسکن تھے۔ یہ وہی علاقے ہیں جن پر ساسانی اور عرب حکمران صاحب اقتدار رہ چکے تھے۔

آئینِ اکبری میں ولایتِ پکھلی میں انہی قرلق ترکوں کی آبادکاری کے متعلق مندرجہ ذیل بیان موجود ہے:

"[1] سرکار پکھلی کا طول پینتیس کوس اور عرض پچیس کوس ہے۔ اس سرکار کے پورب میں کشمیر، شمال میں کتور (گلگت) ہے۔ پکھلی کے جنوب میں کہکروں (گکھڑوں) کا ملک ہے اور جنوب میں اٹک بنارس (قلعہ اٹک) ہے۔ صاحب قران امیر تیمور نے ایک گروہ کو اس ملک کی حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا اس زمانے میں (اکبری دور میں) اس کی اولاد یہاں آباد ہے۔ یہ ملک تین دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ کشن گنگ، بھت (جہلم) اور دریائے سندھ، اس ملک کی زبان ہندکو، کشمیر، ہندوستان اور زابلستان (غزنی) کسی ملک کی زبان سے نہیں ملتی۔"

اسی سلسلے میں توزکِ جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے:

"[2] سرکار پکھلی کا طول پینتیس کوس اور عرض پچیس کوس ہے۔ اس کے مشرق میں کشمیر، جنوب میں کہکر (گکھڑ) مغرب میں اٹک بنارس اور شمال میں کتور واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جب صاحبِ قرآن، فاتح جہاں (امیر تیمور) ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد توران کے دارالملکت کو واپس روانہ ہوتے تھے، تو انہوں نے موجودہ باشندوں کے اجداد کو یہاں آباد کیا تھا۔

سیر المتاخرین کا بیان ہے:

---

[1] آئین اکبری جلد دوم اردو ترجمہ مولوی فدا علی صاحب جامعہ عثمانیہ دکن، صفحہ ۱۰۹۷

[2] توزکِ جہانگیری، ترجمہ سلیم واحد سلیم صفحہ ۶۰۱

"[1] صاحبقرآن چندے را بپاسبانی گزاشتہ بودند امروز نژاد آں ہا فراواں۔"

ترجمہ: امیر تیمور نے ایک گروہ کو اس ملک کی حفاظت کے لئے یہاں مقرر کیا تھا، آج ان کی اولاد بکثرت یہاں آباد ہے۔

اسی سلسلے میں مآثر الامراء میں لکھا ہے:

"[2] پکھلی پینتیس کوس لمبی اور پچیس کوس چوڑی ایک ولایت ہے جو مغربی کشمیر سے ملحق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب تیمور توران کو واپس ہو رہا تھا، تو اس نے قارلوغ (قرلق) قوم کے کچھ لوگوں کو اس ملک کی حفاظت کے لئے مقرر کیا تھا۔"

مندرجہ بالا کتب تاریخ کو مغل دور کی تاریخ پر ماخذوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کتابوں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے مندرجہ ذیل امور کا قطعی ثبوت مل جاتا ہے:

۱۔ پکھلی خاص کے علاوہ ولایت پکھلی کے نام سے ایک ملک موجود تھا جس کا علاقہ کشمیر، گلگت، راولپنڈی اور اٹک کے درمیان واقع تھا۔ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ اکبری دور میں سلطنت معلیہ سے الحاق کے بعد پکھلی کو ایک سرکار کا درجہ دے دیا گیا تھا اور میدان ہزارہ قارلق کو ایک پرگنہ کا درجہ دے کر اٹک کے علاقہ سرکار کے ساتھ شامل کر دیا گیا، اس سے پہلے ولایت پکھلی میں آزاد کشمیر کا علاقہ مظفر آباد تا بحد بھولیاس، تحصیل مانسہرہ تا بحد دریائے سندھ، تحصیل ایبٹ آباد تا بحد راولپنڈی اور تحصیل ہری پور ہزارہ تا بحد اٹک و مارگلہ کے تمام علاقے شامل تھے۔ پکھلی سرکار کی تشکیل کے بعد صرف میدان ہزارہ قارلق اس سے الگ کیا گیا اور بقیہ علاقے بدستور اس میں شامل رہے۔ اس زمانے میں ایک کوس تقریباً تین انگریزی میلوں کے برابر ہوا کرتا تھا۔ ایک کوس میں پانچ ہزار گز ہوا کرتے تھے _____ اور ایک گز اکتالیس انگلیوں کے برابر ہوا کرتا تھا۔ اگر اس حساب سے دیکھا جائے، تب بھی پکھلی سرکار کا رقبہ وہی نکلتا ہے جو اس کے حدود اربعہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ توزک جہانگیری میں مارگلہ کو گکھڑوں کی آخری حد بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ تیموری حملے کے بعد یعنی ۱۳۹۹ء کے مارچ کے مہینے میں امیر تیمور کے حکم سے اس ملک کی حفاظت

---

[1] سیر المتاخرین نول کشور صفحہ ۶۲

[2] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۵۶۳

کے لئے ہزارہ قرلق کو یہاں متعین کیا گیا۔

۳۔ اس ملک کی زبان ایک ہی تھی اور وہ پشتو، کشمیری، فارسی اور پنجابی سے مختلف تھی۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ہندکو ہی ہو سکتی ہے۔ اب تک پکھلی سرکار کے ان تمام علاقوں میں یہی زبان مستعمل ہے۔

۴۔ پکھلی سرکار کا علاقہ تین دریاؤں یعنی دریائے جہلم، دریائے کشن گنگ اور دریائے سندھ سے سیراب ہوتا تھا۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ یہ تینوں دریا اس کی حدود سے ہو کر گزرتے تھے۔

ولایت پکھلی میں ترکوں کی اس آبادکاری کا ذکر جنرل کننگھم کی سروے رپورٹس (جلد دوم صفحہ ۱۹) ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء (صفحہ ۲۰) تاریخ ہزارہ مرتبہ کیپٹن ویس (صفحہ ۴) میں تفصیل سے موجود ہے، مگر خوفِ طوالت کی بنا پر مزید حوالہ جات نہیں پیش کئے جا رہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات مندرجہ بالا کتب کے درج شدہ صفحات میں یہ مضمون ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ولایتِ پکھلی کا مندرجہ بالا حدود اربعہ اکبری دور میں اس وقت بیان کیا گیا ہے، جبکہ ولایتِ پکھلی کو سلطنت سے الحاق کے بعد ایک سرکار کا درجہ دے دیا گیا تھا اور ہزارہ قارلق کو ایک پرگنہ کا درجہ دے کر اس سے الگ کر دیا گیا تھا۔ دھمتوڑ کی ذیلی ریاست بھی اس وقت وجود میں آ چکی تھی۔

تیموری حملے کے بعد ولایت پکھلی تیموری قلمرو کا ایک حصہ بن گئی اور اس ہزارہ منگ کے افسر تیموری قلمرو کی حیثیت سے اس پر حکمرانی کرنے لگے۔ چونکہ وہ ایک عظیم فاتح کے متعین کردہ افسر تھے، اس لئے اردگرد کے کسی حکمران کی یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ان کی سرحدات پر دست درازی کرتا۔ تیمور کی وفات کے بعد توران میں تیموریوں کے درمیان خانہ جنگی کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ ہزارہ منگ اپنے مرکز سے کٹ گئی۔ اس دور کا تاریخی ریکارڈ محفوظ نہیں، لیکن قرائن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ افسر اپنے خان یا قاغان (بڑے خان) کے تحت اس علاقے پر حکمران کرتے رہے۔ اس زمانے میں ترکوں کے ہاں بڑے خان کے لئے قاغان کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ اردو دائرہ کے بیان کے مطابق ساتویں صدی میں ترکوں کے تین قاغان تھے۔ بیلاوہ قاغان مشرقی ترکستان میں تھا۔ دوسرا وہ جو ترکیش میں آباد تھا اور کاغان ترکیش کہلاتا تھا اور تیسرا تاغان یہ غیر تھا۔ چنگیز خان نے بھی ابتدائی زمانے میں یہی ترکی لقب قاغان اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ تحصیل [illegible] کی دارنی کا غان [illegible] دور کی [illegible] آج کل بسط قاغان کر کا [illegible] جاتا ہے [illegible] قاغان [illegible]

[illegible] طاقت کی وجہ سے [illegible] داوی باشندے [illegible] مشہور ہے۔ اگر اس تحقیق کے بعد جیوگرافز اور فنکر مال کے [illegible] لفظ قاغان کے [illegible] تحقیق کریں تو بہت مناسب ہوگا۔

قارلق ترکوں کی آبادکاری کے زمانے میں وہ نام تدیم باشندے اس ولایت میں سکونت پذیر تھے [illegible] تذکرہ گزشتہ سطور میں کر دیا گیا ہے۔ اس وقت میدان ہزارہ قارلق میں سب سے اہم قصبہ مانکرائے تھا۔ تحصیل ایبٹ آباد کے علاقے میں دھتوڑ یا دھنتور سب سے اہم قصبہ تھا۔ ترک اسے ترکی لب و لہجہ میں دھنتور یا دمتور پکارتے تھے۔ اس سے آگے مانگلی کا قصبہ تھا جسے تقریباً سترہ سو سال پہلے راجہ رسالو کے بیٹے منگل نے آباد کیا تھا۔ تحصیل خاص میں بیدادی اور شنکیاری کے قصبے آباد تھے۔ علاوہ ازیں تمام ولایت پکھلی میں چھوٹے چھوٹے دیہات موجود تھے۔ یہ دیہات اپنے قدیم ناموں کے ساتھ اب بھی ضلع ہزارہ اور آزاد کشمیر کے علاقے میں موجود ہیں۔

موسم اور آب و ہوا کے لحاظ سے ان برفستانی ترکوں کی رہائش کے لئے تحصیل مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے سرد علاقے زیادہ موزوں تھے، اسی لئے انہوں نے پکھلی خاص اور دھتوڑ کے علاقے میں رہائش پذیر ہونا زیادہ موزوں سمجھا۔ قاغان اور گلیات کے سرد مقامات تورانی آب و ہوا کی یاد تازہ کرنے کے لئے بہت مناسب تھے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے بھی پکھلی کا یہ پہاڑی علاقہ زیادہ موزوں تھا۔ میدان ہزارہ قارلق عام طور پر حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ لہٰذا اس میں فوجی مرکز تعمیر کرنا اتنا سود مند نہ ہو سکتا تھا: جتنا کہ تحصیل مانسہرہ، تحصیل ایبٹ آباد اور مظفر آباد کا علاقہ سود مند تھا۔

ان ابتدائی قارلقوں نے کورمنگ (آزاد کشمیر) گلی باغ، مانگلی، جھانجل، دربند اور دھتوڑ کے علاقے میں قلعے اور چھاؤنیاں تعمیر کیں۔ ان فوجی مرکزوں سے تمام ولایت کا مؤثر دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ شاہراہ کشمیر کی حفاظت بھی کی جا سکتی تھی۔ تحصیل ہری پور کے علاقے میں تو ربیلہ (تربیلا) اور مانکرائے فوجی مرکز تھے۔

گزشتہ اوراق میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ علاقہ ترک مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو دھرم اور بدھ مت کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے حملوں تک یہاں سنسکرت زبان سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ یہاں حکمرانی کا منصب کھشتری ذات کے افراد کے پاس تھا۔ بیرونی حملہ آور باشندے بھی رفتہ رفتہ اسی کھشتری ذات میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں کے باشندے حکمرانوں

کے لئے راجہ یا مہاراجہ کا لقب استعمال کرتے تھے۔ چھوٹے راجاؤں کے لئے رانا اور راسے کے القابات استعمال ہوتے تھے۔ چونکہ یہاں کے باشندے حکمران کے لئے راجہ کے لقب کے علاوہ کسی اور لقب سے آشنا نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ترک خوانین یا سلاطین کے لئے بھی راجہ کا لقب استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اس لقب کا استعمال اور زیادہ ہو گیا۔ اکبر کے جیلے اسے جگت گرو کے لقب سے پکارتے تھے۔ ہزارہ میں اب بھی ترکوں اور گکھڑوں کو راجے یا راجہ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ترکوں کے شجرہ نسب اور کتب تاریخ میں اُن کے لئے راجہ کا لقب استعمال نہیں کیا گیا، لیکن عوامی زبان میں وہ پہلے کی طرح اب بھی راجے ہی کہلاتے ہیں۔

۱۳۹۹ء سے ۱۴۷۲ء تک تقریباً ۷۰ سال کے طویل عرصے میں ترک بڑے اس اور چین کے ساتھ اس ملک پر حکمرانی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں لودھیوں کا اقتدار قائم ہوا۔ پندرھویں صدی کے نصف کے قریب ظہیر الدین بابر کے چچا الغ بیگ مرزا نے جو کہ کابل کا حکمران تھا۔ یوسف زئیوں کو جبر و تشدد کے ذریعے افغانستان کے علاقے سے باہر نکال دیا۔ یوسف زئی دلازاکوں کے تعاون سے سوات اور مردان کے علاقے میں آباد ہونے شروع ہوئے۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے سوات کے قدیم باشندوں اور تنولیوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اسی دباؤ سے تنگ آکر یہ قدیم باشندے نئے مسکن کی تلاش میں پنجاب کی طرف آنے لگے۔ تنولی اس زمانے میں مہابن کے علاقے میں رہتے تھے۔ انہوں نے چار ہزار کی تعداد میں مولوی ابراہیم لودھی کی قیادت میں دریائے سندھ کو عبور کر کے موجودہ علاقہ تناول پر یلغار شروع کر دی۔ تاریخ تناولیاں اور ہزارہ گزیٹیئر کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنولیوں کی یہ یلغار ۱۴۷۲ء میں ہوئی اور انہوں نے علاقہ تناول کے بعض دیہات ترکوں سے چھین لئے۔ تنولیوں کی اصل اور ان کی آمد کے تفصیلی حالات آئندہ صفحات میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ تنولی تقریباً چار ہزار کی تعداد میں علاقہ تناول میں آباد ہو گئے۔

قریب تھا کہ تنولیوں کی اس یلغار کے بعد ارد گرد کی کوئی مضبوط ریاست اس ملک پر حملہ کر کے ترکوں سے بقیہ علاقہ بھی چھین لیتی، لیکن ان کی خوش قسمتی سے اسی آڑے وقت میں ایک ایک تیموری شہزادہ بابر مرزا ولایت پکھلی میں داخل ہوا۔ ترکوں نے اپنے اس شہزادے کی آمد

کو غنیمت سمجھا اور وہ اتفاق کر کے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ بابر میرزا نے ان ترکوں کو منظم کیا۔ اس نے گلی باغ کے قصبے کو وسعت دے کر اس میں قلعہ فیروزہ تعمیر کروایا اور شاہ الدین کے لقب سے اس ملک کا پہلا آزاد حکمران بنا اور بابر میرزا نے نہ صرف تنولیوں یا دریائے سندھ کے اس پار سے آنے والے دوسرے قبائل کی پیش قدمی کو روک دیا۔ بلکہ علاقہ تناول پر دوبارہ اپنی بالادستی قائم کر دی۔ بابر میرزا نے سب سے زیادہ توجہ علاقہ تناول ہی کو دی اور اس کے تمام اہم ناکوں پر فوجی چوکیاں قائم کر دیں۔ اس طرح اس ملک پر ترکوں کی حکمرانی کا ایک نیا اور شاندار دور شروع ہوا۔

٭

امیر تیمور سے سلطان ابو سعید تک

امیر تیمور ۱۴۰۵ء میں اُس وقت فوت ہوا، جبکہ وہ چین پر حملہ کرنے کے دیرینہ منصوبے پر عمل پیرا ہونے لگا تھا۔ اس عظیم فاتح کی وفات کے بعد اس کی وسیع سلطنت آلِ تیمور کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے چار بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں، مرزا جہانگیر، مرزا شاہرخ، عمر شیخ مرزا اور میراں شاہ۔ میراں شاہ عراقین، آذربائیجان، دیار بکر اور شام کا حکمران تھا، لیکن وہ ۸۱۵ھ ہی وہ فوت ہو گیا، اسی طرح مرزا جہانگیر اور مرزا عمر شیخ بھی امیر تیمور کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ امیر تیمور امیر زادہ سلطان محمد کو اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ بھی اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا۔ آخر کار امیر تیمور نے اپنے پوتے پیر محمد ابن جہانگیر کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ پیر محمد ابن جہانگیر والیٔ کابل و ہندوستان تھا۔ اس کے عہد میں نہ صرف پچھلی بلکہ تمام ہندوستان میں بھی اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری تھا۔ اگر تیموری شہزادے اس کی حکمرانی پر متفق ہو جاتے تو ان کی تاریخ کا رُخ کچھ اور ہی ہوتا، لیکن انہوں نے تخت کے لئے خانہ جنگی کی ایک ایسی بُری مثال قائم کر دی جو اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے نمونہ بن گئی۔ تقریباً ہر تیموری شہزادے کے پیشِ نظر تخت یا تختہ کا نصب العین تھا۔ بھائی بھائی کا سب سے بڑا دشمن بن گیا اور یہ سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر بلکہ اس کے بعد تک بھی جاری رہا۔ اسلام ملوکیت یا شہنشاہیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا، اس لئے اسلامی نظام میں وراثتِ تخت کا کوئی قانون نہ تھا؛ لہٰذا تیموریوں کے درمیان تخت کا فیصلہ ہمیشہ تلوار ہی کے ذریعے ہوتا رہا۔

نامزد حکمران پیر محمد ابن جہانگیر نے کابل ہی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا، لیکن خلیل سلطان

ابن میراں شاہ نے سمرقند کے دارالحکومت پر قبضہ کر کے تمام خزانہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ پیر محمد کابل سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا، لیکن نصیف کے قریب شکست کھا کر اسے واپس لوٹنا پڑا۔ بالآخر اپنے دغاباز وزیر علی تازنے اسے دھوکے سے ۱۴۰۷ء میں قتل کرا دیا۔ اُدھر شمال کی طرف سے شیخ نورالدین اور دوسرے باغی سرداروں نے سمرقند پر چڑھائی کر دی۔ خلیل سلطان کے سردار خفیہ طور پر ان سے مل گئے؛ لہذا لڑائی میں خلیل سلطان گرفتار ہو گیا، مگر شاہرخ نے جو اس وقت ہرات میں تھا، آگے بڑھ کر خلیل سلطان کو باغیوں سے چھڑا لیا۔ خلیل سلطان ۱۴۰۹ء میں فوت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی علاؤالدولت پسر بایسنغر مرزا نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ الغ خان پسر شاہرخ نے جیحوں کے علاقے سے پلٹ کر علاؤالدولت پر حملہ کر دیا اور فتح پانے کے بعد ہرات پر قبضہ کر لیا، مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اس کا اپنا بیٹا عبداللطیف باغی ہو گیا اور اس طرح وہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا۔

سلطان محمد ابن میراں شاہ سمرقند میں اپنے بھائی کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس سلطان محمد کے دو بیٹے تھے۔ ایک منوچہر مرزا اور دوسرا ابوسعید مرزا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے ابوسعید مرزا اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لئے اس نے اقتدار کی کشمکش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ابوسعید مرزا نے اپنے جدِ امجد امیر تیمور کے بیشتر مفتوحہ علاقے فتح کر لئے اور تاریخ میں ابوسعید سلطان کے نام سے مشہور ہوا۔ خانہ جنگی پر قابو پانے اور اندرونی جھگڑے طے کرنے کے بعد ابوسعید سلطان نے چنگیزی خاندان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت مغولستان میں یونس خان، چنگیز خان کی اولاد میں وراثتاً حکمران تھا۔ اگرچہ یونس خان کوئی طاقتور حکمران نہ تھا، لیکن چنگیزی خاندان کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے اسے منگولیا میں باوقار مقام حاصل تھا۔ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی صورت یہ ہوئی کہ ابوسعید سلطان نے اپنے تین بیٹوں سے یونس خان کی تین بیٹیاں بیاہ لیں۔ ابوسعید سلطان کے ایک بیٹے عمر شیخ مرزا کی بیوی قتلق نگار خانم اسی یونس خان کی بیٹی تھی، اسی کے بطن سے ظہیرالدین بابر پیدا ہوا، اس طرح بابر کی رگوں میں ایشیا کے دو عظیم فاتحین چنگیز خان اور امیر تیمور کا خون گردش کر رہا تھا۔

تیموریوں کا زوال:

ابوسعید سلطان ۸۷۳ھ میں آذربائیجان کے حاکم اوزون حسن مرزا کے ہاتھوں شہید ہوا۔ ابوسعید سلطان کے کل گیارہ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: ۱ سلطان احمد میرزا، ۲ سلطان محمد مرزا، ۳ شاہرخ مرزا، ۴ محمود مرزا، ۵ سلطان میرزا، ۶ الغ بیگ میرزا، ۷ عمر شیخ مرزا، ۸ ابوبکر مرزا، ۹ عمر مرزا، ۱۰ سلطان مراد اور ۱۱ خلیل سلطان۔

توزکِ بابری میں ظہیرالدین بابر عموماً اپنے چار حقیقی چچاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ ابوسعید سلطان نے اپنے بیٹوں میں سے الغ بیگ کو کابل کا حکمران بنا دیا تھا اور سلطان احمد، سلطان محمد اور عمر شیخ کو دوسرے علاقوں پر حکمران بنا دیا تھا۔ ان چار بھائیوں کے علاوہ دوسرے بھائی حکمرانی کا داعیہ نہیں رکھتے تھے۔

ابوسعید سلطان کی شہادت کے بعد خانہ جنگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مغولستان کی سرحدوں سے لے کر ہندوستان کی سرحدوں تک حالت یہ تھی کہ تیموری شہزادے ہر جگہ ایک دوسرے سے مشت و گریبان تھے۔ ہر جگہ شورش اور ہنگامے بپا تھے۔ تیموریوں کی اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر اوزبک سردار بھی قسمت آزمائی کے لئے میدان میں نکل آئے۔ شیبانی محمد خان اوزبک نے تیموریوں کے خلاف یلغار شروع کر دی۔ اس نے ۱۵۰۰ء میں ظہیرالدین بابر سے سمرقند کا دارالحکومت چھین لیا۔ اس سن سے قبل وہ کم از کم بارہ تیموری شہزادوں کو قتل کر چکا تھا۔ سمرقند کی فتح نے تیموری سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اس فتح کے بعد شیبانی محمد خان اوزبک علاقوں پر علاقے فتح کرتا ہوا تمام ترکستان پر چھا گیا۔ ۱۵۰۵ء میں اس نے تیموریوں سے فیصلہ کن ٹکر لی جو سلطان حسین میرزا کے تحت جمع ہو کر اس کے مقابلے پر نکل آتے تھے، لیکن اتفاق سے سلطان حسین مرزا فوت ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی تیموریوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اس کے جانشینوں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ اس طرح شیبانی محمد خان اوزبک نے آلِ تیمور کو مغلوب کر لیا۔ اگر تیموریوں میں ظہیرالدین بابر پیدا نہ ہوا ہوتا تو شاید ان کی تاریخ اسی وقت سے ختم ہو گئی ہوتی۔ تیموریوں کی اس بھگدڑ اور انتشار کے زمانے میں ابوسعید سلطان کا ایک ایک پوتا بابر ابن عمر میرزا ولایتِ پچھلی میں داخل ہوا۔ یہاں قرلق ترک تولیوں کی پیش قدمی کی وجہ سے پریشان حال تھے، لہٰذا انہوں نے بلا حیل و حجت اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا اور وہ شہاب الدین کے لقب سے اس ملک کا حکمران بن گیا۔

توران کی طرح ہندوستان کے حالات بھی ابتر تھے۔ تیموری حملے کے بعد ہندوستان بھر میں کوئی مضبوط حکمران باقی نہ رہا تھا، جس طرح توران میں مُغل اوزبک اور تیموری سردار ایک دوسرے سے مُشت و گریبان تھے۔ اسی طرح یہاں ترک، افغان اور راجپوت سردار ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی برتری کے لئے جدّ و جہد کر رہا تھا۔ خضر خان نے کچھ عرصہ تک امیر تیمور اور پیر محمد ابن جہانگیر کے ناموں کا خطبہ و سکّہ دہلی اور ملتان میں جاری رکھا، لیکن تیمور کی وفات اور پھر پیر محمد کی وفات کے بعد خضر خان نے اپنے نام کا خطبہ و سکّہ جاری کر دیا، مگر وہ کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکا۔ سلطان محمود قنوج سے واپس لوٹا، دوبارہ اس کی تاجپوشی بھی کی گئی، لیکن ۸۱۵ھ میں اس کی وفات کے ساتھ ہی ہندوستان میں ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی کا خاتمہ ہو گیا۔ اب صرف لودھی افغان اور راجپوت دو ہی طاقتیں یہاں باقی رہ گئی تھیں۔ شمالی پاکستان میں پکھلی، بھیرہ اور چینوٹ وغیرہ کے علاقے ترکوں کی ملکیت میں باقی بچ گئے۔

لودھی خاندان کی اصل کے متعلق مشہور افغان روایت، جس کا تذکرہ تقریباً تمام افغان مؤرخین نے کیا ہے، یہ ہے کہ وہ مسماۃ متو بی بی دُختر بتان افغان کی اولاد سے ہیں۔ باپ کی طرف سے وہ شاہ حسین غوری کی اولاد ہیں جو علاقہ غور سے نکل کر بتان افغان ہی کے پاس سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ چونکہ اس کی اولاد افغانوں ہی میں پھلی پھولی، اس لئے وہ افغان ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بہلول لودھی، سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی اس خاندان کے مشہور حکمران تھے۔ پنجاب اور دہلی پر انہی کی حکمرانی قائم تھی، مگر وہ پکھلی یا کشمیر پر قبضہ نہ کر سکے اور ان کے اثرات جہلم سے آگے نہ بڑھ سکے۔

کشمیر میں سکندر بت شکن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہی خان تخت نشین ہوا اور اُس نے زین العابدین لقب اختیار کیا۔ ہندو اسے بڈشاہ اور مسلمان بڈشاہ پکارتے تھے۔ چونکہ یہ کشمیری حکمران مسلسل سات برس تک سمرقند میں تیموری دربار میں رہ چکا تھا، اس لئے اس نے نہ صرف اصولِ حکمرانی سیکھے، بلکہ اُس نے وہاں کے ترقیاتی کارناموں کے بارے میں بھی وسیع معلومات حاصل کیں۔ اس کی یہی معلومات کشمیر میں علمی اور معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ بنیں۔ کشمیر کا اندرونی نظم و نسق بحال کرنے کے بعد بڈشاہ نے دریائے جہلم سے

آگے بڑھ کر علاقہ گکھڑ پر بھی اپنی بالادستی قائم کر دی۔ اس نے بہلول لودھی کے ساتھ ایک خوں ریز جنگ لڑی اور آخر کار یہ طے پایا کہ سرہند تک کا علاقہ بڈشاہ کے تحت رہے گا۔ کشمیر کی تاریخ میں بڈشاہ کو وہی مقام حاصل ہے جو تاریخِ ہند میں اکبر بادشاہ کو حاصل ہے۔ بہلول لودھی کے ساتھ بدشاہ کی کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ لودھی حکمرانوں نے علاقہ گکھڑ سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہ کی۔ ظہیرالدین بابر کی آمد تک حالات اسی طرح چلتے رہے۔

❖

تنولی

تنولیوں کی اصل :

بعض کتابوں میں لفظ تنولی کو ترنولی بھی لکھا گیا ہے، لیکن عام طور پر یہ قوم تنولی ہی مشہور ہے۔ درانیوں کے عہد سے قبل ہزارہ قدیم یعنی ولایت پکھلی میں تنولی موجود تھے۔ لیکن ان کی اصل کے بارے اس دور کے کسی مسلمان مورخ نے کچھ نہیں لکھا؛ لہذا ہماری معلومات کا زیادہ تر انحصار انگریز مصنفین ہی کی فراہم کردہ معلومات پر ہے۔ میں نے جن انگریز مصنفین کی تحریریں مطالعہ کی ہیں، ان میں الفنسٹن ایلٹسن، سر اولف کیرو، لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی، ٹوڈ اور کیپٹن ویس مصنف تاریخ ہزارہ شامل ہیں۔ مسلمان مصنفین میں سے سید مراد علی شاہ کی تاریخ تناولیاں، تواریخ حافظ رحمت خانی اور ڈاکٹر شیر بہادر خان کی تاریخ ہزارہ بھی شامل ہے۔ مجھے تنولیوں کے تین شجرے بھی دستیاب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک سید مراد علی شاہ، دوسرا سید عمران شاہ اور تیسرا سردار محمد ایوب خان ریٹائرڈ سیشن جج آزاد کشمیر کا شائع کردہ ہے۔ علاوہ ازیں میں نے علاقہ تناول کی بعض صورت دیہوں اور مالکان دیہات کے شجروں کا بھی ملاحظہ کیا ہے۔ ان شجروں کا ایک جائزہ مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیا جا رہا ہے۔

تنولیوں کی اصل کے بارے میں ایک مشہور روایت جس کا ذکر سید مراد علی شاہ اور تاریخ ہزارہ میں موجود ہے، یہ ہے کہ تنولیوں کے آباؤ اجداد افغانستان کے ایک درہ نانال نامی کے رہنے والے تھے اور وہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اس درے سے نکل کر علاقہ سوات میں داخل ہوئے۔ طویل عرصے تک ان کے آباؤ اجداد سوات پر حکمرانی کرتے رہے اور پھر رفتہ رفتہ علاقہ مہابن میں آباد

ہو گئے۔ کئی پشتیں علاقہ مہابن میں گزارنے کے بعد وہ پندرھویں صدی عیسوی میں دریائے سندھ کو عبور کر کے ولایت یکھلی کے اس علاقے میں داخل ہوئے جس کا نام اب تناول ہے۔ یہ علاقہ انہوں نے ترکوں سے بزورِ شمشیر چھینا۔ تاریخ ہزارہ میں زبردست خان عرف صوبہ خان تنولی کا یہ بیان موجود ہے کہ وہ نسلاً مغل برلاس تھا۔

مگر مشکل یہ ہے کہ مندرجہ بالا روایت تاریخی حقائق کی روشنی میں قابل اعتماد نہیں ٹھہرتی۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایراد چی امیر تیمور کا ساتواں دادا تھا۔ اسی کی اولاد برلاس مشہور ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ترکوں یا مغلوں میں کوئی دوسرا ایسا برلاس نہیں گزرا جو تاریخی شہرت کا مالک ہوا ہو یا جس کے نام سے قبیلہ برلاس وجود میں آیا ہو۔ اب اگر ہم ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کے مطابق چار پشت فی صدی کا حساب لگا کر دیکھیں تو ایراد چی برلاس کو ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ زندہ موجود ہونا چاہیئے۔ اس میں چند سالوں کی کمی یا بیشی ہو سکتی ہے اور پھر اس کے بعد ہی قبیلہ برلاس وجود میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہم سب یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے پہلی بار ۱۰۰۱ء میں پشاور پر حملہ کیا تھا؛ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ برلاس قبیلہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں موجود ہو سکتا ہے۔ اس روایت سے تو یہ ماننا پڑ گیا کہ ایراد چی برلاس کی پیدائش سے بہت پہلے تنولی علاقہ افغانستان میں موجود تھے۔ اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ترکوں سے علاقہ تناول چھیننے کے بعد تنولیوں نے اس علاقے کا تناول نام رکھا۔ سوال یہ بھی ہے کہ آخر سوات کا یا مہابن میں بھی تو اس روایت کے مطابق تنولیوں کے کئی حکمران گزرے تھے تو انہوں نے مہابن یا سوات کا نام تناول کیوں نہ رکھا، جس وقت تنولی پہلی بار پندرھویں صدی میں علاقہ تناول میں داخل ہوئے، اس وقت ان کا سربراہ مولوی ابراہیم لودھی تھا۔ لیکن جیسا کہ آئندہ سطور کے مطالعہ سے واضح ہوگا تنولی اس وقت یہاں حکمرانی نہیں کر سکے، بلکہ کچھ ہی عرصہ بعد تیموری شہزادے بابر میرزا نے انہیں پھر ترکوں کا مطیع بنا لیا تھا۔ سوات کی تاریخ میں جہانگیری سلاطین کا نام موجود ہے، لیکن کسی تنولی حکمران کا ذکر نہیں ملتا۔

ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کے عنوانات کے تحت گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے قبل افغانستان اور سرحد کا تمام علاقہ صدیوں سے بدھ مت

کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ تناول، مہابن، سوات اور کابل کے دین و مذہب میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ کابل اور لاہور تحصیل صوابی دونوں ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ کے بدھ اور ہندو حکمرانوں کے مرکزی مقامات تھے۔ لہذا تنولیوں کو موجودہ تناول کی بجائے اگر دتہ تانال سے نسبت دے بھی دی جاتے تو اس سے ان کی اصل میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں پیدا ہوگا۔

زبردست خان عرف صوبہ خان کے بیان کو اگر سید مراد علی شاہ کی تاریخ سے ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زبردست خان کے جدِ امجد کا نام امیر خان بیردیو تھا۔ ان بیردیو صاحب کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: پال، ہند، ٹھاکر، کل، بھوج اور ارجن (ارجن کو علاقہ مہابن میں ارگن پکارا جاتا ہے جیسا کہ جدون کو گدون) بغیر کسی گہرے غور و فکر کے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سب کے سب ہندوانہ ہیں۔ سید مراد علی شاہ صاحب جنہیں نواب صاحب امب نے تاریخ تناولیاں مرتب کرنے پر مامور کیا تھا، فرماتے ہیں کہ بیردیو کا اصل نام امیر خان تھا، لیکن ان کی والدہ لاڈ پیار سے انہیں بیردیو پکارا کرتی تھی، اس لئے وہ بیردیو مشہور ہوتے، مگر ان کی یہ توجیح بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ ہندی زبان میں پیر بیٹے کو نہیں بھائی کو پکارا جاتا ہے۔ اب بھی ہزارہ میں بہنیں بھائیوں کو ویر یا بیر کہہ کر پکارتی ہیں۔ بیردیو کے چھ بیٹوں کے ناموں پر اب بھی تنولیوں کے چھ قبیلے موجود ہیں۔ پال سے پلال، ہند سے ہندوال، ٹھاکر سے ٹھاکریال، کل سے کلوال، بھوج سے بھجیال اور ارگن سے ارگنال، چونکہ یہ تمام تنولی قبیلے علاقہ تناول میں اب بھی موجود ہیں، لہذا ان کے نام ان کی اصل پر دلالت کر رہے ہیں۔ ان چھ تنولی قبیلوں میں سے پلال اور ہندوال زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی شہرت کی بنا پر مورخین نے بالعموم دوسرے قبائل کو کافی حد تک نظر انداز کئے رکھا ہے۔ ہندوالوں میں سے زیادہ معتبر قبیلہ جمال ہے جو چریال، لدھیال اور ابدوال تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پلالوں میں لاجیال معتبر ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے اس علاقے میں اسلام کو غلبہ حاصل رہا ہے لہذا غلبہ اسلام کے اس دور میں یہ ممکن نہ تھا کہ مسلمان اپنے بچوں کے لئے ہندوانہ نام پسند کرتے البتہ اس میں شک نہیں کہ جو بیردیو اقوام زمانہ اسلام سے قبل اس علاقے میں آکر اس تہذیب میں مدغم ہو گئی تھیں، ان کے نام ہندوانہ تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تنولیوں نے ہمیشہ کاغذات مال میں اپنی قوم تنولی ہی درج کرائی ہے اور اسی نام سے وہ ہمیشہ مشہور رہے ہیں

سیّد مراد علی شاہ کے علاوہ تنولیوں کا ایک اور شجرہ نسب سیّد عمران شاہ ساکن ترپی نے سیّد ہدایت کی کتاب دوازدہ امام میں نقل کیا ہے۔ اس شجرہ میں امیر خان بیردیو کو برلاس بن سلطان لاہر بن سلطان یحییٰ بن سلطان بن خلیفہ مامون الرشید سے جوڑا گیا ہے۔ سیّد صاحب کا بیان ہے کہ برلاس کی جاتے پیدائش مصر ہے اور ان کی قبر مشہد میں ہے۔ گویا کہ اس شجرہ نسب کی رو سے تنولی مغل برلاس نہیں، بلکہ عباسی ٹھہرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ سیّد صاحب نے یہ شجرہ نسب کسی مستند حوالے سے نہیں بیان کیا۔ اس کی تائید ایران، خراسان یا افغانستان کی کسی تاریخ سے نہیں ہوتی۔ چار پشت فی صدی کے حساب پر بھی یہ شجرہ برابر نہیں اُترتا؛ لہٰذا اسے قابلِ اعتماد تسلیم کر لینے کی کوئی مضبوط دلیل نظر نہیں آتی۔

تنولیوں کا ایک اور شجرہ نسب سردار محمد ایوب خان ریٹائرڈ سیشن جج صاحب آزاد کشمیر نے اپنے کتابچہ "عباسی شمال پاکستان میں" کے اندر بیان کیا ہے۔ ڈھونڈ قوم کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کتابچہ پر ایک تبصرہ کیا جا چکا ہے، جس سے اس کی صحت مشکوک ثابت ہوتی ہے۔ سردار محمد ایوب صاحب کا بیان یہ ہے کہ ڈھونڈ خان، تنولی خان اور سراڑہ خان تین بھائی تھے اور گاہی خان ابن ضراب خان عباسی کی اولاد تھے۔ اس طرح سردار صاحب ان تینوں قبیلوں کو ایک ہی فرد کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ قطع نظر ان دیگر وجوہ کے جو گزشتہ اوراق میں بیان کر دی گئی ہیں۔ یہ شجرہ نسب اس لحاظ سے بھی قابل اعتماد نہیں کہ جس زمانے میں سردار صاحب نے تنولی خان کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں تاریخ ہزارہ، ہزارہ گزیٹیئر اور سیّد مراد علی شاہ کے بیانات کے مطابق تنولی چار ہزار کی تعداد میں علاقہ مہابن سے نکل کر علاقہ تناول میں آباد بھی ہو چکے تھے۔ تنولیوں کی آمد کے حالات آگے بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا۔ سردار محمد ایوب صاحب کا بیان کردہ شجرۂ نسب کہاں تک قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ سردار صاحب نے ان تینوں قبائل کو عباسی قرار دے کر ان کا جو شجرہ نسب اپنے کتابچے میں بیان کیا ہے۔ اس میں کئی ہندوانہ نام چند، رتن، ڈمٹ، رائے سپ، [illegible] بیان کئے ہیں۔ ان تمام ناموں پر بھی وہی سوال وارد ہوتا ہے کہ آخر کس مجبوری کی بنا پر تنولی خان کے ان ہندوؤں نے اپنے لئے ہندوانہ نام پسند کئے ہوں گے۔ دوسرے شجروں کی طرح یہ شجرہ بھی کسی تاریخی ریکارڈ کے حوالے سے نہیں بیان کیا گیا۔

صاف نظر آرہا ہے کہ یہ تینوں شجرے ایک دوسرے کی نقل ہیں اور ان کے بیان کرنے والوں نے ان کا ماخذ یا سند بیان نہیں کی۔ جو بات وثوق سے کی جا سکتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ تاریخ ہزارہ اور تاریخ تناولیاں مرتبہ سید مراد علی شاہ کا یہ بیان درست ہے کہ تنولی امیر خان بیر دیو کی اولاد ہیں اور ان کی بڑی بڑی چھ شاخیں امیر خان بیر دیو کے چھ بیٹوں کے ناموں پر ہیں۔ علاقہ تناول میں آنے سے قبل تنولی علاقہ مہابن میں آباد تھے۔ مہابن کی شمالی بلند چوٹی کو ارنوس یا پیر سر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پہاڑ تقریباً بارہ میل کے رقبے کو گھیرے ہوئے ہے اور سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے۔ دریائے سندھ سے اس کی اونچائی تقریباً پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس کے شمال میں سوات کی وادی موجود ہے۔ اس وادی کے ایک سرے پر بیر کوٹ کا وہ مشہور مقام بھی موجود ہے جس پر سے سکندرِ اعظم گزرا تھا۔ بیر کوٹ کے قریب ہی بازیرہ، اُورا، انورہ، اور امبولینا یا امب کی قدیم بستیاں بھی موجود تھیں۔ یونانی مؤرخین کی یادداشتوں میں بیر کوٹ کا نام نہیں، لیکن مندرجہ بالا دوسری بستیوں کے نام موجود ہیں۔ بیر کوٹ کا نام بہت بعد میں مشہور ہوا۔ ہندو یوگی مہابن کے تقدس کے قائل تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے اس پہاڑ کا نام مہابن رکھا ہوا تھا۔ اسی مہابن کے جنوب مغرب میں ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ گندھارا کے مرکزی مقامات منڈاؤلا، پور تحصیل صوابی بھی موجود تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد تک ہندو اور بدھ حکمرانوں کے یہ تمام قصبے آباد تھے۔ اس زمانے میں راجہ جے پال اس علاقے کا مشہور حکمران تھا اور اس علاقے میں سنسکرت کے علاوہ ارمڑی، گبری اور دری زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب تنولی علاقہ مہابن سے نکل کر موجودہ تناول کے علاقے میں آباد ہوتے تو انہوں نے اپنے قدیم قصبوں اور گاؤں کے ناموں پر امب، انورہ اور بازیرہ وغیرہ کے مواضعات آباد کئے ہوں گے۔ بعض مؤرخین کی رائے یہ بھی ہے کہ سکندرِ اعظم موجودہ امب سے ہی گزر کر کوہِ ارنوس کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا گیا تھا۔ سر اولف کیرو نے سکندرِ اعظم کے حملے کے راستے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مندرجہ بالا قصبے اور گاؤں علاقہ سوات میں موجود تھے۔ اگر اس تحقیق کو درست تسلیم کیا جائے، تو پھر یہی ماننا پڑے گا کہ تنولیوں نے علاقہ تناول میں آباد ہونے کے بعد اپنے قدیم قصبوں اور گاؤں کے ناموں پر امب، انورہ جیسے نئے گاؤں آباد کئے ہوں گے۔ یہ گاؤں اب بھی تناول اور تحصیل بری پور کی تناولی سرحد پر موجود ہیں۔

جہاں تک انگریز مصنفین کا تعلق ہے، انہوں نے بالاتفاق تنولیوں کو ہندی الاصل باشندے قرار دیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل وائکلی Lt Col. Wikeley نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہندو شاہیہ گندھارا کے راجہ جے پال کے خاندان میں سے ایک معتبر حکمران راجہ مل تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے میں اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے گلے سے جنجو اتار کر توڑ دیا گیا اور اسی وجہ سے وہ جنجوعہ مشہور ہوا اور اس کے بعد اس کی اولاد بھی جنجوعہ مشہور ہوئی۔ راجہ مل کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں، ویر، جودھ، ککھا، ترنولی، دیو چاڑہ اور کالا۔ وائکلی لکھتا ہے کہ تنولی راجہ مل کے چھ بیٹوں میں سے ترنولی کی اولاد ہیں اور اسی لئے وہ ترنولی یا تنولی مشہور ہوتے ہیں، مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ خود تنولی اس روایت کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

اگر لیفٹیننٹ کرنل وائکلی کی مندرجہ بالا تاریخی روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تنولی دسویں صدی عیسوی ہی میں اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کا نسبی تعلق ہندو شاہیہ گندھارا کے پال حکمرانوں کے ساتھ ہے۔ اس لحاظ سے امیر خان بیر دیو کے نام کی یہ توجیح بھی قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ بیر دیو کا اسلامی نام امیر خان رکھا گیا ہوگا۔ اگر یہاں گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی۔ ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کی بدھ اور ہندو سلطنتوں کی اصل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ہر دو سلطنتیں تاتاری الاصل تھیں۔ ترکی شاہیہ کے بدھ حکمرانوں کا دعویٰ تھا کہ وہ ترکستان کے علاقہ کشنیا کے کُشن حکمرانوں کی اولاد سے ہیں۔ ہندو شاہیہ گندھارا کا مورثِ اعلیٰ کلر ترکی شاہیہ کابل کے آخری حکمران کا وزیر تھا اور اُس نے دھوکے سے اپنے بادشاہ کو قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ کلر نسلاً مغل یا تاتاری تھا۔ زمانۂ قبل از اسلام میں یہ تاتاری حکمران بُدھ مت قبول کر کے ہندی تہذیب کو اپنا چکے تھے؛ لہٰذا اگر مصنفین کا یہ کہنا درست ہے کہ تنولی ہندی الاصل ہیں تو پھر یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ وہ نسلاً تاتاری ہیں۔ تنولیوں کی زبان عرصۂ دراز سے ہندکو ہے اور کسی مصنف نے بھی ان کا شمار پختون قبائل میں نہیں کیا۔

لہ پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل وائکلی صفحہ ۵۶ "جنجوعہ"

جہاں تک ہنولیوں کے علاقہ سوات پر حکمرانی کرنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ شہنشاہ اکبر ۱۵۱۹ء تک علاقہ سوات اور باجوڑ کو مسخر کر چکا تھا۔ اس کی سے قبل سوات اور باجوڑ کے علاقے میں گبری جہانگیری سلاطین حکمرانی کر رہے تھے۔ ان سواتی حکمرانوں کا اقتدار کم از کم چار پشتوں سے قائم تھا۔ اس زمانے میں تنولی مہابن ہی کے علاقے میں آباد تھے۔

❖

تنولیوں کی آمد

پندرھویں صدی کے نصف کے قریب ظہیر الدین بابر کے چچا میرزا الغ بیگ ثانی حاکم کابل نے جبر و تشدد کے ذریعے یوسف زئیوں کو افغانستان کے علاقے سے باہر نکال دیا تھا۔ اور وہ وادی پشاور کے علاقے میں دلازاکوں سے پناہ مانگ کر یہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ جوں جوں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، وہ یہاں پہلے سے موجود باشندوں سے ان کے علاقے چھینتے چلے گئے۔ سواتی، تنولی، دلازاک اور ترکانڑی قبائل پر یوسف زئیوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ تنولی یوسف زئیوں کے دباؤ سے تنگ آکر نئے مسکن کی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے۔ کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے مولوی ابراہیم لودھی کو اپنا رہنما منتخب کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ولایت پکھلی کے علاقے پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس زمانے میں تنولیوں کے اپنے دو قبائلی سردار تھے جن میں سے ایک کا نام چاڑہ اور دوسرے کا نام مہار تھا۔ ۱۴۷۲ء میں تنولیوں نے چار ہزار کی تعداد میں مولوی ابراہیم لودھی کی سرکردگی میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور علاقہ تناول میں آگے بڑھ آئے۔ سید مراد علی شاہ کا بیان ہے کہ پکھلی خاص سے ترکوں نے ایک لشکر تنولیوں کی یلغار کو روکنے کے لئے روانہ کیا، مگر تنولیوں نے ترک لشکر کو شکست دے کر تناول کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور یہیں آباد ہو گئے۔ یہ ہزارہ قدیم میں تنولی کی پہلی آمد تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت دہلی کا اقتدار لودھیوں کو منتقل ہو چکا تھا اور تیموری شہزادے توران میں خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ پکھلی کے ترک جنہیں امیر تیمور نے ۱۳۹۹ء میں یہاں آباد کیا تھا، اپنے مرکز سے کٹ چکے تھے اور اپنے بڑے خان یا قاغان کی ماتحتی میں ولایت پکھلی پر حکمرانی کر رہے تھے۔ تنولیوں کی اسی پہلی آمد کے سلسلے میں ہزارہ گزیٹیئر ۱۹۰۸-۰۹ء میں لکھا ہے:

"Tanolis seem to have come to the country some 400 years ago, gradually spreading themselves over the lands at present accupied by them. For 11 generations or till the time of one Haibat Khan they had no head".

ترجمہ: تنولی چار سو برس پہلے اس علاقے میں آتے دکھائی دیتے ہیں جن پر اب ان کا قبضہ ہے رفتہ رفتہ وہ اپنے موجودہ علاقے تک پھیلتے چلے گئے۔ گیارہ پشتوں تک گویا کہ ہیبت خان کے زمانے تک ان کا اپنا کوئی قبائلی سردار نہ تھا۔

ہزارہ گزیٹیر کے اس بیان سے سید مراد علی شاہ کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ ۱۸۸۳ء سے چار سو برس پہلے یعنی ۱۴۷۲ء کے لگ بھگ تنولی علاقہ مہابن سے نکل کر علاقہ تناول میں داخل ہوئے اور ترکوں سے کچھ علاقہ چھین کر یہیں سکونت پذیر ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ موجودہ تناول کے علاقے پر قابض ہو گئے۔ تنولیوں کی آمد کے سلسلے میں تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کا بیان ہے:

"امیر خان (بیر دیو) کی پندرھویں پشت میں اب نواب صاحب ہیں۔ امیر خان ایک لڑائی میں سواتھ (سوات) میں مارا گیا۔ دو فرزند اس کے پال و ہند اس ملک میں آئے۔"

تاریخ ہزارہ کے اس بیان کو اگر چار پشت فی صدی کے حساب سے دیکھا جائے تو تنولیوں کی آمد کا زمانہ تقریباً وہی بنتا ہے جو ہزارہ گزیٹیر اور تاریخ تناولیاں مصنفہ سید مراد علی شاہ میں بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ ہزارہ میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ امیر خان کس سے لڑائی کرتا ہوا سوات میں مارا گیا۔ اسی تاریخ ہزارہ میں آگے چل کر مزید بیان کیا گیا ہے:

---

[1] ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء صفحہ ۳۹، ۳۸

[2] تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس ۱۸۷۲ء صفحہ ۹۶۸

"ہندو خان[1] سے لے کر گیارھویں پشت ہیبت خان تک صرف ملکی ان کے گھر کی رہی، کوئی خان نہ ہوا اور نہ کوئی گاؤں یا علاقہ دستار خان کے ہیں علیحدہ برادری نے کیا ہوا تھا۔"

ہزارہ گزیٹیر میں ہیبت خان تنولی کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"Habit Khan became Khan of Tapa Hindwal and entertained 50 horsemen and 100 foot. He died about 1083 A. D."

ترجمہ: ہیبت خان تپہ ہندوال کا خان بنا، اس کے پاس پچاس سوار اور ایک سو پیادہ تھے، وہ تقریباً ۱۰۸۳ء میں فوت ہوا۔

مندرجہ بالا کتب تاریخ کے اقتباسات سے تنولیوں کی پہلی آمد کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تنولیوں کا پہلا گروہ چار ہزار کی تعداد میں مولوی ابراہیم لودھی کی سرکردگی میں ۱۴۷۲ء کے لگ بھگ علاقہ تناول میں داخل ہوا۔ اس وقت ان کے قبائلی سردار چاڑہ اور ممارہ نامی دو افراد تھے۔ اس کے بعد دوسرا گروہ ایک خان بیر دیو کی اولاد میں سے پال اور بندو نامی دو افراد کے ساتھ علاقہ تناول میں داخل ہوا لیکن علاقہ تناول میں داخل ہونے کے بعد مسلسل گیارہ پشتوں تک ان کا کوئی سربراہ یا خان نہ تھا۔ ہیبت خان تپہ ہندوال میں تنولیوں کا پہلا خان بنا جس کی وفات کا ۱۰۸۳ء ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سلطنتِ مغلیہ کے دور میں تنولی ایک آزاد یا منظم قبیلہ کی حیثیت سے موجود نہ تھے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ تنولیوں نے مولوی ابراہیم لودھی کی سرکردگی میں دریائے سندھ کو پار کر کے علاقہ تناول کے بعض دیہات ترکوں سے بزورِ شمشیر چھین لئے تھے، لیکن اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک تیموری شہزادہ بابر مرزا ولایت پکھلی میں داخل ہوا اور یہاں کے فرق ترکوں نے اپنے

---

[1] تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویلس ۱۸۷۲ء صفحہ ۹۶۸

[2] ہزارہ گزیٹیر ۱۸۰۳-۰۴ء صفحہ ۳۹

اس شہزادے کی آمد کو غنیمت سمجھ کر اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ بابر مرزا نے شہاب الدین لقب اختیار کیا اور گلی باغ کو اپنا دارالریاست بنا کر تمام ولایت پکھلی پر حکمرانی کرنے لگا، جیسا کہ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا شہاب الدین بابر نے دریائے سندھ تک تمام ولایتِ پکھلی پر دوبارہ ترکوں کا اقتدار بحال کر دیا تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد تک علاقہ تناول ولایتِ پکھلی یا پکھلی سرکار کا ایک حصہ بنا رہا اور اس کی حکمرانی کا منصب شہاب الدین بابر کی اولاد کے پاس رہا۔ سلطنتِ مغلیہ کا تمام تاریخی ریکارڈ جس میں اکبر نامہ، آئینِ اکبری، توزکِ جہانگیری، سیر المتاخرین، شاہ جہان نامہ جیسی کتب تاریخ شامل ہیں، ثابت کرتا ہے کہ اس دور میں علاقہ تناول پکھلی سرکار میں شامل تھا اور اس کا صدر مقام گلی باغ تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنتِ مغلیہ روبہ زوال ہوئی۔ علاقہ تناول کی پاسبانی کے لئے ترکوں نے تحصیل بٹ گراں کے علاقہ چھالجل میں ایک قلعہ تعمیر کر رکھا تھا۔ ۱۶۶۶-۶۷ء میں سب سے پہلے یوسف زئیوں نے اسی قلعہ پر اچانک کر دیا۔ ۱۶۷۲ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی حسن ابدال میں آمد کے بعد یوسف زئیوں کو اگچھ پیچھے دھکیل دیا گیا تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد جبکہ ترک سلطان محمود خورد والئی پکھلی کی گمشدگی کے بعد خانہ جنگی کا شکار بن گئے تھے۔ سندھ کے اس پار سے قبائل کی پیش قدمی پھر شروع ہو گئی۔ سید جلال بابا نے ۱۷۱۳ء میں ایک سواتی لشکر کے ساتھ گلی باغ پر قبضہ کر کے ترکوں کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اسی زمانے میں مزید تنولی، سواتی، جدون، اتمان زئی اور علی زئی قبائل دریائے سندھ کو عبور کر کے پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھنے شروع ہوئے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی ہی میں ہیبت خان تنولیوں کے تپہ ہندوال کا خان بن کر پہلی بار تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ علاقہ تناول کے اکثر دیہات کی صورت دیہوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری مغل دور میں یعنی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد تنولی اس علاقے میں داخل ہوئے اور انہوں نے ترکوں سے علاقہ تناول کے اہم مرکزی مقامات جن میں شیروان اور دربند بھی شامل ہیں، چھین لئے۔ علاقہ تناول کے آخری ترک حکمران سلطان قیاس الدین اور اس کی اولاد نے تنولیوں کی یلغار روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اصالت خان ترک اور اس کے چند ساتھیوں نے بمشکل بحالی اور اس کے نواحی دیہات پر اپنا قبضہ بحال رکھا۔ تنولیوں کی اسی تیسری

پیش قدمی کے بارے میں ہزارہ گزیٹیر کا بیان ہے :

"Jalal Baba collected a heterogeneous following in the Swat valley, west of the Indus, evicting the Turks, appropriated the country now held by the Cis-Indus Swatis. Similarly about the same time the Tansis crossed over from their original country on the West Bank of the Indus, and appropriated the tracts in Hazara now known as Tanawal".

۱۵۳۹ء سے اس علاقے میں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت پکھلی سرکا اور ہزارہ قارلق کے تمام خوانین ایک دوسرے کے علاقے پر دست درازیاں کر رہے تھے۔ ترک مکمل طور پر زوال پذیر ہو چکے تھے۔ صرف ترکی پٹی مانکرائے اور علاقہ بحالی میں کسی قدر ان کی جمعیت باقی تھی اس وقت کے خوانین میں سے کسی کو بھی درانیوں کے مقابلہ کی جرات نہ ہو سکی، بلکہ خوف کے مارے شاہراہ کشمیر پر بسنے والے اکثر افراد نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو نسلی طور پر افغانوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے کے مشہور خوانین زبردست خان تنولی، سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ، راجہ جعفر خان گکھڑ اور نجیب اللہ خان ترین تھے۔ ان خوانین میں سے ہر ایک درانیوں کی حمایت اور وفاداری کا دم بھرنے لگا۔ زبردست خان نے احمد شاہ ابدالی کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور پانی پت کی لڑائی میں عملی حصہ لیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اسے صوبہ خان کا لقب دیا اور اپنی طرف سے علاقہ تناول کا حکمران بنا دیا۔ زبردست خان عرف صوبہ خان کی اولاد اب بھی صوبہ خانی

لے ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۳-۸۴ء، صفحہ ۲۱

کہلاتی ہے اور انہیں تنولیوں میں اب تک باوقار مقام حاصل ہے۔ زبردست خان عرف صوبہ خان، (۱۱۵۰ھ) ۱۷۵۰ء میں حاکم تناول مقرر ہوا، لیکن درانیوں کا عہد مسلسل بدنظمی، انتشار اور غارت گری کا عہد بنا رہا۔ خوانین کے مابین جھگڑے اور تنازعے جاری رہے۔ تنولیوں میں پلالوں اور ہندوالوں کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کی کش مکش جاری ہوگئی۔ عوام درانیوں کے علاوہ ان کے مقرر کردہ خوانین کے ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے، حتیٰ کہ سکھوں نے ۱۸۱۰ء میں ہزارہ فارلق اور پکھلی سرکار کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کی آمد کے عہد کے تفصیلی حالات انشاء اللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔

سُلطان شہاب الدّین بابر

۱۳۹۸ء کے تیموری حملے کے بعد ولایت پکھلی میں قرلق ترکوں کی آبادکاری کے حالات گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کئے جا چکے ہیں۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد ابوسعید سلطان کے عہد تک قرلقوں کی ہزارہ منگ کے افسر تیموری قلمرو کے حیثیت سے ولایتِ پکھلی پر حکمرانی کرتے رہے۔ ابوسعید سلطان کی شہادت کے بعد جب توران میں خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اپنے مرکز سے کٹ گئے۔ تیموری شہزادوں کی باہمی خلفشار اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اوزبک سردار بھی قسمت آزمائی کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ شیبانی محمد خان اوزبک نے جنوبی توران میں غلبہ حاصل کر لیا۔ اس کی پیش قدمی کا سلسلہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ ۱۵۰۰ء میں اُس نے سمرقند کے دارالحکومت پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ ظہیر الدین بابر سمیت تقریباً تمام تیموری شہزادے ایک ایک کر کے شیبانی محمد خان سے شکست کھا گئے؛ چنانچہ ان مخدوش حالات میں ولایتِ پکھلی کے ترک افسر اپنے خان یا قاغان کے تحت کچھ عرصہ تک اس علاقے پر بدستور حکمرانی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں دہلی میں لودھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ لودھیوں نے پنجاب میں بھی پیش قدمی کرنے کی کوشش کی، لیکن کشمیری حکمران بڈشاہ نے زبردست لڑائی کے بعد سرہند تک کے علاقے پر قبضہ جما لیا۔ علاقہ گکھڑ لودھیوں کے تسلط سے آزاد رہا۔

یہی وہ حالات تھے جن میں ۱۴۷۲ء کے لگ بھگ چار ہزار تنولیوں کے ایک لشکر نے مولوی ابراہیم لودھی کی سرکردگی میں دریائے سندھ کو پار کر کے علاقہ تناول کے بعض مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ پکھلی خاص سے ترکوں نے تنولیوں کے مقابلے کے لئے ایک فوج روانہ کی، مگر وہ تنولیوں کی یلغار کو روک نہ سکی، اور تنولیوں نے کئی مواضعات پر قبضہ برقرار رکھا۔ عین ممکن تھا کہ ان حالات میں اردگرد کی کوئی اور مضبوط

طاقت آگے بڑھ کر ترکو[illegible] [illegible] پہنچ گئی، لیکن ان کی خوش قسمتی سے اسی زمانے میں ابوسعید سلطان کا ایک پوتا بابر مرزا ولایتِ پکھلی میں داخل ہوا، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تیموری شہزادے خانہ جنگی میں مبتلا تھے اور شیبانی محمد خان نے توران میں ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ بابر مرزا نے اوّل تو دہلی کا رُخ اختیار کیا، لیکن وہاں مضبوط لودھی سلطنت کی موجودگی میں اپنے لئے کوئی گنجائش نہ پاکر وہ ولایت پکھلی کی طرف نکل آیا۔ بابر مرزا امیر تیمور کا پانچواں پوتا اور ظہیر الدین بابر کا چچیرا بھائی تھا۔ "تاریخ فرشتہ" میں ابوسعید سلطان کے نو بیٹوں کا ذکر موجود ہے، ان میں سے ظہیر الدین بابر کے باپ کا نام عمر شیخ مرزا تھا اور شہاب الدین بابر کے باپ کا نام سلطان عمر مرزا تھا۔ ظہیر الدین بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کو ابوسعید سلطان نے اپنی زندگی ہی میں فرغانہ کا حکمران بنا دیا تھا، لیکن سلطان عمر مرزا اپنے بعض دوسرے بھائیوں کی طرح حکومت کا داعیہ نہیں رکھتا تھا۔ خانہ جنگی کے زمانے میں کسی بھی تیموری شہزادے کی زندگی خطرے سے باہر نہ تھی؛ لہٰذا شہاب الدین بابر نے ادھر آکر ولایت پکھلی پر حکمرانی شروع کر دی اور ظہیر الدین بابر نے اس کے کچھ عرصہ بعد کابل کے اہم شہر پر قبضہ کر لیا۔ ظہیر الدین بابر ہندوستان میں تیموری خاندان کی سلطنت مغلیہ کا بانی بنا ——— شہاب الدین بابر ولایتِ پکھلی کے ان سلاطین کی ریاستِ پکھلی کا بانی بنا جن کا تذکرہ آئندہ اوراق میں کیا جا رہا ہے۔

بابر مرزا نے شہاب الدین کا لقب اختیار کر کے ولایت پکھلی کے آزاد حکمران کی حیثیت سے حکمرانی کا آغاز کیا۔ بابر مرزا نے گلی باغ کی چھاؤنی کو آباد کیا اور اس میں قلعہ فیروزہ کی تعمیر کی۔ اس قلعہ کی تعمیر کے تفصیلی حالات آئندہ اوراق میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ بابر مرزا کے بعد اس کی اولاد میں جتنے بھی والیانِ پکھلی گزرے ہیں، ان میں ہر ایک نے مقدور بھر اس قلعہ اور چھاؤنی کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ ترکوں کو دوبارہ منظم کرنے کے بعد بابر مرزا نے دریائے سندھ کے کنارے چھانجل اور درہند کے مقامات پر مضبوط قلعے تعمیر کئے۔ دریائے سندھ کے اس پار سے پیش قدمی کرنے والے قبائل کی یلغار کو روکنے کے لئے ان قلعوں کی تعمیر کو بہت اہمیت دی گئی۔ چھانجل کا قلعہ علاقہ بٹگراں کے شمال میں دریائے سندھ سے چند میل کے فاصلے پر تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک موجود رہا، لیکن ۱۶۱۶-۶۷ء میں جب سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی کی گمشدگی کے بعد ترکوں کے درمیان خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی، اس وقت یوسف زئیوں نے پانچ ہزار کی تعداد میں دریائے سندھ کو عبور کر کے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا، مگر اورنگ زیب عالمگیر کی حسن ابدال میں تشریف آوری کے بعد حملہ آور یوسف

زئیوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

چھانجل کے بعد دربند کے مقام پر ایک اور قلعہ تعمیر کیا گیا۔ درحقیقت توران کے دریائے وخش کے قریب صوبہ قوازیان تھا۔ اس صوبے کے دارالحکومت راشت سے دو دن کی مسافت پر دربند کا قصبہ سڑک کے کنارے پر آباد تھا۔ یہ علاقہ اُوغوزی قرلقوں کا مرکزی علاقہ تھا۔ اسی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ترکوں نے دُربند کا قلعہ اور گاؤں آباد کیا۔ دربند کا قلعہ موجودہ قصبہ کے عقبی جانب بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ تنولیوں کی دوسری آمد کے وقت ترکوں کو قلعہ خالی کرنا پڑا۔ دُربند کا قلعہ آباد کرنے کے ساتھ ہی شہاب الدین بابر نے علاقہ تناول کے مرکزی علاقہ میں شیروان کا قصبہ اور قلعہ بھی آباد کیا۔ صورت دیہی موضع شیروان میں لکھا ہے کہ یہ موضع شیروان نامی ایک ترک نے آباد کیا تھا اور آخری مغل دور میں اس پر تنولیوں نے قبضہ کیا۔ درحقیقت شیروان بھی توران کے ایک قصبہ کا نام تھا۔ یہ قصبہ بخارا کے علاقے میں بام کٹھ کے قریب واقع تھا۔ اس علاقے میں بھی اوغوزی قرلق ترک آباد تھے۔ اسی قصبہ کی مناسبت سے بعض ترکوں کے نام بھی شیروان رکھے جایا کرتے تھے۔ شیروان کے مرکزی مقام کو سڑکوں کے ذریعے دربند، مانسگلی، دھتوڑ اور گلی باغ سے ملا دیا گیا تھا۔ سکھوں کے عہد تک شیروان کا قلعہ موجود رہا اور شیروان کے موضع کو علاقہ تناول میں مرکزی مقام کی حیثیت حاصل رہی۔ ترکوں کے عہد میں چھانجل، دربند اور شیروان کے قلعہ دار اور گراشتے گلی باغ کے دارالریاست سے مقرر کئے جاتے تھے۔!

ان قلعوں اور قصبوں کی تعمیر کے بعد علاقہ تناول میں امن وامان بحال ہوگیا اور آئندہ تقریباً اڑھائی صدیوں تک کے طویل عرصے تک علاقہ تناول سندھ پار کے قبائل کی یلغار سے محفوظ ہوگیا۔ توربیلہ اور مانکرائے کے مواضعات میں بھی فوجی دستوں کی قیام گاہیں تعمیر کی گئیں۔ مظفرآباد میں (مظفرآباد بہت بعد میں آباد ہوا) دریائے جہلم کے قریب کوڑمنگ کی چھاؤنی آباد کی گئی۔ بڑی بڑی گزرگاہوں میں برج تعمیر کئے گئے اور اس طرح تمام راستے ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتوں سے محفوظ ہوگئے۔

موجود ضلع ہزارہ اور آزاد کشمیر میں بسنے والے ترکوں کے بیشتر خاندانوں کا شجرہ نسب اسی شہاب الدین بابر شاہ تک پہنچتا ہے، چونکہ بابر مرزا پکھلی آکر قرلق ترکوں میں آباد ہوگیا، اس لئے بعض کتابوں تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ تیموریوں کا نسبی تعلق اوغوزی قرلق ترکوں ہی سے تھا؛ لہٰذا تیموریوں کو قرلق

پکارنا درست ہے۔ ترکوں کے اسی قدیم قرلق قبیلہ میں اوغوز خان، ایلخان، برلاس اور تیمور جیسے نامور افراد پیدا ہوئے اور ان عظیم افراد کے ناموں پر قرلق ترکوں کی کئی شاخیں وجود میں آگئی تھیں۔ ہندوستان میں ترکوں کا یہ واحد قبیلہ ہے جس نے ترکوں کے زوال کے زمانے تک اپنے قدیم قبائلی نام قرلق کو زندہ رکھا۔

شہاب الدین بابر نے توران کے تیموریوں کے نمونے پر یہاں بھی جاگیردارانہ نظام قائم کیا۔ تنخواہوں کے عوض افسروں کو جاگیریں عطا ہوا کرتی تھیں۔ حکمران سلطان کے بھائی اس کی طرف سے مختلف علاقوں میں دفتریوں کے طور پر حکمرانی کا کاروبار چلایا کرتے تھے؛ چونکہ ترکوں کی آبادکاری سے قبل اس علاقے میں کھشتری حکمرانوں کے لئے "راجہ" کا لقب استعمال کیا جاتا تھا، اس لئے ترک سلاطین کے لئے بھی عوام نے راجہ ہی کے لقب کا استعمال جاری رکھا۔ اب بھی ہزارہ میں ترکوں کو راجے پکارا جاتا ہے۔ کشمیر کے شاہ میری خاندان کے ساتھ ابتدائی زمانے میں سلاطین پکھلی کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ سرینگر میں پکھلی واڑا کے نام کا ایک مقام بھی موجود تھا۔ تاریخ کشمیر میں شاہ میری خاندان کے ساتھ سلاطین پکھلی کی بعض رشتہ داریوں کا ذکر بھی موجود ہے اور پکھلی واڑہ کے قبرستان میں سلاطین پکھلی کے بعض رشتہ داروں کی قبریں بھی موجود ہیں۔

سُلطان فقیرالدّین دریاخان

سلطان شہاب الدین بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا دریا خان سلطان فقیرالدین کے لقب سے ولایتِ پکھلی کا حکمران بنا۔ اس نے مانگلی اور دہتوڑ کی فوجی چھاونیوں کو مضبوط بنایا۔ اس زمانے میں مانگلی ایک تجارتی مرکز بن گیا۔ اس میں کشمیر، گلگت اور پنجاب سے آنے والا تمام تجارتی مال آسانی سے دستیاب ہوسکتا تھا۔ شاہراہِ کشمیر پر مانگلی ہی سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا، لیکن دہتوڑ ایک فوجی چھاونی تھی اور اس ایک قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ دہتوڑ، مانگلی، تناول، لورہ اور گلیات کے تمام درمیانی علاقے کا مرکزی مقام بن گیا۔

سلطان فقیرالدین کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ ظہیرالدین بابر کا سرحدی علاقے میں نمودار ہونا اور ہندوستان کو فتح کرنا ہے۔ ظہیرالدین بابر کی آمد کے نتائج بڑے گہرے اور دُور رس تھے؛ لہٰذا ان واقعات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے جو بابر کی آمد کے دوران میں ہوئے تاکہ اس دور کی تاریخ کا پس منظر اچھی طرح واضح ہوجائے۔

ظہیرالدین بابر امیر تیمور کا چھٹا پوتا اور عمر شیخ مرزا حاکم فرغانہ (ترکستان) کا بیٹا تھا۔ بابر کے دادا ابوسعید سلطان نے عمر شیخ مرزا کو اپنی زندگی ہی میں فرغانہ کا حکمران بنادیا تھا۔ ابوسعید سُلطان کے کل نو بیٹے تھے، جن میں سے اس نے صرف چار کو اپنی زندگی ہی میں مختلف علاقوں کا حکمران بنایا تھا۔ باقی پانچ بھائی حکمرانی کا داعیہ نہیں رکھتے تھے۔ عمر شیخ کی وفات کے وقت بابر بمشکل بارہ برس کا تھا۔ اس وقت توران میں تیموری شہزادے خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ بابر اپنے چچاؤں اور دوسرے تیموریوں سے عرصہ دراز تک کش مکش کرتا رہا۔ طویل جدوجہد کے بعد اس نے صرف دو صد آدمیوں کی مدد سے ۱۵۰۲ء میں کابل کے

کے اہم شہر پر قبضہ کر لیا۔ خسرو شاہ سے کابل چھیننے کے بعد اس نے ظہیر الدین لقب اختیار کیا اور بادشاہ بنا۔ قبل ازیں تیموریوں کو مرزا یا امیر ہی کے القابات سے پکارا جاتا تھا۔ کابل پر قبضہ کرنے کے بعد بابر نے ارد گرد کے افغان اور ہزارہ قبائل کو اپنا مطیع بنایا اور پھر سرحدی علاقے پر اپنی توجہ مبذول کر دی۔ اس کے دل میں ہندوستان فتح کرنے کی تمنا پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن وہ اس سے قبل سرحدی قبائل پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ بابر ۱۵۱۹ء میں پہلی بار سوات، دیر اور وادیٔ پشاور کے علاقے میں نمودار ہوا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے چار مہمات میں سوات، باجوڑ، ہزارہ قارلق، نیلاب، بلکہ بھیرہ تک کے تمام علاقوں پر اپنی بالادستی قائم کر دی۔

سوات اور باجوڑ میں بابر کا مقصد گبری سلاطین اور یوسف زئیوں کو اپنا مطیع بنانا تھا۔ یوسف زئیوں کو اس کے چچا مرزا الغ بیگ ثانی حاکم کابل نے افغانستان کے علاقے سے باہر نکال دیا تھا اور وہ اوّل اوّل دلازاکوں سے پناہ لے کر یہاں آباد ہوئے تھے، لیکن جب یوسف زئیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہوں نے نہ صرف تڑکانڑی، دلازاک اور خوزباخیلوں سے ہی ٹکر لینی شروع کر دی، بلکہ ان کا دباؤ سوات اور باجوڑ کے گبری سلاطین پر بھی بڑھ گیا۔ سواتیوں اور تنولیوں کی اچھی خاصی تعداد یوسف زئیوں کے دباؤ کی وجہ سے اپنا قدیم مسکن ترک کر کے ولایت پکھلی کے علاقے میں آباد ہونے پر مجبور ہو گئی۔ بابر نے آخری گبری سلطان حیدر علی سے باجوڑ کا قلعہ چھین لیا۔ بابر لکھتا ہے کہ باجوڑی اسلام سے پھر گئے تھے، اس لئے میں نے ان کو سزا دینا ضروری سمجھا۔ گبریوں کے سلطان اویس نے بابر سے ملاقات کی اور پھر بابر نے یوسف زئیوں کی سرکوبی کا تہیہ کر لیا۔ دلازاک بھی یوسف زئیوں کے ظلم و ستم کے خلاف شکایت لے کر بابر کے حضور میں حاضر ہوئے تھے، لیکن اتفاق سے ہوا یہ کہ یوسف زئیوں کے محاصرہ کے دوران ہی میں بابر یوسف زئی سردار شاہ منصور کی بیٹی مبارکہ بی بی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ بابر ترکی زبان کا بہترین شاعر، فارسی کا بہترین ادیب اور شعلہ بیان مقرر تھا، وہ خود لکھتا ہے کہ قبل ازیں کابل میں وہ ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو کر دیوانہ وار پھرتا رہا تھا۔ ان واقعات سے بابر کی شخصیت کے ذہنی اور جذباتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال بابر نے مبارکہ بی بی کے والد کو اس کے نکاح کا پیغام بھجوایا جسے اس نے قبول کر لیا۔ بابر محبت سے مبارکہ بی بی کو افغانی بیگم پکارتا تھا اور اسی کی سفارش پر بابر نے یوسف زئیوں کو معاف کر دیا، لیکن شاہی حرم کی ترک خاتون مبارکہ بی بی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور اس سے بابر کی کوئی اولاد پیدا نہ ہو سکی۔

اس واقعہ کے بعد یوسف زئیوں کے وقار میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے ۱۵۲۲ء کے لگ بھگ جنگ کاٹلنگ میں دلازاکوں کو شکست دے کر ان کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ انہوں نے گبری سواتی سلاطین کو ملک سے باہر نکال دیا۔ سلطان اویس گبری کاشغر کے علاقے میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ کچھ تنولی اور سواتی باشندے پکھلی کی طرف نکل آئے، مگر ان کی اکثریت یوسف زئیوں کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہوگئی۔ رفتہ رفتہ سوات، باجوڑ اور دیر کے علاقوں سے قدیم گبری اور دری زبانیں ختم ہوتی چلی گئیں اور پختو زبان کو ترقی ہوتی گئی، حتیٰ کہ آخری مغل دور تک ان علاقوں کے باشندوں کی اکثریت پشتون بن گئی تھی۔

اس زمانے میں افغان اور ہندو راجپوت ہی ہندوستان میں دو بڑی طاقتیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف تھے۔ افغانوں کا حکمران ابراہیم لودھی تھا جس کا خاندان ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی کے زوال کے بعد برسرِ اقتدار آیا تھا اور راجپوتوں کا مقتدر حکمران رانا سنگرام سنگھ المعروف رانا سانگا تھا، جو ایک تجربہ کار جرنیل تھا اور مختلف لڑائیوں میں اس کے جسم پر اسّی زخم لگے ہوتے تھے۔ رانا سانگا ترکوں اور لودھیوں کو آپس میں لڑا کر [illegible] دہلی کے علاقے پر قبضہ کرنے کا متمنی تھا؛ چنانچہ رانا سانگا اور بعض دوسرے مسلمان سرداروں، جن میں یار حسین ابن دریا خان بھی شامل تھا، سب نے بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ۱۵۲۶ء میں بابر نے پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکستِ فاش دے کر لودھیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے تقریباً ایک سال بعد بابر نے فتح پور سیکری کے میدان میں رانا سانگا کی ٹڈی دل فوج کو شکستِ فاش دے کر راجپوت راجاؤں کی بھی کمر توڑ دی اور ہندوستان میں ترکوں کی آخری سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑ گئی۔ پانی پت کی فتح کے بعد بھی کچھ افغان سردار بالخصوص بیانہ کا افغان امیر بابر کے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے بابر کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی جس کی رپورٹ سنتے ہی بابر نے جواباً چند اشعار کہے جن میں سے دو درج ذیل ہیں، ان سے بابر کی بدیہہ گوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

باترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ
چالاکی و مردانگی ترک عیاں است،
ور زود نیائی و نصیحت نکنی گوش
آنرا کہ عیاں ست چہ حاجت بہ بیان است،

ترجمہ: "اے امیر بیانہ تو ترکوں کے ساتھ جھگڑا مت کر، کیونکہ ترکوں کی مردانگی اور ہوشیاری سب پر روشن ہے۔ اگر تو جلد مطیع ہو کر حاضر نہ ہوا اور تو نے میری نصیحت نہ سنی، تو پھر جو کچھ ہوگا، وہ اتنا ظاہر ہے کہ اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ولایتِ پکھلی اور دریائے سندھ کے اُس پار کے علاقے میں بابر کی آمد اور اس کی فتوحات کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سوات اور باجوڑ میں قدیم گبری، ممیالی اور متراوی، سواتی سلاطین کی حکمرانی کا خاتمہ ہوا اور وہ یا تو ملک بدر ہو کر ہزارہ اور کاشغر کی طرف جا کر پناہ گزین ہو گئے اور یا پھر یوسف زئیوں کی ماتحتی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ تنولی بھی اپنے قدیم مسکن کو چھوڑ کر پکھلی کے علاقے میں داخل ہوئے، مگر ان کی بڑی تعداد یوسف زئیوں کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وادیٔ پشاور کا قدیم قبیلہ دلازاک یوسف زئیوں سے شکست کھانے کے بعد تتر بتر ہو گیا۔ دلازاکوں کے کچھ افراد عہد ہمایونی میں دریائے سندھ کو عبور کر کے میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوئے۔ ظہیرالدین بابر اپنی فوج کے ہمراہ میدانِ ہزارہ قارلق سے پانچ بار گزرا۔ ایک بار علاقہ خان پور کے پہاڑی سلسلہ سنگڑہ (جسے بابر سنگ رہ لکھتا ہے) سے گزر کر ندی سوہان کی طرف آگے بڑھا۔ بابر کے بیان کے مطابق اس زمانے میں یہاں گجر، کھٹر اور کوئی اقوام مسکن پذیر تھیں۔ بابر اپنے ترکی لب و لہجہ میں گوجر یا گجر کو کجور اور کھٹر کو کھت لکھتا ہے۔ بابر اپنے سفرنامہ بھیرہ میں لکھتا ہے کہ جب وہ اس علاقے سے گزرا تو مرزا ملوئے قرلق اور بابا دوست تیس چالیس آدمیوں سمیت اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابر نے نیلاب اور ہزارہ قارلق کا علاقہ اپنے چہیتے بیٹے ہمایوں کو بخش دیا تھا[1]۔ وہ مرزا ملوئے قرلق کا تذکرہ ہمایوں کے ملازم کے طور پر کرتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے ہزارہ قارلق کے ترکوں نے بابر کی بالادستی قبول کر لی تھی۔ بابر نے ولایت پکھلی کی بالائی سمت میں پیش قدمی نہیں کی۔ جب بابر ہزارہ قارلق سے گزر کر بھیرہ کی طرف روانہ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ تمام علاقے سالہا سال سے تیموریوں کے قبضے میں چلے آ رہے ہیں؛ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے:

"یہ علاقہ بھیرہ، خوشاب، چناب اور جینوٹ چونکہ ترکوں کی ملکیت میں تھا اور سالہا

---

[1] توزک بابری ترجمہ رشید اختر ندوی صفحہ ۱۵۳

سال سے تیموری قلمرو کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے مصلحت اس امر کی متقاضی تھی کہ میں ابراہیم لودھی کے پاس سفارت بھجواؤں اور اس سے کہوں کہ چونکہ یہ علاقہ ترکوں کا ہے، اس لئے وہ اس سے دستبردار ہو جائے۔

لیفٹننٹ کرنل ٹالبوٹ Talbot نے توزکِ بابری کے انگریزی ترجمے میں بابر کے یہ الفاظ قلمبند کئے ہیں: [1]

"As I always had the Conquest of Findustan at my heart, and as the countries among which I know was had long been in the possession of the Turks, I regarded them as my own domains, and was resolved to acquire the possession of them either by war or peace."

بابر کے مندرجہ بالا الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ تیموری حملے کے زمانے ہی سے ان علاقوں پر ترکوں کی حکمرانی قائم تھی۔ جنرل کننگھم کی سروے رپورٹس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بابر کی آمد سے قبل ولایت پکھلی تا بجداٹک تک کے سارے علاقے پر ترکوں کی حکمرانی قائم تھی۔ بابر نے بھیرہ تک کے تمام علاقے کو ترکوں کی ملکیت سمجھ کر تیموری شہزادہ ہونے کے سبب اپنا حق ثابت کیا اور ملا مرشد کی رہنمائی میں ابراہیم لودھی کے پاس ایک سفارت بھجوائی اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس علاقے سے دست بردار ہو جائے۔ مگر لودھی حکمران نے اس سفارت سے بہت ناروا سلوک کیا اور دراصل یہی چیز بابر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا سبب بن گئی۔ اس زمانے کے ہندی کے حکمرانوں کے بارے میں بابر لکھتا ہے:

"[2] ہندوستانی، بالخصوص افغان عجیب احمق اور بے شعور لوگ ہیں، ان میں فہم و

---

[1] ۱۴۷

[2] ۱۴۸ Memoirs of Babur, Talbot, Page 147, 148

بصیرت کی بڑی کمی ہے، نہ تو وہ مردانگی سے جنگ لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی امن اور دوستی سے زندگی بسر کرنا جانتے ہیں۔

ہندوستان فتح ہو جانے کے بعد بابری فوج کے کچھ افسر واپس افغانستان یا توران لوٹ گئے، لیکن بابر نے دہلی ہی کو اپنا پایۂ تخت قرار دے کر یہاں حکمرانی کا آغاز کیا۔ بابر کے عہد میں میدانِ ہزارہ قارلق شہزادہ ہمایوں ہی کی جاگیر میں رہا اور بقیہ ولایت پکھلی بدستور سلطان فقیر الدین دریا خان کے قبضے میں رہی۔

سلطان غیاث الدین عبداللہ خان

سلطان فقیر الدین دریا خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ خان سلطان غیاث الدین کے لقب سے ولایت پکھلی کا حکمران بنا۔ اس کے عہد میں ولایت پکھلی اور اس کے اردگرد کے ممالک میں مندرجہ ذیل اہم واقعات رونما ہوتے۔

ظہیر الدین بابر ۱۵۳۱ء میں فوت ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا چہیتا بیٹا ہمایوں نصیر الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ہمایوں نے باپ کی وصیت کے مطابق مختلف علاقے اپنے بھائیوں کو عطا کر دیئے۔ اس کا پہلا دور دس سال کے عرصے پر مشتمل ہے۔ بھائیوں کی بے وفائی اور شیر شاہ سوری کے دباؤ کی وجہ سے ہمایوں کو بے بسی کے عالم میں ملک بدر ہونا پڑا۔ ہمایوں نے کابل کی حکومت اپنے بھائی کامران مرزا کے سپرد کر رکھی تھی۔ دریائے سندھ تک کے علاقے پر کامران مرزا ہی کی حکمرانی قائم تھی۔ کامران مرزا نے کشمیر پر چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمود غزنوی اور سلطان مسعود غزنوی کے بعد یہ تیسرا موقع تھا کہ کامران مرزا کی ترک فوج ولایت پکھلی کے ترکوں کے تعاون سے کشمیر میں داخل ہوئی۔ یہ ترک فوج کشمیریوں کو شکستوں پر شکستیں دیتی ہوئی سرینگر تک جا پہنچی مگر جب سردیوں کا موسم قریب آ پہنچا اور کامران مرزا کو محسوس ہوا کہ کشمیری نئے سرے سے مزاحمت کی کوشش کریں گے، تو اس نے کشمیریوں سے صلح کر لی اور اسی سال یعنی ۱۵۳۱ء میں وہ کشمیر سے بخیر واپس لوٹا۔ صلح کے بعد کشمیری رہنما دولت چک اور جہانگیر ماگرے اسے الوداع کہنے کے لئے ترک فوج کے [illegible] تک آتے اور پھر واپس چلے گئے۔ کامران مرزا یہاں سے کابل روانہ ہو گیا۔ اگرچہ ترکوں کو قبل ازیں کشمیر میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی؛ تاہم وہ کشمیر میں مکمل اقتدار حاصل نہ کر سکے اور ان کی ریاست کی حدود بھولیاس کی گھاٹی تک ہی محدود رہیں۔ اس مہم

کے حدِ کشمیر میں ترکوں کے دقار میں بہر حال اضافہ ہوا اور ان کے اثرات دُور دُور تک پہنچ گئے۔ ہمایوں کے زمانے میں دریائے سندھ کے اُس پار کا سرحدی علاقہ کامران مرزا کے زیرِ نگیں رہا اور ولایت پکھلی [illegible] غیاث الدین کے زیرِ نگیں رہی۔

میرزا حیدر ترک کا حملہ

سنہ ۱۵۴۰ء میں کشمیر کا حکمران سلطان ابراہیم شاہ ثانی تھا، لیکن عملی طور پر اس کی حکومت کی باگ ڈور کاجی چک کے ہاتھوں میں تھی۔ ملک ابدال ماگرے اور زنگی چک نے مل کر کاجی چک سے اقتدار چھیننے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ دونوں کشمیری رہنما کاجی چک کے ہاتھوں ہزیمت اٹھا کر ملک بدر ہو گئے اور کافی عرصہ سرگرداں اور پریشان حال پھرنے کے بعد میرزا حیدر کی وساطت سے ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے کشمیر پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دی۔ ہمایوں کے دل میں کشمیر فتح کرنے کی تمنا موجود تھی، لیکن اپنے بھائیوں کی غداری اور شیر شاہ سوری کے دباؤ کی وجہ سے وہ مذبذب رہا بہر حال میرزا حیدر نے ہمایوں سے کشمیر پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور ابدال ماگرے اور زنگی چک کو ہمراہ لے کر کشمیر کی جانب بڑھا۔ میرزا حیدر کا پورا ترکی نام حیدر داغلات تھا اور وہ ہمایوں کا ماموں زاد تھا۔ میرزا حیدر کے لشکر میں ترکوں کے علاوہ علاقہ گکھڑ کے سپاہی بھی شامل تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے کشمیریوں کو شکست دیتا ہوا کشمیر کے اندرونی علاقے میں داخل ہو گیا۔ اپنے بہادرانہ کارناموں کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں میرزا حیدر کو کشمیر میں غلبہ حاصل ہو گیا۔ میرزا حیدر کے سرینگر پہنچنے کے بمشکل چار ماہ بعد ابراہیم شاہ ثانی فوت ہو گیا اور اس کی فوتیدگی کے ساتھ ہی کاجی چک کی بھی ہمت ٹوٹ گئی۔ وقتی طور پر میرزا حیدر نے ابراہیم شاہ کے بیٹے نازک شاہ کے سر پر تاج رکھا اور خود اس کے مدار المہام کے طور پر حکمرانی کرنے لگا۔ ——— کشمیر میں میرزا حیدر کی حکمرانی کا زمانہ سنہ ۱۵۴۰ء سے سنہ ۱۵۵۱ء تک کا ہے۔

کاجی چک میرزا حیدر کے مقابلے کی تاب نہ لا کر کشمیر سے بھاگ گیا اور شیر شاہ سوری کے پاس پہنچ کر اس سے امداد کا طالب ہوا۔ اس نے اپنی خوبرو ہمشیرہ زادی شیر شاہ سوری کے عقد میں دے دی اور اس حیلے سے اس نے شیر شاہ سوری کو اپنی مدد پر آمادہ کر لیا۔ شیر شاہ سوری ویسے بھی ترکوں کا مخالف

تھا اور انہیں ہندوستان سے ملک بدر کرنے پر تلا ہوا تھا؛ چنانچہ پانچ ہزار افغان فوج کو ہمراہ لے کر کابل سے کشمیر روانہ ہوا، مگر اس دوران میں میرزا حیدر کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا؛ لہٰذا اس نے زبردست حملہ کر کے افغان فوج کو شکستِ فاش دے کر کشمیر سے باہر مار بھگایا۔ اس کے بعد وہ بڑی بے فکری سے حکمرانی کرنے لگا اور اس نے کشمیر میں ہمایوں کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کشمیر میں ایک ترک حکمران کے نام کا خطبہ و سکہ جاری ہوا۔ سوریوں کو دوبارہ کشمیر میں فوج کشی کی جرأت نہ ہوئی۔

جب کشمیریوں کو یہ احساس ہوا کہ کشمیر پر میرزا حیدر کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے اور اب کشمیر میں کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی جو اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکتی ہو تو انہوں نے اسے زک پہنچانے کے لئے ایک کامیاب چال چلی۔ انہوں نے میرزا حیدر کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے بعد یہ ترغیب دی کہ چونکہ اب کشمیر پر اس کا اقتدار مکمل ہو چکا ہے؛ لہٰذا اب اسے اردگرد کے ممالک بھی فتح کرنے چاہئیں۔ میرزا حیدر کشمیریوں کی اس چال میں آگیا اور اس نے ایک فوج تیار کر کے ولایت پکھلی کو فتح کرنے کے لئے روانہ کر دی۔ اس وقت میں میرزا حیدر کو پکھلی کے ترکوں ہی سے امداد کی توقع ہو سکتی تھی، لیکن کشمیریوں کی اس چال میں آ کر نہ صرف وہ ترکانِ پکھلی کی امداد سے محروم ہوا، بلکہ الٹا اس نے انہیں اپنا دشمن بھی بنا لیا۔ میرزا حیدر کی طاقت ور فوج دریائے جہلم کو پار کر کے پکھلی پر حملہ آور ہوئی اور پیش قدمی کرتے ہوئے اس نے مانکلی جیسے اہم شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ جلدی سے میرزا حیدر نے مفتوحہ علاقے کے بندوبست کے لئے مولانا سمرقندی کو مانکلی بھجوا دیا۔ مولانا سمرقندی فوج کے سائے میں علاقے کا بندوبست کر ہی رہا تھا کہ سلطان غیاث الدین کی فوج نے درۂ کونش کے علاقے سے نکل کر میرزا حیدر کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ بدقسمتی سے میرزا حیدر اپنی فوج کے ایک حصے کو کاشغر فتح کرنے کے لئے بھی روانہ کر چکا تھا اور کشمیر میں اب اس کے پاس مزید فوج اتنی نہ تھی جتنی وہ پکھلی روانہ کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان پکھلی کی فوج نے میرزا حیدر ترک کی فوج کو اپنے علاقے سے مار کر باہر نکال دیا۔ مولانا سمرقندی مشکل سے اپنی جان بچا کر فرار ہوا۔ ادھر جب کشمیریوں کو یقین ہو گیا کہ میرزا حیدر کی فوج کشمیر سے باہر لڑائیوں میں مصروف ہے اور اندرونِ ملک میں بھی اس کے پاس کوئی فوج موجود نہیں تو انہوں نے کشمیر میں بغاوت کھڑی کر دی۔ میرزا حیدر کی ناعاقبت اندیشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ کشمیر میں بے دست و پا ہو گیا اور ۱۵۵۱ء بمطابق ۹۵۸ھ میں وہ بہادری کے ساتھ کشمیریوں سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ اس طرح کشمیر ایک بار پھر ترکوں

کے اعتبار سے نکل کر خاندانِ چکاں کو منتقل ہو گیا جو نسلاً مغل ہی تھے اور عرصۂ دراز سے کشمیر میں آباد چلے آ رہے تھے۔

کجو خان یوسف زئی کی پیش قدمی:

بعض کتابوں میں ملک کجو خان کا نام کاجو بھی لکھا گیا ہے، مگر ہزارہ قدیم میں وہ کجو خان کے نام سے مشہور تھا۔ گزشتہ اوراق میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ کس طرح شاہ منصور کی بیٹی مبارکہ بی بی کے ساتھ ظہیر الدین بابر کے عقد کے بعد سندھ کے شمال مغربی علاقے میں یوسف زئیوں کا پلہ بھاری ہوا تھا۔ مغلوں کے فرار کے زمانے میں یوسف زئیوں کا قبائلی سردار ملک کجو تھا۔ وہ ایک ہوشمند، باوقار اور دور اندیش سردار تھا۔ اس کی سرکردگی میں یوسف زئیوں نے سوات، باجوڑ اور وادیٔ پشاور کے رہنے والے تمام قبائل پر بالادستی حاصل کر لی تھی۔ جنگِ کاٹلنگ میں دلازاکوں شکست دینے کے بعد ملک کجو کا حوصلہ اور بھی بلند ہو چکا تھا۔ [illegible] میں شیخ مالپور کے مقام پر غوریا خیلوں کو شکست دینے کے بعد ملک کجو نے پشاور کا قلعہ فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح اس نے ہمایوں سے براہِ راست ٹکر لے لی۔

اُس وقت ہمایوں کی طرف سے پشاور کا قلعہ دار سکندر خان اوزبک تھا جس کے پاس افرادی قوت تو بہت کم تھی، لیکن آتشیں اسلحہ استعمال کر کے اس نے قلعے کا مؤثر دفاع کیا؛ چنانچہ کجو خان کو قلعہ کا محاصرہ اٹھا کر ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ یہاں سے پلٹ کر ملک کجو نے سندھ کی نواحی بستیوں کو تاخت کیا، وہاں لوگوں کی بہت سی بھیڑ بکریاں چھین کر واپس لوٹ گیا۔

۱۵۵۳-۵۲ء میں ملک کجو نے تربیلہ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کیا اور پیش قدمی کرتا ہوا [illegible] پہاڑ کوٹ تک جا پہنچا۔ پہاڑ کوٹ کا موضع اب بھی تربیلہ سے چند میل کے فاصلے پر تحصیل ہری پور میں موجود ہے۔ تاریخ حافظ رحمت خانی کا بیان ہے کہ جب سلطان غیاث الدین والیٔ پکھلی کو ملک کجو کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے اسی پہاڑ کوٹ کے مقام پر اس کے [illegible] اور پیش کش ارسال کیا۔ ملک کجو ہزارہ تارلق کے میدانِ ہزارہ سے ہوتا ہوا علاقہ گکھڑ میں داخل [illegible] تاریخ حافظ رحمت خانی کا بیان ہے کہ سلطان [illegible] خان گکھڑ نے بھی ملک کجو خان کو تحفہ اور پیشکش دے کر [illegible] رخصت کیا۔ [illegible] گکھڑ [illegible] واقعہ کے بارے میں خاموش ہے۔ تواریخ حافظ رحمت

خانی کے علاوہ ملک کجو کو سلطان غیاث الدین یا سلطان آدم خان گکھڑ کی طرف سے تحفہ اور پیش کش پیش کرنے کا واقعہ کسی کتاب میں نہیں لکھا گیا، بہر حال ملک کجو میدانِ ہزارہ قارلق اور علاقہ گکھڑ سے واپس لوٹ گیا اور میدانِ ہزارہ قارلق بدستور سلطان غیاث الدین کے ماتحت رہا۔ ملک کجو کی واپسی کے چند ماہ بعد ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس نے ۱۵۵۵ء میں سوری افغانوں کو شکست دے کر ہندوستان پر دوبارہ اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ اس کے بعد سندھ کے اس پار کے رہنے والے قبائل کی طرف سے پیش قدمی کا خطرہ باقی نہ رہا۔ چونکہ ہمایوں کے فرار کے زمانے میں سلطان آدم خان گکھڑ اور سلطان سارنگ خان گکھڑ نے کمالِ وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اس لئے ہمایوں نے سلطان آدم خان کو شاہی منصب دار بنا دیا۔ اس واقعہ کے بعد تمام مغل دور میں جہلم اور مارگلہ کے تمام درمیانی علاقے میں گکھڑوں کا وقار بلند رہا اور انہیں ہزاری منصب داروں کے بلند مناصب پر بھی فائز کیا جاتا رہا۔

اسی زمانے میں پیر روشنائی نے یوسف زئیوں کے علاقے میں اپنی تحریک الحاد شروع کر دی اور پختون عوام تیزی سے اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا صاحب اسی زمانے میں علاقہ یوسف زئی میں بغرض تبلیغ تشریف فرما ہوئے۔ حضرت پیر بابا صاحب کے والد سید قنبر علی شاہ صاحب کو شاہی دربار میں باوقار مقام حاصل رہ چکا تھا اور انہیں احترام کے ساتھ سید نظر بہادر پکارا جاتا تھا۔ حضرت پیر صاحب نے پیر روشنائی کی تحریکِ الحاد کا مقابلہ شروع کر دیا اور پیر روشنائی کا نام پیر تاریک رکھا۔ اخوند درویزہ بابا نے بڑے سخت الفاظ میں پختونوں کے جاہلانہ عقائد کی مذمت کی اور پیر روشنائی کے مریدوں کے خلاف فتوے جاری کئے۔ ان حضرات کے فتووں اور مسلسل تبلیغ کی وجہ سے روشنائی تحریک کا خاتمہ ہوا اور اصل اسلامی عقائد کو فروغ حاصل ہوا۔ حضرت پیر بابا صاحب کی تبلیغ کے اثرات ولایتِ پکھلی میں بھی پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک تمام ہزارہ میں حضرت پیر بابا صاحب کی بے حد تکریم کی جاتی ہے اور یہاں سے ہزاروں افراد ہر سال آپ کے مزار پر حاضری دینے جاتے ہیں۔ روشنائی تحریک کے حالات ایک علیحدہ عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اکبری دور میں یہ تحریک مکمل طور پر کچل دی گئی اور پختون عوام میں اس جاہلانہ تحریک کے گمراہ کن عقائد کا نام و نشان تک بھی باقی نہ رہا۔

دلازاکوں کی آمد:

دلازاک قوم کی اصل تفصیل طور پر ایک عنوان کے تحت گزشتہ اوراق میں بیان کر دی گئی۔ یہ قوم پرانے زمانے سے وادیٔ پشاور میں آباد تھی، مگر جنگ کاٹلنگ میں ان کا قبائلی سردار ملک ہیبو قتل ہو گیا انہوں نے یوسف زئیوں کے خلاف بابر کے حضور میں ایک درخواست بھی گزاری، لیکن ان کے ن میں اس کا بھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمایوں کے دورِ اوّل میں دریائے سندھ تک کا علاقہ کامران مرزا کے ماتحت تھا، مگر بعض قبائل کی انگیخت پر وہ بھی دلازاکوں کا مخالف ہو گیا۔ ان حالات میں دلازاکوں کے لئے اپنے قدیم مسکن یعنی وادی پشاور کے علاقے میں زندگی بسر کرنا محال ہو گیا۔ دلازاک نئے مسکن کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں پھرتے رہے۔ ہمایوں کے فرار کے زمانے میں ہزارہ قارلق کا میدان کچھ عرصہ کے لئے بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین والیٔ پکھلی مرزا حیدر ترک کے حملے کی وجہ سے بالائی پکھلی کے علاقے میں مصروف رہا اور ادھر میدانِ ہزارہ قارلق کے علاقے میں یوسف زئی دندنانے لگے۔ ان حالات میں دلازاکوں نے ۱۵۵۲ء کے لگ بھگ کافی تعداد میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور میدان ہزارہ قارلق میں بغیر کسی مزاحمت کے داخل ہو گئے۔ تاریخ ہزارہ نے دلازاک قوم کے بزرگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں دریائے سندھ کو عبور کر کے میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوئے تھے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اس میدان کا مستقل بندوبست کر کے اسے ایک پرگنہ کی حیثیت دے دی گئی تھی اور اس پر آئین اکبری کا اطلاق کر دیا گیا تھا: لہٰذا اکبر بادشاہ کے زمانے میں دریائے سندھ کو عبور کر کے ان کا اس میدان میں داخل ہونا اور اس کے کسی موضع پر قابض ہونا محال تھا۔ اس قسم کا داخلہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جبکہ اندرون ملک میں نظام حکومت مضبوط نہ ہو۔ اب اس میدان میں گوجر، کھٹڑ اور دلازاک تین معتبر قومیں ہو گئیں۔ گوجر اور کھٹڑ بدھ دور سے یہاں آباد چلے آ رہے تھے۔ اس زمانے میں میدانِ ہزارہ قارلق کا علاقہ مانکرائے سے اٹک تک کے وسیع میدان پر مشتمل تھا۔

٭

سُلطان محمُود کلاں

سلطان غیاث الدین عبداللہ خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود ولایتِ پکھلی کا حکمران بنا، چونکہ سلطان محمود کی اولاد میں ایک اور سلطان محمود بھی پیدا ہوا، اس لئے اسے سلطان محمود کلاں اور دوسرے کو سلطان محمود خورد لکھا گیا ہے، اس کے زمانے میں مندرجہ ذیل اہم واقعات رونما ہوئے۔

غازی چک کا حملہ:

میرزا حیدر ترک کی شہادت کے بعد کشمیر میں خاندان چکاں کو عروج حاصل ہوا۔ خاندانِ چکاں کے حکمران عرصۂ دراز سے کشمیر میں آباد چلے آرہے تھے اور تیموری ترکوں کی طرح مقامی لوگ انہیں بھی مغل ہی پکارتے تھے۔ اصل طور پر تیموریوں کی طرح چک بھی ترک ہی تھے اور ان کے سرکردہ افراد کو کشمیری باشندے خواجہ کے لقب سے پکارتے تھے۔ کشمیر میں ابھی تک ان کی اولاد خواجہ ہی کہلاتی ہے۔ غازی چک اسی خاندان کا نامور حکمران تھا، اس نے ۱۵۵۲ء سے ہندوستان پر حملہ کر کے سوریوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور سلطنتِ مغلیہ دوبارہ قائم ہو گئی۔ دوبارہ ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے بعد ہمایوں بمشکل دو سال تک زندہ رہا۔ لہذا وہ کشمیر کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔ غازی چک نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی، بلکہ اس نے تبت، سکردو اور کشتواڑ پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ بعد ازیں غازی چک نے ولایتِ پکھلی پر بھی حملہ کر دیا۔ تاریخِ کشمیر مصنفہ محمد دین فوق کا بیان ہے کہ ولایتِ پکھلی غازی چک کی ایک باج گزار ریاست بن گئی۔ غازی چک نے علاقہ گکھڑ پر بھی حملہ کر دیا۔ کمال خان گکھڑ نے اس سے صلح کر لی، جس کی رُو سے کمال خان کی بیٹی غازی چک کے عقدِ مواصلت میں آئی۔ ہمایوں کی واپسی کے بعد علاقہ گکھڑ

سے کشمیر کے اثرات ختم ہو گئے، لیکن ولایتِ پکھلی میں اس کے اثرات کچھ عرصہ تک باقی رہے۔

غازی چک کے حملے کے زمانے تک ولایتِ پکھلی کے ترک سلاطین دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ان کی اکثریت تو بدستور پکھلی خاص کے علاقے میں آباد رہی، لیکن بعض خاندانِ دمہتوڑ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ دمہتوڑ نے ایک ذیلی ریاست کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شروع زمانے ہی سے دمہتوڑ کا حاکم گلی باغ سے مقرر کیا جاتا تھا اور وہ عام طور پر حاکمِ گلی باغ کا بھائی ہوا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب دمہتوڑ میں ترکوں کی ایک جمعیت وجود میں آ گئی، تو وہ ایک علیحدہ گروہ بن گئے، جن کا نام دمہتوڑی یا دھنتوڑی مشہور ہو گیا۔ کشمیریوں کے حملے کے دوران میں ان دمہتوڑیوں نے کوئی کردار ادا نہ کیا۔ اب تک ہزارہ اور کشمیر میں بسنے والے ترک دمہتوڑی اور پکھلی وال دو گروہوں میں آباد ہیں اور ایک دوسرے کو انہی ناموں سے پکارتے ہیں۔ دمہتوڑیوں کے عدم تعاون کا نتیجہ کشمیریوں کے غلبے کی صورت میں برآمد ہوا۔

سلطنتِ مغلیہ سے الحاق:

تیموری ترک عرصہ دراز سے کشمیر پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے متمنی تھے، لیکن کامران میرزا اور مرزا حیدر ترک داغلات کی بے تدبیریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے ترک افواج کشمیر میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود اپنا اصل مقصد نہ پا سکے۔ حیدر داغلات کی شہادت کے بعد کشمیر میں خاندانِ چک کو عروج حاصل ہوا اور ان کے نامور حکمران غازی چک نے کشمیر میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد علاقہ گکھڑ اور ولایت پکھلی میں بھی دست درازیاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں دمہتوڑ کو ایک ذیلی ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور پکھلی اور دمہتوڑ کے ترک آپس کی سر پھٹول میں لگے ہوئے تھے، اس لئے وہ مؤثر طور پر ریاست کا دفاع نہ کر سکے اور کشمیر کو ولایتِ پکھلی پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ میدانِ ہزارہ قارلق تا بحد اٹک تک کا سارا علاقہ غازی چک کے زیر اثر آ گیا۔

شہنشاہ اکبر ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی فوتیدگی کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ میدانِ ہزارہ قارلق ہمایوں کی واپسی کے بعد سے سلطنتِ مغلیہ کا حصہ بن گیا تھا، لیکن بقیہ ولایتِ پکھلی پر کشمیر کی بالادستی موجود تھی۔ دراثنا سلطان محمود کلاں ہی ولایتِ پکھلی کا حکمران تھا، لیکن عملی طور پر دمہتوڑ کی ذیلی ریاست کا کاروبار شاہرخ چلا رہا تھا۔ سلطان محمود کلاں اور شاہرخ دونوں اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور انہوں نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ لیکن شہنشاہِ اکبر کچھ وقت تک دیگر امورِ سلطنت میں مصروف رہا اور کشمیر کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ جوں ہی شہنشاہ کو دہلی، آگرہ اور گجرات کے حالات سے فرصت ملی، اس نے راجہ بھگوان داس کی قیادت میں ۱۵۸۲ء میں ایک فوج تسخیر کشمیر کے لئے ولایت پکھلی کو روانہ کی۔ اکبر نامہ کا بیان ہے کہ پکھلی ناصر پہنچ کر راجہ بھگوان داس اور شاہرخ وغیرہ نے اکبری فوج کو منظم کیا اور کشمیر پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کیں۔ چونکہ شاہی فوج کو سلطان محمود کلاں اور شاہ رُخ کا تعاون حاصل تھا، اس لئے اکبری فوج نے پورے اعتماد کے ساتھ کشمیر پر حملہ کر دیا۔ بارہ مولا کے قریب کشمیریوں نے شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ ککھا اور بمبہ قبائل نے بھی شاہی فوج کی زبردست مزاحمت کی۔ شاہی فوج زبردست نقصان اٹھانے کے باوجود آگے بڑھتی چلی گئی، لیکن کشمیریوں کی چالبازیوں اور برفباری کی وجہ سے اکبری فوج نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس کی وجہ سے راجہ بھگوان داس کو خاصی خفت اٹھانا پڑی۔ اکبری فوج کی دیگر مہمات کو بھی محض جزوی کامیابیاں ہی حاصل ہوتی رہیں۔ آخر کار اکبری فوج نے ۱۵۸۵ء میں امیر البحر میرزا قاسم کی کمان میں کشمیر پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ میرزا قاسم نے کشمیریوں کی تمام چالوں کو ناکام بنا دیا اور کشمیر پر مکمل فتح حاصل کر کے اسے سلطنتِ مغلیہ کے ساتھ شامل کر دیا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد از سرِ نو کشمیر کا بندوبست کیا گیا اور آئینی طور پر اسے ایک سرکار کا درجہ دے کر کابل کے صوبے کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ شہنشاہِ اکبر نے امورِ کشمیر پر ذاتی توجہ دی اور تھوڑے ہی عرصے میں بغاوت کے تمام امکانات ختم کر دیئے گئے۔

کشمیر پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد والیٔ پکھلی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ولایت پکھلی کی شمال مشرقی سرحد اب ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکی تھی۔ سلطان محمود کلاں اور شاہ رُخ دمہتوڑی شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے پکھلی و دمہتوڑ کا الحاق سلطنتِ مغلیہ سے کر دیا۔ شہنشاہ نے ان کی وفاداری سے متاثر ہو کر سلطان محمود کلاں کو پانچ صدی اور شاہرخ دمہتوڑی کو سہ صدی کے مناصب عطا کئے۔ سلطان محمود کلاں کو بدستور حاکمِ پکھلی تسلیم کیا گیا۔ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری میں ان دونوں کے نام منصبداروں کی فہرست میں موجود ہیں۔ قبل ازیں کشمیری حکمران یوسف شاہ کو بھی پانچ صدی ہی کا منصب عطا ہوا تھا۔ شہنشاہِ اکبر نے ولایتِ پکھلی کو بھی کشمیر کی طرح ایک علیحدہ سرکار کا درجہ دیا اور اسے بھی کابل کے صوبے کے ساتھ شامل کر دیا۔ لیکن ان دونوں سرکاروں میں یہ فرق رکھا گیا کہ کشمیر سرکار کے حاکم مرکز کی طرف سے مقرر کئے جاتے تھے اور مناسب وقفوں کے بعد ان کے تبادلے بھی ہوتے رہتے تھے، لیکن پکھلی سرکار

کو حسب سابق ایک موروثی ریاست کی حیثیت دی گئی اور اس کے مالک تبدیل نہیں کیے گئے۔ بلکہ شہنشاہ نے پکھلی ریاست کو سالانہ لگان یا باج و خراج سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا۔ آئین اکبری اور اکبر نامہ کے مطالعہ سے ولایتِ پکھل کی اس حیثیت کا اب بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصی رعایت ہندوستان بھر میں اسی ریاست کو حاصل تھی۔

کشمیر کی فتح نہ صرف اہلِ کشمیر بلکہ اہلِ پکھل کے حق میں بھی نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئی۔ قبل ازیں کشمیر کا علاقہ تیموریوں کے کسی بھی شاہی خاندان کی سلطنت کا حصہ نہیں بنا تھا۔ اس لئے سیاسی اور معاشرتی طور پر کشمیر اور بقیہ ہندوستان کی انسانی زندگی میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا۔ کشمیر اس سے پہلے بھی جنت نظیر تھی، لیکن اس کے حسن و لطافت سے بیرونی دنیا کے بہت کم لوگ لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ کشمیریوں کے لئے اپنی روزمرہ کی زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے بیرونی دنیا سے تجارتی تعلقات قائم رکھنا ضروری تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ولایت پکھل، علاقہ گکھڑ اور پنجاب کے دیگر علاقوں سے کشمیری حکمرانوں کے تعلقات بسا اوقات خراب ہی رہے اس لئے کشمیر کو وہ معاشی ترقی نصیب نہ ہو سکی جو ہونی چاہیے تھی جب اکبری فوج نے کشمیر فتح کیا تو کشمیر کی ترقی کے تمام دروازے کھل گئے۔ پکھل کے راستے آزادانہ تجارت شروع ہوئی۔ برصغیر کے تمام علاقوں سے تیار اور مسافر کشمیر جانے لگے۔ جگہ جگہ سرائیں اور ڈاک چوکیاں تعمیر ہونے لگیں۔ شاہراہ کشمیر پر واقع تمام شہر ترقی کرنے لگے۔

والیٔ پکھل سلطان محمود کلاں تسخیر کشمیر کے کچھ ہی عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ توزکِ جہانگیری میں جہانگیر بادشاہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود کلاں اور شاہرخ دونوں میری شہزادگی کے زمانے میں میری خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اکبر بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ کے ساتھ سلطان محمود کے نہایت دوستانہ مراسم قائم تھے۔ جہانگیر یہ بھی لکھتا ہے کہ سلطان محمود سُرکے دو پیالے بیک وقت پی جاتا تھا۔ اس زمانے میں پکھل وال ترکوں نے بوزا کی بجائے سرا ایجاد کر لی تھی اور بقول جہانگیر وہ شراب کا بہترین نعم البدل تھی۔ توزکِ جہانگیری کا بیان ہے کہ سلطان محمود ہی نے دریائے کنسار کا نام نین سکھ رکھا تھا۔ انگریزوں کے زمانے کے پہلے بندوبست تک اس دریا کا نام نین سکھ ہی مشہور تھا۔ اس وقت تک ترکوں نے ہندی اور لاہوری زبان سیکھ لی تھی۔ جہانگیر شکوے کے طور پر لکھتا ہے کہ پکھل وال ترکوں نے ترکی زبان بھلا دی ہے اور اب لاہوری زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ جہانگیر کے اس ریمارک سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ولایتِ پکھل میں پختون علاقے کی بجائے پنجاب کے اثرات زیادہ تھے۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ملک عرصۂ دراز سے سلطنتِ ٹیکسلا اور کشمیر سے وابستہ رہ چکا تھا۔ چھچھی اور کشمیر کی بیشتر ضروریاتِ زندگی پنجاب ہی سے درآمد کی جایا کرتی تھیں اور سیر و تفریح کے لئے بھی پنجاب کے باشندے اکثر ادھر آیا کرتے تھے۔ ظہیرالدین بابر کی آمد سے کچھ عرصہ قبل جو تھوڑے بہت سواتی یا تنولی باشندے یوسف زئیوں کے دباؤ سے تنگ آکر ولایت پکھلی میں داخل ہوئے تھے وہ بھی پختون نہ تھے۔ سوات اور دیر یا باجوڑ کے علاقوں میں پختو زبان کو یوسف زئیوں کی آمد کے بعد ترقی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت عرصہ بعد تک بھی ولایت پکھلی کے کسی حصے میں پختو زبان نہیں بولی جاتی تھی۔

٭

سلطان نصیر الدین حسین خان

سلطان محمود کلاں تسخیر کشمیر کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوگیا اور اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان حسین خان والیٔ پکھلی بنا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی جانشینی کی منظوری دے دی۔ توزکِ جہانگیری کے بیان کے مطابق سلطان حسین خان کا سن پیدائش ۱۵۲۳ء اور سن وفات ۱۶۲۳ء ہے، جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بیان کر دیا گیا ہے۔ سلطان محمود کلاں نے تسخیر کشمیر کے بعد اپنی ریاست کا الحاق سلطنتِ مغلیہ سے کر دیا تھا اور اکبر بادشاہ نے حاکم کشمیر یوسف خان کی طرح سلطان محمود کو پانچ صدی کا منصب عطا کر کے ولایتِ پکھلی کا حکمران نامزد کر دیا گیا، لیکن عملی طور پر ریاست کے معاملات حسبِ سابق چلتے رہے اور سرکاری عہدیداروں کی طرف سے اس ریاست کے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی گئی۔ سلطنتِ مغلیہ سے الحاق کا مطلب صرف شہنشاہِ اکبر کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہی تھا۔

اکبری فوج نے میرزا قاسم کی قیادت میں ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کر کے وہاں تمام بغاوتوں کو کامیابی سے کچل دیا تھا، لیکن ملکی انتظام اور امن و امان کی بحالی کا مسئلہ ابھی قابلِ حل تھا؛ چنانچہ اکبر بادشاہ نے کشمیر جنت نظیر کی سیر کرنے اور اس کے نظم و نسق کی اصلاح کے لئے ۹۹۷ھ بمطابق ۱۵۸۹ء میں کشمیر کے دورے کا پروگرام بنایا۔ شہنشاہ اکبر کے ہمراہ زین خان کوکا، عضد ولد ولد حکیم ابوالفتح، رام داس، قاضی حسن، جگن ناتھ، میر شریف اور ابوالفضل جیسے امراء و منصب دار بھی کشمیر روانہ ہوئے۔ شہنشاہ نے کشمیر کو ایک سرکار کا درجہ دے کر اس کے سالانہ لگان کا مسئلہ طے کر دیا اور شہزادہ سلیم کی سفارش کے مطابق یوسف خان کو ہی کشمیر کا گورنر رہنے دیا۔ کشمیر کے دورے سے فارغ ہو کر شہنشاہ کابل کے دورے پر جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لئے اس نے زین خان کوکا کو اٹک پر پل تعمیر کرنے کے لئے آگے

روانہ کر دیا۔ ۱۱ راگست ۱۵۸۹ء کو شہنشاہ اکبر نے دریائے جہلم پار کیا۔ اکبر نامہ کا بیان ہے کہ دریائے کشن گنگا کے کنارے والیٔ پکھلی سلطان حسین خان نے شہنشاہ کا استقبال کیا اور اس کی خدمت میں چند تحائف پیش کئے۔

شاہی کیمپ یہاں سے اٹھ کر پکھلی خاص کی طرف روانہ ہوا اور سلطان حسین خان کی ہمراہی میں ہاتھی میرہ پہنچ گیا؛ چونکہ ہاتھی میرہ کے مقام پر شاہی کیمپ لگانے کے جملہ انتظامات موجود تھے اس لئے شاہی عملہ کو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ سلطان حسین خان نے شہنشاہ کو گلی باغ کے صدر مقام میں اپنے گھر تشریف لانے اور اس کا ذاتی مہمان بننے کی دعوت دی جسے شہنشاہ نے قبول کر لیا۔ اکبر نامہ اور توزکِ جہانگیری میں اس دعوت کا ذکر موجود ہے۔ پکھلی خاص سے نکل کر شاہی کیمپ مانگلی سے گزر کر دھمتوڑ پہنچا۔ دھمتوڑ اس وقت ایک ریاست کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس کا والی شاہرخ تھا۔ شاہی کیمپ نالہ ورکن کی دوسری سمت اس مقام پر لگایا گیا جسے اب بھی لوگ تکیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں بھی شہنشاہ اکبر شاہرخ کا ذاتی مہمان بنا۔ اتفاق سے حکیم ابوالفتح بیمار پڑ گیا اور یہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ شہنشاہ کو حکیم ابوالفتح کی فوتیدگی سے بڑا قلق ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اسے بابا حسن ابدال کے مقام پر دفن کیا جائے۔

سلطان حسین خان بدستور شہنشاہ کی ہمراہی میں تھا، وہ اٹک بنارس تک اس کے ساتھ گیا، شہنشاہ کے اس دورے کے زمانے میں شاہی کارندوں نے کشمیر سرکار کی طرح پکھلی سرکار کا بھی بندوبست شروع کرنا اور سالانہ لگان اور خراج بھی تجویز کرنا شروع کر دیا تھا۔ سلطان حسین خان نے اس بندوبست کو اپنی ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت بے جا سمجھا اور شہنشاہ سے درخواست کی کہ ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے، لیکن اس کی درخواست کی کوئی پذیرائی نہ ہوئی جس کی وجہ سے وہ انتہائی رنجیدہ ہوا۔ چنانچہ اٹک بنارس کے مقام سے شہنشاہ کو الوداع کہنے کے بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس نے شہنشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے نصیرالدین لقب اختیار کیا اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح پکھلی کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکمرانی کرنے لگا۔

لہ اکبر نامہ انگریزی ترجمہ بیورج صفحہ ۵۲-۸۵۰

اکبری فوج پر حملہ:

شہنشاہ اکبر کو بہت جلد سلطان حسین خان کی بغاوت کا علم ہوگیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شاہراہِ کابل اور شاہراہِ کشمیر کو محفوظ رکھنے کے لئے پکھلی پر قبضہ جمانا کتنا ضروری تھا، اس لئے اس نے کسی اور صوبیدار کی بجائے اپنے پاس سے شاہی فوج کو اپنے قابل جرنیل حسن بیگ بدخشی شیخ عمری کی کمان میں سلطان حسین خان کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے روانہ کیا اور ایک شاہی فرمان کے ذریعے پکھلی سرکار کو حسن بیگ کی جاگیر بنا دیا۔ سلطان حسین خان ایک بہادر اور خودسر نوجوان تھا، اس لئے اس نے اپنی ریاست کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے طویل جدوجہد کا فیصلہ کرلیا۔ ریاست کے عوام نے اس نازک موقع پر سلطان حسین خان سے بھرپور تعاون کیا اور شاہی فوج سے ٹکر لینے پر کمربستہ ہوگئے۔

حسن بیگ بدخشی نے شاہی فوج کے ساتھ پکھلی سرکار پر حملہ کر دیا۔ میدانِ ہزارہ قارلق سے گزر کر حسن بیگ نے یکے بعد دیگرے دھمتوڑ، مانگلی اور پکھلی خاص کے بعض اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔ سلطان حسین خان شاہی فوج سے لڑتا بھڑتا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ پکھلی خاص کے میدان سے بھی پیچھے پلٹ کر درۂ کونش کے علاقے میں روپوش ہوگیا اور سردیوں کا موسم آنے تک وہاں مضبوط قلعہ بندیاں تعمیر کرکے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر حسن بیگ بدخشی نے مانگلی کو اپنا مرکزی مقام بنا کر شاہی فرمان کے مطابق تمام پکھلی سرکار کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔

شاہی کارندے اس علاقے کے بندوبست میں مصروف ہی تھے کہ سردیوں کے موسم میں سلطان نے درۂ کونش کے علاقے سے نکل کر شاہی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ شاہی فوج سلطان حسین خان کے اس اچانک حملے کا مقابلہ نہ کرسکی اور پسپا ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ سلطان حسین خان نے تمام شاہی کارندوں کو اپنی ریاست کی حدود سے باہر نکال دیا۔ حسن بیگ بدخشی شہنشاہ اکبر کے حضور میں حاضر ہوا اور سلطان حسین خان کے جرأت مندانہ حملے کی تمام داستان بیان کی۔ شہنشاہ یہ حالات سن کر سخت برہم ہوا اور اس نے حسب سابق ایک اور تازہ دم فوج حسن بیگ ہی کی کمان میں دے کر پکھلی سرکار پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔ سلطان حسین خان نے بہادری کے ساتھ شاہی فوج کا مقابلہ کیا اور گزشتہ سال کی طرح لڑتا بھڑتا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ حسن بیگ بدخشی نے دوبارہ مانگلی پر قبضہ کرلیا اور حسب سابق نئے سرے سے پکھلی سرکار کا بندوبست

شروع کر دیا۔ سلطان حسین خان درۂ کونش کے علاقے روپوش ہو کر پھر وقت کا انتظار کرنے لگا۔ پکھلی سرکار میں بدامنی اور شورش کی فضا پھیل گئی اور عوام پہاڑی علاقوں سے نکل کر شاہی فوج اور عملہ بند و بست پر چھاپے مارنے لگے۔ اس طرح شاہراہِ کشمیر سے شاہی افواج کا گزرنا محال ہو گیا۔

مآثر الامراء میں سلطان حسین خان کی بغاوت کا حال مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"[1] چونتیسویں سالِ جلوس یعنی ۹۹۷ھ میں جبکہ شہنشاہِ اکبر کشمیر کی سیر سے فارغ ہو کر زابلستان کی طرف جا رہا تھا جو کہ ولایتِ پکھلی میں واقع ہے اور پکھلی تیس کوس لمبی اور پچیس کوس چوڑی ایک ولایت ہے جو مغربی کشمیر سے ملحق ہے تو پکھلی کا حاکم سلطان حسین خان جو قرلوغ (قرلق) قبیلے سے ہے۔ اکبر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ جب امیر تیمور توران کو واپس ہو رہا تھا تو اس نے قرلوغ قوم کے کچھ آدمیوں کو اس ملک کی حفاظت کے لئے یہاں مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد سلطان حسین خان اکبر بادشاہ کے حضور سے بھاگ گیا۔ بادشاہ نے اس ولایت کو حسن بیگ بدخشی شیخ عمری کی جاگیر میں دے دیا اور اسے سلطان حسین خان کی گوشمالی کے لئے مقرر کیا۔ حسن بیگ نے بہادری اور دلاوری کے کارنامے سرانجام دے کر اس ولایت کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ جب وہ پینتیسویں سال جلوسِ اکبری میں بادشاہ کے حضور آیا تو سلطان حسین خان والی پکھلی نے دوبارہ شورش اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے نصیر الدین نام رکھا اور ولایت پکھلی کو حسن بیگ کے آدمیوں سے چھین لیا۔ حسن بیگ دوبارہ بادشاہ کے حضور سے فوج لے کر روانہ ہوا اور اس کو سخت سزا دی۔"

مآثر الامراء ایک بلند پایہ کتاب ہے، مگر اس میں جا بجا بعض فاش غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں زابلستان کو ولایتِ پکھلی کا ایک علاقہ تصور کیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ قدیم جغرافیہ اور تاریخ کا علم رکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ اس زمانے میں زابلستان سے مراد غزنی یا غزنین کا علاقہ تھا۔ اسی علاقے کی نسبت سے سلطان محمود غزنوی کو بعض مصنفین نے سلطان محمود زابلی بھی لکھا

---

[1] مآثر الامراء صفحہ ۵۶۴ جلد اول۔

ہے۔ سلطان حسین خان کو "قزلوغ" قوم کا ایک فرد تصور کرنا دوسری غلطی ہے۔ اصل لفظ قزلوغ نہیں، بلکہ جیسا کہ قرلق ترکوں کی آبادکاری کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے "قرلق" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مآثر الامراء کے مصنفین کو یہ معلوم ہی نہیں کہ قرلق ترکوں سے مراد کون سے ترک ہیں۔ امیر تیمور کے زمانے میں یہاں ترکوں کی آبادکاری کا تو ذکر کر دیا گیا ہے، لیکن سلطان حسین خان کے اجداد کی انہی قرلق ترکوں میں آبادکاری کے واقعہ کو نظر کر دیا گیا ہے۔ شاید اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان مصنفین کا اصل مقصد اکبری فتوحات کا تذکرہ کرنا ہے نہ کہ سلطان حسین خان یا اس کے خاندان کے حالات بیان کرنا ان کے پیش نظر ہے۔ گزشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ ترکوں کا قبیلۂ قرلق ان کے قدیم ترین قبیلوں میں سے ایک ہے اور اس سے مراد وہ ترک ہیں جو برفستانی علاقے کے رہنے والے ہوں۔ اسی قبیلہ میں اوغوز خان، ایلخان اور ایماد مچی برلاس جیسے نامور افراد پیدا ہوتے جن کے ناموں سے قرلقوں کی کئی شاخیں وجود میں آتی چلی گئیں۔ امیر تیمور کا نسبی تعلق بھی اسی قرلق قبیلے سے تھا۔ امیر تیمور کے منسلکہ شجرہ نسب سے اس کی تصدیق ہو رہی ہے۔ قرلق ترک امیر تیمور ہی کے آباد کرنے سے یہاں آباد چلے آ رہے تھے اور انہی میں سلطان حسین خان کے جد امجد شہاب الدین بابر آ کر آباد ہوتے تھے؛ چونکہ تیموری نسلاً قرلق ہی تھے؛ لہٰذا شہاب الدین بابر کی اولاد بھی یہاں قرلق ہی مشہور ہوئی۔

اکبر نامہ میں سلطان حسین خان کی بغاوت کا حال یوں لکھا ہے:

[1] "آگہی آمد کہ حسین بکھلی وال راہِ گریز سپرد۔ کارپردازانِ دولت چوں لختے فراوانی محصولِ آں ولایت برگزاروند آں روستائی بہ تپہ سگالی افتاد و ہماں روز کہ رایاتِ ہمایونی از رود بار سند گزشت، روبہ نگاہِ خود نہاد۔ ازیں رُوبیت وسیوم بکھلی و آں حدود را بہ بتول حسن بیگ شیخ عمری نامزد فرمودہ، روانۂ آں سرگردانیدند و بہ نیروئے اقبالِ روزافزوں چیرہ دست آمد و آں مالشہا بسزا یافت۔"

یہ ابوالفضل کی تحریر ہے اور جو لوگ ابوالفضل کی تحریروں سے واقف ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ دشمن یا باغی سرداروں کے خلاف اس کا طرزِ تخاطب اسی طرح کا ہوا کرتا تھا جس کی ایک مثال اکبر نامہ

---

[1] اکبر نامہ صفحہ ۵۶۶

کا مندرجہ بالا اقتباس ہے، بہرحال اس اقتباس سے اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ اصل تنازعہ سرکاری کارندوں کی پکھلی سرکار کی حدود میں مداخلت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ سلطان حسین خان سلطنتِ مغلیہ کے ساتھ اپنی ریاست کے الحاق کا مخالف نہیں تھا، بلکہ وہ اکبر بادشاہ کی شہنشاہیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کی حدود میں اندرونی خود مختاری چاہتا تھا۔

پکھلی سرکار کی تشکیل:

اکبر بادشاہ کو سلطان حسین خان کی بغاوت اور اس سے پیدا ہونے والی کشیدگی اور بدامنی کے تمام حالات کابل میں ہی معلوم ہو گئے؛ لہٰذا اس نے غزنی سے واپسی کے بعد اگلے سال پھر کشمیر کے دورے کا پروگرام بنایا۔ وہ اسی شاہراہِ کشمیر سے ہوتا ہوا مانگلی پہنچا۔ تمام واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے سلطان حسین خان کو ولایتِ پکھلی کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنے حضور میں طلب کیا۔ سلطان حسین خان اکبر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ شہنشاہِ اکبر کی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت مسلّمہ تھی، وہ اپنے تدبر سے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لینے کی صلاحیت رکھتا تھا؛ چنانچہ اُس نے سلطان حسین خان سے رواداری اور ہمدردی کا رویّہ اختیار کیا۔ سلطان حسین خان بدستور پکھلی سرکار کا حاکم مقرر ہوا اور حسن بیگ بدخشی شیخ عمری کو یہاں سے تبدیل کر کے سرحدی علاقے میں تعینات کیا گیا۔ سلطان حسین خان کو ریاست کے اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی اور اسے پانصدی کا عہدہ دے کر شاہی منصب داروں میں شامل کر لیا گیا۔ قبل ازیں والیٔ کشمیر یوسف شاہ کو بھی پانصدی کا عہدہ عطا کیا جا چکا تھا۔ آئینی طور پر پکھلی کو ایک سرکار کا درجہ دے کر کابل کے صوبے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میدانِ ہزارہ قارلق کو ایک پرگنہ کا درجہ دے کر اٹک کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ پکھلی سرکار کو باج و خراج سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ آئندہ سلطان حسین خان اور اس کی اولاد نے شاہی القابات ترک کر دیئے اور وہ والیانِ ریاست کی حیثیت سے یہاں حکمرانی کرنے لگے۔

آئینِ اکبری[1] میں سلطان حسین خان کا نام منصب داروں کی فہرست میں موجود ہے اور پکھلی کا تذکرہ

---

[1] آئینِ اکبری، اردو ترجمہ مولوی فدا علی صاحب، جامعہ عثمانیہ دکن جلد اوّل صفحہ ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۸۲

ایک ایسی سرکار کی حیثیت سے کیا گیا ہے جو سالانہ لگان یا خراج وغیرہ سے مستثنیٰ تھی۔ میدان ہزارہ قارلق کو اسی کتاب میں ایک پرگنہ کی حیثیت دے کر اس پر سالانہ لگان مقرر کیا گیا۔ گزشتہ اوراق میں ولایت پکھلی یا پکھلی سرکار کا جو حدود اربعہ بیان کیا گیا ہے، وہ دراصل اس تاریخی تصفیے کے بعد کا ہے اور اس میں میدان ہزارہ قارلق شامل نہیں۔ ولایت پکھلی کے اس سیاسی تصفیے کے بعد جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک پکھلی سرکار اور میدان ہزارہ قارلق کی یہی حیثیت موجود رہی۔ سلطنت مغلیہ کا تمام تاریخی ریکارڈ اس حقیقت کی شہادت پیش کر رہا ہے کہ پکھلی سرکار کو تمام مغل دور میں سلطان حسین خان کے ترک خاندان کے علاوہ کسی اور منصب دار یا جاگیردار کے قبضے میں نہیں دیا گیا۔ ہندوستان بھر میں یہ وہ واحد ریاست تھی جو سالانہ باج و خراج سے مستثنیٰ تھی اور جس کی یہ حیثیت عہد عالمگیری تک باقی رہی۔

پکھلی سرکار کی تشکیل کے بعد اکبر بادشاہ اور سلطان حسین خان میں مکمل طور پر صلح و صفائی ہو گئی۔ سلطان حسین خان نے اکبر بادشاہ کو گلی باغ میں اپنے گھر تشریف لانے کی دعوت دی، جسے اکبر بادشاہ نے قبول کر لیا۔ گلی باغ کے قلعہ فیروزہ ہی میں سلطان حسین خان کی رہائش گاہ تھی؛ چنانچہ اکبر بادشاہ مانگلی سے سفر کر کے گلی باغ گیا اور سلطان حسین خان کا ذاتی مہمان بنا۔ اس طرح اکبر بادشاہ نے سلطان حسین خان کا وقار بلند کر دیا۔ اس زمانے میں شہنشاہ کا کسی حاکم کے گھر تشریف لے جانا اور اس کا ذاتی مہمان بننا وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ توزک جہانگیری میں اکبر بادشاہ کے سلطان حسین کے گھر تشریف لے جانے اور اس کا ذاتی مہمان بننے کا واقعہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "ہفتہ ۲۵ ماہ اسفندار کو مانگلی سے کوچ کر کے پکھلی کے سامنے قیام کیا، اور دوسرے دن بٹیروں کا شکار کھیلا اور پھر سلطان حسین کی التجا پر اس کے گھر کو رونق بخشی۔ حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) بھی کشمیر جاتے ہوئے اس کے گھر تشریف لے گئے تھے۔"[1]

توزک جہانگیری کے مندرجہ بالا اقتباس سے شہنشاہ اکبر کے سلطان حسین خان کے گھر تشریف لے جانے کا دوسرا ثبوت ملتا ہے۔ سلطان حسین کی بغاوت کے بعد کشمیر کے حالات بھی ناگفتہ بہ ہو گئے تھے، جہاں ایک طرف کشمیری عوام حکومت کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا رہے تھے، وہاں خود سرکاری افسروں میں سے بعض کا رویہ بھی جارحانہ بلکہ باغیانہ ہو گیا تھا، اس لئے شہنشاہ اکبر نے ۱۵۹۲ء میں ایک بار پھر کشمیر کا دورہ کیا۔ فرید بخشی بیگی کو فوج دے کر آگے روانہ کیا گیا اور وہ باغیوں کی سرکوبی کرتا ہوا بیرا پور جا پہنچا۔ ۳ر اکتوبر ۱۵۹۲ء کو اکبر بادشاہ خود بھی کشمیر پہنچ گیا۔ تمام سازشوں کو ختم کر دیا گیا اور لگان کی شرح میں بھی کمی کر دی

---

[1] توزک جہانگیری، اردو ترجمہ شیرانی صفحہ ۸۱-۲۸۰

گئی۔ یوسف خان کو بدستور کشمیر کا گورنر مقرر کرنے کے بعد اکبر بادشاہ پکھلی کے راستے سے آگے چلا۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا اور پکھلی سرکار کے علاقے میں سخت بارش اور برفباری ہو رہی تھی۔ شہنشاہ کے ہمراہ شہزادہ سلیم، شہنشاہ مراد اور زین خان کوکا بھی تھے۔ شہنشاہ نے حسب سابق پکھلی میں سلطان حسین خان کے ہاں قیام فرمایا اور پھر شاہی سواری مانگلی سے ہو کر دہمتوڑ کی سمت میں آگے بڑھی۔ اس وقت شاہرخ کشمیر کے علاقے میں متعین تھا، اور اس کی جگہ اس کا بیٹا بہادر خان معاملات کو چلا رہا تھا۔ بارش اور برفباری جاری تھی، اس لئے سفر طویل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ شہنشاہ نے بہادر خان کے ہاں قیام فرمایا اور شاہی کیمپ حسب سابق نالہ درکن کی دوسری سمت تکیہ کے مقام پر لگایا گیا۔ بعد ازیں شہنشاہ اکبر حسن ابدال کے راستے پنجاب روانہ ہوا۔

۱۵۹۷ء میں اکبر بادشاہ نے ایک بار پھر کشمیر کا دورہ کیا۔ ۱۶۰۵ء میں طویل علالت کے بعد اکبر بادشاہ فوت ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔

۱۶۱۹ء میں جہانگیر کشمیر کی سیر کے ارادے سے لاہور سے روانہ ہوا۔ قبل ازیں اکبر بادشاہ کی ہمراہی میں وہ پکھلی اور کشمیر کی سیر کر چکا تھا اور والیان پکھلی دہمتوڑ کے ساتھ اس کے ذاتی مراسم قائم ہو چکے تھے۔ حسن ابدال سے آگے چل کر جہانگیر بادشاہ نے ہرو کے کنارے سلطان پور کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور گندگر کے پہاڑ میں کالے تیتر کا شکار کھیلا۔ یہاں ایک روز بادشاہ نے بڑی گرجدار اور مہیب آواز سنی، مگر تحقیق کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ علاقہ گکھڑ کی سرحد مارگلہ کے مقام پر ختم ہو جاتی ہے اور یہاں سے پرگنہ ہزارہ قارلق شروع ہو جاتا ہے۔ سجنے، نوشہرہ اور سلہڈ کے مقامات سے گزر کر شہنشاہ نے دہمتوڑ میں قیام فرمایا۔ اس زمانے میں دہمتوڑ کا علاقہ کنول کے پھولوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا، شاہی کیمپ نالہ درکن کی دوسری جانب تکیہ کے مقام پر لگایا گیا۔ اس جگہ ملکہ نور جہاں نے اپنے ہاتھ سے چنار کا پودا لگایا۔ انگریزوں کے عہد تک یہ درخت موجود تھا اور لوگ اسے ہندکو زبان میں "نور جہانے دا چنار" یعنی نور جہاں کا چنار پکارتے تھے۔ سلہڈ کے مقام پر مہابت خان شہنشاہ کے حضور حاضر ہوا اور جہانگیر نے اسے بنگش کے علاقے کی مہم پر روانہ کر دیا۔ بہادر خان ابن شاہرخ دہمتوڑی پہلے سے ہی جہانگیر کے حکم کے مطابق علاقہ بنگش کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جا چکا تھا۔ بہادر خان کی بہادری سے خوش ہو کر جہانگیر نے اسے دو سو پیادوں اور ایک سو سواروں کے عہدے پر فائز کر دیا۔

دھمتوڑ سے چل کر شاہی کیمپ مانگلی کے پُر فضا مقام پر پہنچا۔ والیٔ پکھلی سلطان حسین خان نے اسی مقام پر شہنشاہ کا استقبال کیا اور پھر شاہی سواری اس کی معیت میں سواد نگر سے ہوتی ہوئی پکھلی کے میدان میں جا پہنچی۔ ہاتھی میرہ کے مقام پر شاہی کیمپ لگایا گیا۔ اس کیمپ سے توران کی کھلی فضا کی ترکی زندگی کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ سلطان حسین خان نے جہانگیر کو اپنے ہاں دعوت دی اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے شہنشاہ نے اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کے گھر واقعہ گلی باغ کو رونق بخشی قلعہ فیروزہ کے وسیع صحن میں تحفوں کے تبادلے ہوئے اور کھانے کے ہمراہ ترکانِ پکھلی کے مشہور مشروب سرکے جام نوش کئے گئے۔ جہانگیر کا اپنا بیان ہے:

"[1] اگرچہ سلطان حسین کی عمر اس وقت ستر سال ہو چکی ہے، لیکن اس کے قویٰ مضبوط ہیں۔ اس موقع پر سلطان حسین کو چھ سو ذات اور تین سو سوار از اصل و اضافہ کے عہدے پر سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ اسے خلعت، مرصع جنجر اور ہاتھی عنایت کیا۔"

اسی موقع پر سلطان حسین خان نے عمدہ گھوڑے، جرہ باز اور جنجر بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے۔ پکھلی اور دھنتوڑ (دھمتوڑ) کے ترک والیوں کے بارے میں جہانگیر لکھتا ہے:

"[2] اگرچہ پکھلی اور دھنتوڑ (دھمتوڑ) کے سلاطین ایک دوسرے سے قرابت داری رکھتے ہیں، لیکن ریاست کی سرحدات کے متعلق جھگڑا جو راجاؤں اور والیوں کا خاصہ ہے، ان کے درمیان بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر میں جہانگیر نے پکھلی اور دھمتوڑ کا ذکر دو الگ ریاستوں کے طور پر کیا ہے اور ان کے والیوں کے لئے سلطان کا لقب بھی استعمال کیا ہے۔ جہانگیر کے ان الفاظ سے عہد جہانگیری میں ان دونوں ریاستوں کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔ گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ کشمیری حکمران غازی چک کے حملے کے زمانے میں ولایتِ پکھلی کے اندر دھمتوڑ کی ایک ذیلی ریاست وجود میں آ گئی تھی۔ اکبر اور جہانگیر نے ان دونوں ریاستوں کے الگ الگ وجود کو تسلیم کر لیا تھا اور ان کے والیوں کو جدا جدا مناصب عطا کر دیتے تھے، لیکن جیسا کہ آئندہ سطور میں بیان کیا جا رہا ہے۔ سلطان شاہ ان

---

[1] توزکِ جہانگیری ترجمہ شیرانی صفحہ ۳۸۱ - ۳۸۰

ابنِ سلطان حسین خان کے زمانے میں یہ دونوں ریاستیں پھر متحد ہو گئیں اور سلطان شاہ میں خان بلا شرکت غیرے اس متحدہ ریاست کا حکمران بن گیا۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اس زمانے میں پکھلی اور دہتوڑ کے لوگوں کے مکانات لکڑی کے بنے ہوتے تھے اور انہیں کشمیری نمونے پر بنایا جاتا تھا۔ امرود، ناشپاتی، خوبانی اور شفتالو اس علاقے کے مشہور پھل تھے۔ لوگ گھوڑے، گائے، بھینس، بکریاں اور خچر پالتے تھے۔ ان کے خچر چھوٹے قد کے ہوتے تھے اور کم وزن اٹھا سکتے تھے۔ جہانگیر نے اسی سفر کی ایک محفل میں قرلق ترکوں سے یہ سوال کیا کہ امیر تیمور نے ان کے اجداد کی جس ہزارہ منگ کو یہاں متعین کیا تھا۔ اس کے بڑے آدمی کا نام کیا تھا لیکن وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے، کیونکہ اس وقت تک ابتدائی بیگ باشیوں اور قاغانوں کا تاریخی ریکارڈ محفوظ نہ رہا تھا ــــــ ولایت پکھلی کے حکمرانوں کا شجرہ نسب اور ان کا تاریخی ریکارڈ اس وقت سے محفوظ چلا آ رہا تھا، جبکہ سلطان حسین خان کے جدِ امجد یہاں پہلے سے موجود قرلق ترکوں میں آکر آباد ہوئے اور انہوں نے یہاں آزاد حکمران کی حیثیت سے حکمرانی کا آغاز کیا تھا۔

پکھلی کے قیام کے دوران میں شاہی کیمپ میں موجود جانوروں کی تعداد میں کمی کر دی گئی، لیکن اس کے باوجود ۷۰۰ ہاتھی باقی تھے۔ اس وقت دریائے نین سکھ دو حصوں میں تقسیم تھا، اس لئے اس پر ۱۸ × ۵ اور ۱۴ × ۵ ہاتھ کے دو پل تعمیر کئے گئے اور شاہی سواری ان سے گزر کر دریائے کشن گنگا کے کنارے جا پہنچی۔ یہاں پہنچ کر بادشاہ نے پیرو رنگ کوتل کا معائنہ کیا اور ایک خوبصورت آبشار کے کنارے محفل مے نوشی منعقد ہوئی۔ دریائے کشن گنگا پر ۵۴ × ½ گز کا ایک پرانا پل موجود تھا، لیکن جہانگیر نے اسے ناپسند کیا اور ایک نیا اور مضبوط پل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

پل کی جائے تعمیر کا انتخاب کرنے کے لئے اقبال نامے کے مصنف معتمد خان کو روانہ کیا گیا۔ معتمد خان نے کشن گنگا اور بہت (جہلم) کے مقامِ اتصال پر ایک سبز جگہ کو پل کی تعمیر کے لئے منتخب کیا؛ چنانچہ شاہی حکم کے مطابق اسی مقام پر ایک مضبوط پل تعمیر کیا گیا۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد شاہی سواری دریائے جہلم کے کنارے کے ساتھ ساتھ بارہ مولا کی جانب آگے روانہ ہوئی اور شاہی کیمپ بھولیاس کے مقام پر لگایا گیا۔ بھولیاس تک کا علاقہ ولایت پکھلی میں شامل تھا اور اس سے آگے وادیٔ کشمیر کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ حسن ابدال سے کشمیر تک ۲۵ دن، ۱۹ سفر اور ۴ قیام کرنے پڑے۔ حسن ابدال سے کشمیر تک کل ۵۰ کوس فاصلہ طے ہوا، چونکہ بارش اور برفباری کے موسم میں سفر تکلیف دہ بن جاتا تھا،

اس لئے شہنشاہ نے ہرپڑاؤ کے مقام پر سرکاری بنگلے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ شہنشاہ سیر کشمیر سے نومبر ۱۶۲۰ء تک واپس لاہور روانہ ہوا۔ ۱۶۲۱ء اور ۱۶۲۵ء میں جہانگیر بادشاہ نے حسب سابق کشمیر کی سیر کی اور ۱۶۲۷ء میں کشمیر کے آخری دورے سے واپسی پر راستے ہی میں فوت ہوا اور اسے لاہور میں دفن کیا گیا۔

والیٔ پکھلی سلطان حسین خان عہد جہانگیری میں ۱۶۲۳ء میں فوت ہوا اور شہنشاہ نے اس کی وفات کی خبر سنتے ہی اس کے بڑے بیٹے سلطان شادمان خان کو اس کے منصب پر بحال کر دیا۔ توزک جہانگیری میں اس دور کے مندرجہ بالا تمام حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سلطان حسین خان کی شخصیت اور اس کے تدبر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے دو بار بڑی بہادری کے ساتھ اکبری فوج کا مقابلہ کیا اور اکبر بادشاہ پر ثابت کر دیا کہ اگر اسے کشمیر پر قبضہ برقرار رکھنا ہے تو شاہراہ کشمیر کی حفاظت کے لئے اسے سلطان حسین خان کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ اکبری دور سے قبل ولایت پکھلی پر کشمیری حکمران غازی چک کو بالادستی حاصل ہو چکی تھی اور جب سلطان محمود نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ اپنی ریاست کا الحاق کیا تو اس کے معنی ہی یہ تھے کہ اس نے شہنشاہ اکبر کی بالادستی کو تسلیم کر لیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ شاہی کارندے ولایت پکھلی کے بندوبست کے بعد اسے کشمیر سرکار ہی کے ماتحت ایک پرگنہ کی حیثیت دے دیتے، لیکن سلطان حسین خان نے وقت کے سب سے بڑے حکمران سے ٹکر لے کر اپنی ریاست کو نہ صرف کشمیر سرکار کے برابر درجہ والی سرکار تسلیم کرا لیا، بلکہ اندرونی خود مختاری بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد کشمیر سرکار کے گورنر ہمیشہ مرکزی حکومت مقرر کیا کرتی تھی اور ان کی تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، لیکن پکھلی سرکار ایک ایسی موروثی ریاست بن گئی، جس کے حکمران اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک ہمیشہ سلطان حسین خان ہی کی اولاد سے بنتے رہے۔

تحریکِ روشنائی

تحریک روشنائی بنیادی طور پر ایک ایسی مذہبی تحریک تھی جس کا سیاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس تحریک کا بانی میاں بایزید انصاری ساکن جالندھر تھا۔ میاں بایزید ایک زیرک انسان تھا اور دینی علوم میں اسے خاصی دسترس حاصل تھی۔ بحث و مناظرہ میں وہ اپنے مخالفین کو بارہا شکست دے چکا تھا۔ ۱۵۴۲ء میں اس کی تحریک چل نکلی اور وہ خود پیر روشن کے نام سے مشہور ہوگیا۔ رفتہ رفتہ پیر روشن کے عقائد اور اس کے عزائم میں تغیر رونما ہوتا چلا گیا اور اس کے متبعین نے ایک فرقے کی صورت اختیار کرلی۔ علماء نے اس روشنائی فرقے کے خلاف جو الزامات عائد کئے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ پیر روشن خدا کو حاضر و موجود ماننے کا قائل نہ تھا اور نہ ہی وہ سمت قبلہ کو درست تسلیم کرتا تھا۔ اجتماع اور عبادت کے وقت اس کے مریدین اپنے ہمراہ عورتوں کو بھی لے آتے تھے اور اس طرح فحش حرکات اور زناکاری میں ملوث ہوجاتے۔ وہ غسلِ جنابت کے بھی قائل نہ تھے۔ ان حرکات کی وجہ سے شہوت رانی کے پرستار لوگ پیر روشن کی طرف مائل ہونے لگے۔ اس فرقے کے لوگوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ وہ اپنے حلقے سے باہر کے لوگوں کو مردہ تصور کرکے ان کے مال و اسباب کو اپنے لئے حلال قرار دیتے تھے۔ دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے والوں کو یہ عقیدہ بہت پسند آیا اور ان کی اچھی خاصی تعداد ڈاکہ زنی پر تیار ہوگئی۔

میاں بایزید انصاری المعروف پیر روشن کے عزائم کے لئے پنجاب جیسے مستحکم سیاسی نظام جیسا علاقہ موزوں نہ تھا، اس لئے اس نے سرحدی علاقے میں سکونت اختیار کرکے پٹھان قبائل کو اپنی طرف مائل کرنا شروع کردیا۔ میاں بایزید کا بیٹا جلالہ اپنے عزائم میں باپ سے بھی چار قدم آگے تھا۔ باپ بیٹے کو جاہل عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے شاہراہ کابل کے اردگرد ڈاکہ زنی کا آغاز کردیا۔

وہ لوٹ مار کے مال میں سے پانچواں حصہ غربا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس زمانے کے پختون قبائل کے لئے مالی منفعت میں روشنائی فرقے کی مقبولیت کا پورا سامان موجود تھا۔ آفریدی، مہمند، خلیل اور رک زئی اور بنگش قبائل کی بڑی تعداد نے روشنائی فرقے میں شمولیت کر لی۔ شاہراہ کابل خطرے میں پڑ گئی۔ مسافروں، تجارتی قافلوں بلکہ شاہی افواج پر بھی چھاپے مارنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مان سنگھ، ٹوڈر مل، اسمٰعیل قلی خان اور سید بخاری جیسے افسر وادیٔ پشاور میں امن و امان بحال نہ کر سکے۔

اس زمانے میں کابل کا علاقہ سلطنتِ مغلیہ کا ایک حصہ تھا اور حکومت کے لئے شاہراہِ کابل کو محفوظ رکھنا نہایت ضروری تھا۔ عبداللہ خان اوزبک پنجاب کے علاقے میں پیش قدمی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ سرحدی قبائل کی شورش اس کے عزائم کی تکمیل کا سبب بن جائے گی لہٰذا اکبر بادشاہ نے ۱۵۸۸ء میں صادق خان کو سرحدی علاقے میں متعین کر دیا۔ صادق خان کی نئی سرحدی پالیسی کی وجہ سے بیشتر قبائل پر امن ہو گئے اور اہم ناکوں پر فوج کے دستے متعین کر دیئے گئے۔

علاقہ یوسف زئی میں پیر روشن کی قبولیت شاہراہِ کشمیر اور پکھلی سرکار دونوں کے لئے خطرے کی علامت تھی۔ یوسف زئی کثرت سے روشنائی فرقے میں شمولیت اختیار کرنے لگے اور علماء کے فتوے اور وعظ بے سود نظر آنے لگے۔ اس نازک دور میں حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا صاحب نے علاقہ یوسف زئی میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ آپ کو اخوند درویزہ بابا جیسا لائق رفیق بھی مل گیا۔ آپ نے لوگ کے عقائد کی اصلاح شروع کر دی اور پیر روشن کو پیر تاریک کا نام دے کر اس کا مقابلہ شروع کر دیا۔ علاقہ یوسف زئی کے عوام دو حصوں میں بٹ گئے اور ان کے درمیان شدید کشمکش شروع ہو گئی موضع سرکادی اور موضع مینی میں روشنائیوں نے اپنے مخالفین سے کامیاب لڑائیاں لڑیں، لیکن باڑہ کی لڑائی میں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی افواج حرکت میں آگئیں اور انہوں نے روشنائیوں کو شکست دے کر سخت سزا دی۔ بایزید ۱۵۸۹ء میں فوت ہو گیا۔ ۱۵۹۳ء میں پیر تاریک بایزید کے بیٹے جلالہ کو اس کے اہل خانہ اور سات ہزار افراد سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ باڑہ کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد بایزید کے دو بیٹے شیخ عمر اور خیر الدین تربیلہ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھے لیکن یہاں مراد بیگ نے انہیں گرفتار کر لیا۔ جلالہ کو اٹک کے مقام پر اکبر بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔ اکبر بادشاہ نے اس سے اچھا سلوک کیا اور کچھ عرصہ اسے دربار سے منسلک رکھا، لیکن تھوڑے دنوں

بعد وہ دربار سے بھاگ کر آفریدیوں میں جا پہنچا۔

۱۵۹۳ء میں حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا صاحب فوت ہوئے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ بایزید المعروف پیر روشن کی تحریک الحاد کا مقابلہ کرنا ہے۔ کچھ لوگ جب اکبر بادشاہ اور حضرت پیر بابا صاحب دونوں کو روشنائی تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو انہیں شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید ان دونوں میں باہمی مفاہمت موجود تھی، لیکن تحریکِ روشنائی کے عقائد اور اس کے طرزِ عمل سے صاف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت پیر بابا صاحب نے خلافِ اسلام عقائد کی وجہ سے پیر روشن کی مخالفت کی تھی اور اکبر بادشاہ نے شاہراہِ کابل کو محفوظ رکھنے کے لئے روشنائیوں کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ ۱۸۸۲ء میں شہنشاہِ اکبر کے حکم سے قلعہ اٹک تعمیر کیا گیا اور پرگنہ ہزارہ قارلق کو بھی اس سے منسلک کیا گیا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں زین خان کوکا اٹک بنارس کا فوجدار تھا۔ اس قلعہ کی تعمیر کا بڑا مقصد شاہراہِ کابل کی حفاظت کرنا اور سوات، بجوڑ اور دیر تک کے علاقوں کی نگرانی کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ قلعہ اٹک بنارس کو پشاور اور پکھلی کے تمام درمیانی علاقے میں مرکزی علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

حسن بیگ بدخشی کا انجام:

حسن بیگ اکبری عہد کا مشہور جرنیل تھا، اس نے کئی مہم مہمات کی سربراہی کا فریضہ نہایت عمدگی اور کامیابی سے سرانجام دیا تھا۔ سلطان حسین خان کے ساتھ تصفیہ ہو جانے کے بعد شہنشاہِ اکبر نے اسے یہاں سے تبدیل کر کے پختون علاقے میں متعین کر دیا اور پکھلی کی بجائے رہتاس اس کی جاگیر میں دے دی گئی۔ حسن بیگ ایک عرصہ تک پختون علاقے میں عمدہ کارنامے سرانجام دیتا رہا اور شاہی دربار میں اس کی قدر و منزلت میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شاہزادہ خسرو کی بغاوت کے زمانے میں اس نے جہانگیر کے خلاف شہزادے کی حمایت کی، لیکن بغاوت کے زمانے میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جہانگیر نے سزا کے طور پر اسے گدھے کی کھال میں سی دینے کا حکم دیا۔ جہانگیر کے حکم پر عمل کیا گیا اور وہ تیسرے دن کھال میں مردہ پایا گیا۔ اس زمانے میں باغیوں کو اس قسم کی سزا دینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ حسن بیگ بدخشی کا یہ انجام مآثر الامراء (رک رج ۶- ۵۶۵) اور توزکِ جہانگیری (صفحہ ۷۰ ترجمہ قدوسی) دونوں کے

سلطان حسین خان ۱۶۲۳ء میں فوت ہوا۔ وہ ولایتِ پکھلی کا بہادر اور نامور حکمران تھا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کے خلاف اس زمانے میں بغاوت کی جبکہ ہندوستان بھر کے راجے اور مہاراجے اکبر کے رعب سے لرزہ براندام تھے۔ اس نے حسن بیگ جیسے نامور جرنیل کی سرکردگی میں بھیجی ہوئی شاہی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ثابت کر دیا کہ ولایتِ پکھلی میں کئی پشتوں تک زندگی بسر کرنے کے باوجود ترکانِ پکھلی اکبری فوج کے حملے کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی سکت رکھتے ہیں؛ چنانچہ شہنشاہِ اکبر نے اس کی جرأت اور دلیری سے متاثر ہو کر اسے اپنا ہمنوا بنانے کی کامیاب سیاسی کوشش کی۔ سلطان حسین خان نے اپنا شاہی لقب کر کے اگرچہ اکبر کی بالادستی کو تسلیم کر لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی اندرونی خود مختاری کو بھی تسلیم کرا لیا۔ اس تصفیہ سے جہاں ایک طرف سلطان حسین خاندان بدستور باوقار بنا رہا، وہاں یہ ملک بیرونی حملوں سے بھی تقریباً ایک سو سال کے آئندہ کے عرصے کے لئے محفوظ ہو گیا۔ اکبری دور میں بیسیوں راجاؤں نے اکبر کے خلاف بغاوتیں کیں، لیکن ان بغاوتوں کے فرو ہو جانے کے بعد کسی بھی والیٔ ریاست کو وہ ممتاز مقام حاصل نہ ہو سکا جو یہاں سلطان حسین خان کو حاصل ہوا۔ امن و امان بحال ہو جانے کے بعد سلطان حسین خان نے پکھلی سرکار کے تمام اہم شہروں اور قلعوں کو وسعت دی۔ ہندوستان بھر سے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے لئے اس سرکار میں کشش پیدا کر دی گئی۔ دھمتوڑ، مانگلی، بیداوی اور گلی باغ جیسے شہروں میں ہندوستان، کشمیر اور زابلستان تک کے باہنر افراد آ کر آباد ہو گئے اور ملک میں خوش حالی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

٭

سلطان شادمان خان

توزکِ جہانگیری کے بیان کے مطابق سلطان حُسین خان ۱۶۶۳ء بمطابق ۱۰۳۲ھ میں فوت ہوا۔ اس کی وفات کی خبر سنتے ہی جہانگیر نے اس کے بڑے بیٹے سلطان شادمان کو اس کا جانشین نامزد کر دیا اور ایک شاہی فرمان جاری کر کے اسے اپنے باپ کے منصب پر فائز کر دیا۔ سلطان شادمان اعلیٰ جنگی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنے دور کی عظیم ترین فوجی مہمات میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے تمام مغل افواج میں دُور دُور تک شہرت اور ناموری حاصل کی۔ شہنشاہ شاہ جہان نے سلطان شادمان خان کو بہادری اور دلاوری کے عمدہ کارنامے بجا لانے کی بدولت ہزاری منصب داروں کے بلند مرتبے پر فائز کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کشمیر اور سرحدی علاقے میں سلطان شادمان خان پہلا منصب دار تھا جسے ہزاری منصب داری کی صف میں شامل کیا گیا۔ آئندہ سطور میں شاہجہان نامے کے حوالہ جات سے بیان کیا جا رہا ہے کہ سلطان شادمان نے قدیم ہزارہ کی فوج کی سربراہی کرتے ہوئے سرحد، بلخ، بدخشان اور قندھار کے دُور دراز علاقوں میں کیسے کیسے فوجی کارنامے سرانجام دیئے۔ اعلیٰ درجے کا فوجی کمانڈر ہونے کے ساتھ ساتھ سلطان شادمان خان ایک بلند پایہ مدبر اور منتظم بھی تھا۔ اس کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں گلی باغ، مانگلی اور دھمتوڑ جیسے شہروں نے بے مثال ترقی کی۔ جس طرح ہندوستان بھر میں شاہجہان کے زمانے کو سلطنتِ مغلیہ کا سنہری زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سلطان شادمان خان کے زمانے کو پکھلی سرکار کا سنہری زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سلطان شادمان خان نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دھمتوڑ کی ذیلی ریاست کو دوبارہ پکھلی کے ساتھ شامل کر کے گلی باغ کے ماتحت کر دیا۔ لوگ محبت سے اسے شادم سلطان کے نام سے پکارتے تھے۔ سلطان شادمان کے

دوسرے بھائیوں میں سے ایک کا نام لشکری خان اور دوسرے کا نام ابدال خان تھا۔ اس نے لشکری خان کو حاکم دہتوڑ اور ابدال خان کو علاقہ مظفر آباد کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس زمانے میں بمبہ قوم کے سرکردہ افراد ترکوں کے کاردار تھے۔ سلطان شادمان کا تیسرا بھائی یاور خان بھی حاکم دہتوڑ رہ چکا تھا۔

مہمات بلخ و بدخشاں :

نورالدین جہانگیر ۱۶۲۷ء میں فوت ہوا اور اسے لاہور میں دفن کر دیا گیا۔ تخت نشینی کی جنگ میں اس کا بیٹا شاہ جہان کامیاب رہا۔ یوں تو تمام تیموریوں کے دلوں میں اپنے آبائی وطن توران، بالخصوص امیر تیمور کے دارالحکومت سمرقند کو فتح کرنے کی تمنا موجود تھی، لیکن شاہجہان توران کو فتح کرنے کا اتنا دلدادہ تھا کہ اس مقصد کے لئے سلطنت کے تمام وسائل بروئے کار لانے کا تہیہ کر لیا۔ شاہجہان نے برصغیر کی تمام معتبر جنگ جو اقوام سے چیدہ چیدہ منصب داروں کا انتخاب کر کے انہیں مہمات بلخ و بدخشاں میں شامل کر دیا۔ یکے بعد دیگرے شہزادہ مراد بخش، شہزادہ اورنگزیب اور شہزادہ داراشکوہ کی کمانڈ میں عظیم مہمات بلخ و بدخشاں کے علاقے میں روانہ کی گئیں۔ امیرالامراء علی مردان خان اور علامہ اسداللہ خان جیسے تجربہ کار جرنیل اور مدبران مہمات کی رہنمائی کے لئے روانہ کئے گئے۔

والی کچھلی سلطان شادمان خان کو بھی ان مہمات میں شمولیت کی دعوت دی گئی جسے اس نے بصد شوق قبول کر لیا۔ تیموری ابھی تک توران کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ رہے تھے۔

بلخ کی پہلی مہم شہزادہ مراد بخش اور امیرالامراء علی مردان خان کی سرکردگی میں روانہ کی گئی۔ اس مہم میں حصہ لینے والی فوج پچاس ہزار سواروں اور دس ہزار پیادہ سپاہ پر مشتمل تھی۔ روانگی کے وقت اس فوج کی تنظیم اور طریق جنگ کے بارے میں مندرجہ ذیل ہدایات جاری کی گئیں۔

"[1] قرار یافت کہ ہنگام آرائش صفوف امیرالامراء (علی مردان خان) در یمین و نجابت خان در یسار قیام نمودہ نبرد آزما گردند و فوج ہراول بسرکردگی بہادر خان و راجہ بیتھلداس وغیرہ . . . . . وطرح دست راست با اصالت خان و راجہ جے سنگھ، راجہ رُوپ

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم صفحہ ۳۸۴

سنگھ، بڑگوجر و سید اسعد اللہ و شادمان پچھلی وال و جمعے دیگر از بندہائے منصب دار محکم شدہ۔"

ترجمہ: قرار پایا کہ افواج کہ ہنگام آرائش کے وقت امیر الامراء علی مردان خان دست راست میں متعین ہوں اور نجابت خان دست چپ میں شامل ہو کر نبرد آزما ہوں۔ ہراول کی فوج بہادر خان اور راجہ بیٹھلداس وغیرہ کی رہنمائی میں لڑے اور دست راست کو اصالت خان، راجہ جے سنگھ، راجہ روپ سنگھ، راجہ جے رام، بڑگوجر، سید اسعد اللہ اور شادمان پچھلی وال اور دوسرے منصب داروں سے محکم کیا جائے۔

مندرجہ بالا فرمان شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شادمان خان کو پچاس ہزار سواروں اور دس ہزار پیادوں کی اس عظیم فوج میں دست راست میں متعین کیا گیا۔ جن منصب داروں کے نام مندرجہ بالا شاہی فرمان میں بیان کئے گئے ہیں، انہیں کو اس فوج میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ فوج پیش قدمی کرتی ہوئی بدخشاں اور بلخ کے علاقوں تک جا پہنچی اور اسے اہم ابتدائی کامیابیاں حاصل ہوئیں، لیکن شہزادہ مراد بخش اس علاقے کی پہاڑی زندگی سے بہت جلد بیزار ہو گیا اور شاہ جہان کے اصرار کے باوجود میدان جنگ سے واپس لوٹ آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک تیموری شہزادہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا اور عیاشی کی زندگی میں مبتلا ہو کر عسکری زندگی سے گریز کرنے پر آمادہ ہوا۔ شہنشاہ شہزادہ مراد بخش کی اس گستاخی اور سہل پسندی پر سخت برہم ہوا اور اسی وجہ سے شہزادہ مذکور پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ اس موقع پر انتہائی ناراضگی کی حالت میں شہنشاہ نے جو فرمان کیا، اس میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی شامل تھے۔

"[1] لاجرم بندہا را از رفتن خانۂ شہزادہ منع نمودہ و بہادر خان و اصالت خان را تسلیم صوبیداری بلخ فرمودہ . . . . . و محافظت آقچہ بشادمان پچھلی وال مقرر گردانیدند۔"

ترجمہ: سرکاری ملازمین کو شہزادہ مراد بخش کے گھر جانے سے منع کر دیا گیا۔ بلخ کی صوبیداری کا عہدہ بہادر خان اور اصالت خان کو سپرد کیا گیا۔ . . . . . اور آقچہ کی چھاؤنی کی حفاظت کے لئے شادمان پچھلی وال کو مقرر کیا گیا۔

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ تمام فوج میں بہادر خان، اصالت خان اور شادمان خان کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس زمانے میں صوبیدار فوجی کمانڈر ہونے کے علاوہ سول انتظامیہ کے بھی سربراہ ہوا کرتے تھے،

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم صفحہ ۳۸۴۔

چونکہ بلخ کا علاقہ میدانِ جنگ بنا ہوا تھا، شاید اس لئے بہادر خان اور اصالت خان دونوں کو اس کی صوبیداری کا عہدہ تفویض کیا گیا تاکہ وہ اس علاقے کے پیچیدہ مسائل کو بطریقِ احسن حل کر سکیں۔ آقچہ فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا، لہٰذا اس کا دفاع شادمان خان کے حوالے کیا گیا۔ اس فرمان سے شاہی فوج میں سلطان شادمان خان کے منصب اور وقار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شہزادہ مراد بخش کی واپسی کے بعد مندرجہ بالا تینوں کمانڈروں نے صوبہ بلخ کا انتظام مضبوطی سے قائم رکھا۔ بعد ازیں اورنگزیب کو اس فوج کی سربراہی کیلئے متعین کیا گیا۔ اورنگزیب ایک جفاکش، ہوشیار اور مدبر شاہزادہ تھا۔ اس علاقے کی آئندہ ہونے والی تمام لڑائیوں میں اورنگ زیب کی سیاسی اور فوجی صلاحیتوں کا ایک ایسا نقش قائم ہو گیا، جو آئندہ زندگی میں اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوتا رہا۔ اورنگ زیب نے اوزبک اور الامان کے خلاف نمایاں کارنامے سرانجام دیئے جن کی بدولت اس علاقے میں شاہی افواج کی چابکدستی اور بہادری کا سکہ بیٹھ گیا۔ ۱۰۵۷ھ بمطابق ۱۶۴۷ء میں جب اورنگ زیب بلخ کے قریب پہنچا، تو اسے معلوم ہوا کہ بخارا کے حاکم نذر محمد خان کا بڑا بیٹا عبدالعزیز قرشی جیحوں کے علاقہ کی طرف متوجہ ہے اور اس نے بیگ اوغلی کو توران کے لشکر کے ساتھ اپنے پاس سے روانہ کر دیا ہے اور وہ دریائے آمویہ کو عبور کر کے آقچہ کے قرب و جوار میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اس وقت نذر محمد خان کا دوسرا بیٹا بھی اس کے پاس آن پہنچا۔ ان دونوں بھائیوں کی متحدہ فوج سے آقچہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا۔ اب توران کا یہ عظیم لشکر سلطان شادمان کے مدِ مقابل کھڑا تھا۔ سلطان شادمان خان اور بہادر خان نے دشمن پر اس دلیری اور جرأت سے حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے پسپا ہو گیا۔ اس لڑائی کے بارے میں شاہی وقائع نویس نے جو رپورٹ بھیجی، اس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے:

"[1] طائفہ کہ در آقچہ رُو در نہادہ بودند شادمان بکھلی وال نبرد آنہا پرداختہ تنبیہ قرار واقع نمود . . . . . وخان شہامت نشان بہادر خان مراسم تعاقب بجا آوردہ مجمعے از گروہِ ناعاقبت اندیش را متعاقب یک دگر بعالم دیگر فرستاد۔"

ترجمہ: دشمن کا جو گروہ آقچہ تک پیش قدمی کرتا ہوا آن پہنچا تھا۔ سلطان شادمان خان نے

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم صفحہ ۴۱۳

نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے خوب سزا دی ۔ سلطان شہامت نشان بہادر خان نے بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے ان کی جمعیت کو قتل کر کے اگلے جہان بھجوا دیا۔

یہ صرف آقچہ کی چھاؤنی پر دشمن کے حملے اور شادمان خان کے ہاتھوں اس کی پسپائی کی ایک رپورٹ ہے۔ بلخ و بدخشاں کے دوسرے علاقوں میں ہونے والی لڑائیاں کی مفصل رپورٹیں شاہجہان نامہ میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مقام پر سلطان شادمان نے دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس دور کی افواج کے بارے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ شاہی افواج دو قسم کی ہوا کرتی تھی اس فوج کے Pay Master General کو میر بخشی کہا جاتا تھا۔ دوسری قسم اس فوج کی تھی، جو والیانِ ریاست اپنے اپنے علاقوں سے بھرتی کیا کرتے تھے۔ دونوں قسم کی افواج کی بھرتی، تنظیم اور ضبط کے بارے میں موقع و محل کے لحاظ سے فرامینِ شاہی جاری ہوا کرتے تھے۔ سلاطینِ پکھلی کی افواج میں ہمیشہ پکھلی سرکار کے باشندوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ ان میں اسپ سوار، پیادہ، بندوقچی، شمشیر زن، نیزہ باز اور توپچی سبھی شامل ہوا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر شاہجہان کے عہد میں کل آٹھ لاکھ اسپ سوار موجود تھے۔ پوری دنیا میں اتنی بڑی اسپ سوار فوج کسی حکمران کے پاس موجود نہ تھی، مگر شاہی افواج کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ سست رفتار تھیں۔ اکثر ہندوستانی سپاہ بلخ، بدخشاں اور قندھار جیسے سرد پہاڑی علاقوں میں لڑائی لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زرِ کثیر صرف کرنے کے باوجود اس فوج کو اتنی کامیابی حاصل نہ ہو سکی، جتنی کہ متوقع تھی۔ اب تک ہندوستان بھر میں ترکوں کو آباد ہوئے کئی پشتیں گزر چکی تھیں، اس لئے اب ان کے خون میں وہ گرمیٔ رفتار باقی نہ رہی تھی جو ان کے جری اور بہادر اسلاف میں موجود تھی۔ شاید یہ ولایتِ پکھلی کی سرد آب و ہوا اور پہاڑی زندگی کا اثر تھا کہ اس علاقے کے سپاہیوں نے سلطان شادمان کی کمان میں بہادرانہ کارنامے سرانجام دیئے۔ انہی مہمات میں عمدہ کارنامے سرانجام دینے کی بنا پر شاہ جہان نے سلطان شادمان کو ہزاری منصب داروں کے بلند مرتبہ پر پہنچا دیا۔ شاہجہان نامے کا بیان ہے:

"[1] شادمان پکھلی وال بمنصب ہزاری نہصدی سوار از اصل و اضافہ سرفرازی یافتہ عزّ و افتخار جاوید حاصل نمودند۔"

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم صفحہ ۱۶۴

ترجمہ : شادمان پچھلی وال نے ہزاری نہصدی سوار از اصل و اضافہ کے منصب کو حاصل کر کے ہمیشہ رہنے والی عزت اور افتخار حاصل کر لی۔

شاہجہان نامے میں شاہجہانی دور کے تمام منصب داروں کو ایک فہرست منسلک کی گئی ہے بس میں سلطان شادمان خان کا نام ہزاری منصب داروں کی فہرست میں درج کیا ہوا ہے۔ بلخ و بدخشاں کی مہمات کے بعد قندھار کے گورنر کی اشد عاپر ۱۶۳۵ء میں ایک مہم تسخیر قندھار کے لئے روانہ کی گئی جس نے معمولی مقابلہ کے بعد قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر ۱۶۳۸ء کے سردیوں کے موسم میں ایران کے بادشاہ عباس نے دوبارہ قندھار پر قبضہ کر لیا؛ چنانچہ شاہجہان نے یکے بعد دیگرے شہزادہ اورنگ زیب، اسعد اللہ خان اور داراشکوہ کی سرکردگی میں تین مہمات تسخیر قندھار کے لئے روانہ کیں۔ ان تمام مہمات میں سلطان شادمان خان نے بھرپور حصہ لیا لیکن سرد موسم اور شہزادوں کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے قندھار فتح نہ ہو سکا۔ ان تمام مہمات سے فارغ ہونے کے بعد سلطان شادمان خان کو قلعہ اٹک کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ سلطان شادمان خان نے اپنی عمر کا آخری حصہ پچھلی سرکار کے قصبوں اور قلعوں کی تعمیر و ترقی میں صرف کیا۔ ان قصبوں اور قلعوں کی تعمیر و ترقی کے مفصل حالات علیحدہ عنوانات کے تحت آئندہ اوراق میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے سلطان شادمان خان کی تعمیری صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

سرحدی بغاوت :

سرحدی علاقے کے درے، بالخصوص درۂ خیبر ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کی گزرگاہ بنا رہا۔ یہ دشوار گزار درے اب تک پختون باشندوں کے مسکن ہیں۔ عرصہ دراز تک ان دروں کے اردگرد بسنے والے قبائل کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر مویشیوں پر تھا۔ دروں میں سے گزرنے والے قافلوں پر ڈاکہ زنی کرنا قبائل کے لئے کچھ مشکل نہ تھا، بلکہ شاہی افواج تک بھی ان قبائل کی زد میں تھیں۔ ان دروں کا محل وقوع ایسا تھا کہ قبائلیوں کی تھوڑی سی تعداد بھی ایک بڑی فوج کا راستہ مسدود کر سکتی تھی؛ چونکہ سلطنت مغلیہ میں کابل کا اہم صوبہ بھی شامل تھا، اس لئے حکومت کے لئے شاہراہ کابل کو محفوظ رکھنا نہایت ضروری تھا۔ اٹک اور پشاور کے قلعوں کی تعمیر و ترقی کی بڑی وجہ یہی تھی، لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود ہر حکمران کے عہد میں سرحدی علاقوں میں افراد کی بغاوتیں ہوتی رہیں۔

شاہجہان کے زمانے میں جو بغاوت ہوئی، اس کا سرغنہ کمال الدین افغان تھا جس کے پیش نظر محض لوٹ مار نہ تھی، بلکہ وہ دریائے سندھ اور کابل کے درمیانی علاقے میں ایک آزاد افغان ریاست کے قیام کا متمنی تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے تمام سرحدی بیں حکومت کے خلاف جذبات کی آگ بھڑکا دی اور سرحدی باشندے اس کی آواز پر بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس بغاوت کی ابتدا میں شائع وقائع نویس نے مندرجہ ذیل رپورٹ بھجوائی:

"[1] از نوشتہ داؤد خان و داؤد گماشتہ لشکر خان بریں مضمون آگاہی یافت کہ کمال الدین ناقص نہاد از آشفتہ مغزی پیوستہ سودائے خودکامی در سر بے ہوش او در جوش بود ہمواره ریاست افغاناں مے خواست از آب اٹک گرفتہ تا نواحی کابل افغاناں را بشورش در آورد و را خود متحمر و مقرر ساختہ کہ از پشاور در فتنہ سرکند بنابریں آں ذوالقدر خان و علی بیگ بخشی آں تھانہ را بشادمان پکھلی وال و خضر کھکر و چندے از احدیاں و تابینان خود نگہبانی کوہاٹ تعین نمودہ خود را در عرض یک و نیم پہر بہ پشاور رسانید۔"

مندرجہ بالا اقتباس کے علاوہ "شاہجہان نامہ" میں اس بغاوت کے تفصیلی حالات درج ہیں ان حالات کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جن منصب داروں کا انتخاب کیا گیا۔ ان میں شادمان خان کا نام سرفہرست تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان منصب داروں نے کمال الدین کی بغاوت کو فرو کر کے تمام علاقے میں امن و امان قائم کر دیا۔ شاہراہ کابل محفوظ ہو گئی اور اس پر سے نہ صرف فوجی گزرتے بلکہ تجارتی قافلے بھی امن و امان سے گزرنے لگے۔ کوہاٹ کے علاقے میں سلطان شادمان خان نے نہایت جوانمردی سے باغیوں کا مقابلہ کیا اور ان کی تمام کمین گاہوں کو تباہ و برباد کر کے اس پرآشوب علاقے میں امن و امان بحال کر دیا۔ اس بغاوت کے فرو ہو جانے کے بعد عہد شاہجہانی میں کسی اور قبائلی سردار کو بغاوت کی جرأت نہ ہوئی اور لوگ پرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ علاقہ گکھڑ (راولپنڈی تا بحد جہلم) کے گکھڑ سردار بھی جن میں خضر اور سلال خان کے نام قابل ذکر ہیں، بلخ و بدخشاں اور سرحد کی مہمات میں سلطان شادمان خان کی معیت میں حصہ لیتے رہے۔

---

[1] شاہجہان نامہ جلد دوم [illegible] ص ۳۱۴

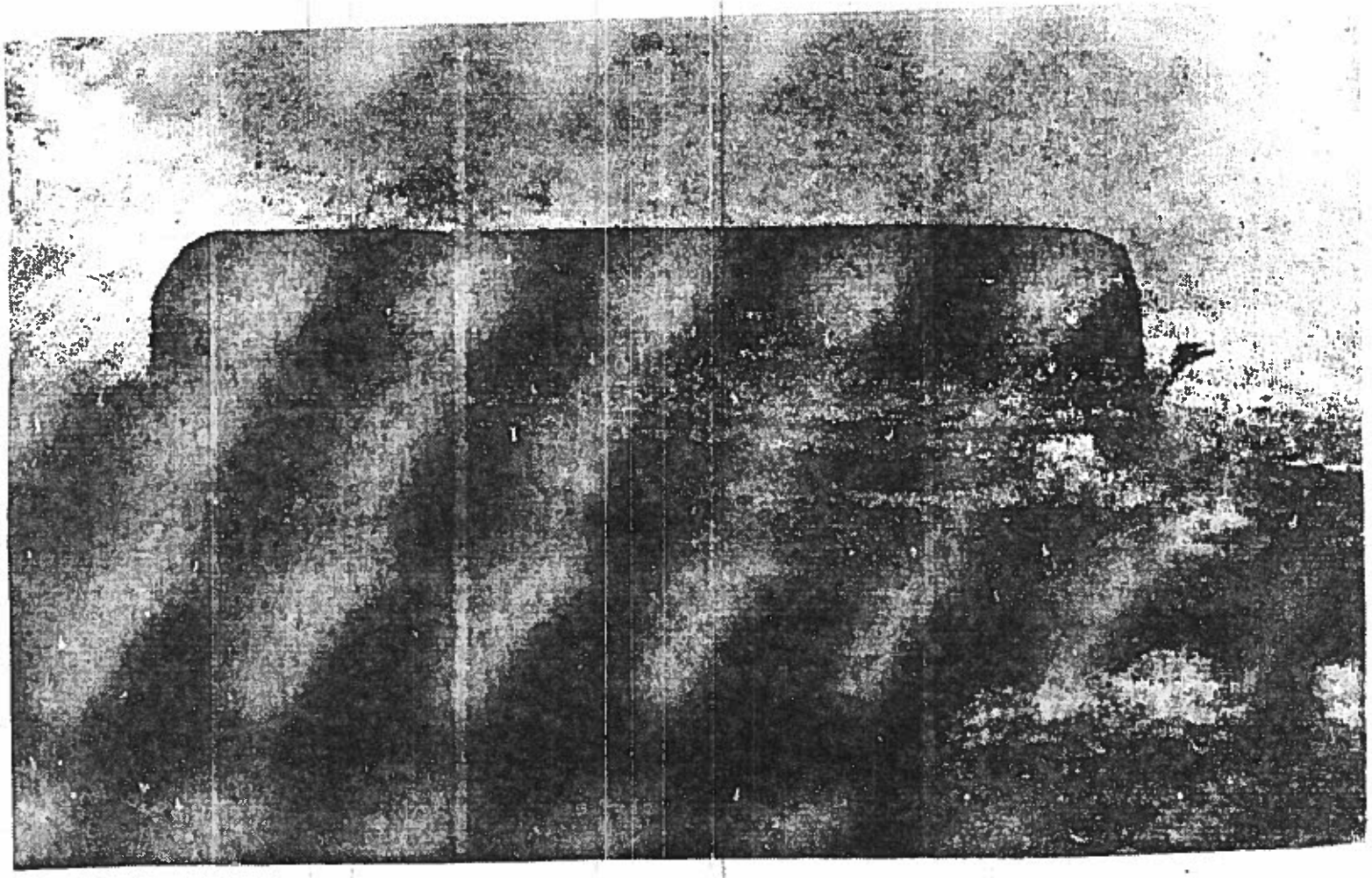

سلطان محمود خورد نے یہ قبر اپنے لئے بنوائی تھی، لیکن اسے اس میں دفن ہونا نصیب نہ ہوا

سلطان محمود خورد

سلطان شادمان خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان محمود خورد پکھلی کا سرکار کا حکمران بنا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح سلطان محمود خورد بھی ایک بہادر اور قابل حکمران تھا۔ اس نے باپ کے منصب پر بحال ہونے کے بعد ریاست کے معاملات میں کچھ ردوبدل کیا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی سلطان مقرب خان کو حاکم دمتوڑ متعین کیا اور ایک اور بھائی سلطان قیاس الدین کو حاکم تناول مقرر کیا۔ سلطان محمود کا ایک اور چوتھا بھائی سیوج (سیج) سلطان بھی تھا لیکن وہ غالباً لاولد فوت ہوا۔ علاقہ کوڑمنگ (مظفر آباد) میں کمال خان کو اپنی سابقہ آسامی پر بحال رکھا گیا۔

سلطان محمود خورد والئ پکھلی درحقیقت پکھلی سرکار میں ترکوں کا آخری مضبوط حکمران تھا۔ اس کی شہادت کے بعد ترک بہت جلد خانہ جنگی کا شکار ہو گئے۔ ادھر مرکزی حکومت بھی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد روبزوال ہو گئی، اس لئے وہ بھی معاملات کو سدھارنے کے لئے کوئی مثبت کردار ادا نہ کر سکی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پکھلی سرکار میں ترکوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب مرکزی حکومت کی کمزوری ہی تھی۔ چونکہ سلطان محمود خورد کے عہد میں نہ صرف پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق بلکہ تمام سرحدی علاقے میں دُور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں؛ لہٰذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی ماحول کا تاریخی پس منظر کسی قدر وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی:

اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے درمیان ہونے والی تخت نشینی کی جنگ میں مبتلا

اور مسلمان دو واضح متحارب گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ شہنشاہ اکبر کی ہندو نواز اور مسلم کُش پالیسیوں کی وجہ سے بیشتر ہندو راجپوت راجے سلطنت کی کلیدی آسامیوں پر فائز چلے آ رہے تھے۔ شاہی افواج میں ہندوؤں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ رفتہ رفتہ شاہجہان کے آخری عہد تک ہندو سردار اگرچہ اعلانیہ طور پر سلطنت کے دعوے دار بننے کی حیثیت میں نہ تھے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ بادشاہ گری کی پوزیشن ضرور اختیار کر چکے تھے۔ شاہجہان کی بیماری کے دوران ہی میں ہندو سرداروں کی یہ حیثیت واضح نظر آنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہجہان کے چہیتے بیٹے دارا شکوہ نے محض ہندو سرداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہندو دھرم اور اسلام کا ایک مرکب فلسفہ گھڑا تھا؛ حالانکہ آج کی طرح اس وقت بھی ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اسلام کا عقیدۂ توحید کسی طرح بھی بُت پرستی اور شرک سے میل نہیں کھا سکتا۔ دارا شکوہ کے مذہبی فلسفے میں اور کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو، مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسلام کے عقائد سے بہت مختلف ہے، اس لئے ہندوؤں کو دارا کی صورت میں ایک اور اکبر نظر آنے لگا اور وہ اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ جب مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ دارا کے برسرِ اقتدار آنے کا مطلب ہندوؤں کے غلبے کے سوا کچھ نہیں تو انہوں نے کھلے دل سے اورنگ زیب کی حمایت شروع کر دی اور اس طرح تخت نشینی کی جنگ کفر و اسلام کی جنگ بن گئی۔ یہ ایک افسوسناک اور تلخ حقیقت ہے کہ تیموریوں کے درمیان تخت کی وراثت کا فیصلہ عموماً تلوار سے ہی کیا جاتا رہا ہے۔ خود شاہجہان اپنے والد جہانگیر کے خلاف ایسے نازک دور میں بغاوت کر چکا تھا، جبکہ قندھار کے مسئلے کی وجہ سے سلطنت کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔ شاہجہان نے بھی ایک ہندو سردار سندر نامی ہی کے بل بوتے پر اپنے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ اگرچہ جہانگیر کو شاہجہان کے مقابلے میں کامیابی نصیب ہوئی، لیکن اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا اور اس نے شاہجہان کو یہ بددُعا دی:

"وہ (شاہجہان) مجھ جیسے باپ سے جو اس کا خالقِ مجازی ہے اور جس نے اسے اپنی زندگی میں سلطنت کے بلند مرتبے تک پہنچایا ہے اور جس نے اس کے لئے کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کیا، کیسے توقع تھی کہ ایسا ناروا سلوک کرے گا۔ خدا کی عدالت میں اس کا

---

[1] تزکِ جہانگیری، ترجمہ قدسی جلد دوم صفحہ ۲۵۲

انصاف ہوگا اور اس کو کوئی بھلائی نصیب نہ ہوگی۔"

یہ ایک مشفق باپ کی بددعا تھی جس کا اثر اسی زندگی میں ظاہر ہو گیا اور وہ وقت آیا کہ تختِ طاؤس پر بیٹھنے والا، اپنے تاجِ شاہی میں کوہِ نور کا ہیرا پہننے والا، اپنی بیوی کی قبر پر کروڑہا روپیہ صرف کرنے والا، آٹھ لاکھ اسپ سواروں کا مالک، شاہجہان اپنے ایک فقیر بیٹے اورنگزیب کے ہاتھوں تخت سے معزول ہوا اور سات برس کی نظر بندی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اس دُنیائے فانی سے چل بسا۔ تخت نشینی کی جنگ میں داراشکوہ کی حمایت میں راجہ مرزا جے سنگھ اور جسونت سنگھ نے تن من دھن کی بازی لگادی۔ باپ کی حمایت بھی اسی کو حاصل تھی، مگر ان تمام کاوشوں کے باوجود ورنگ زیب ہی کامیاب رہا۔ فتح کے بعد جب اورنگ زیب باپ کی ملاقات کے لئے تیار ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ شاہجہان نے چند ترک عورتوں کو شاہی پردوں کے پیچھے ننگی تلواریں دے کر تیار کر رکھا ہے، اکہ جب اورنگ زیب شاہی محل میں داخل ہو تو وہ اس کا کام تمام کردیں؛ لہٰذا اس نے ملاقات ملتوی کردی۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ اقتدار باپ کے پاس رہنے دے کر اپنی موت کے لئے تیار ہو جاتا اور یا پھر باپ کو تخت سے معزول کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ پہلی صورت میں ہندوؤں کی بالادستی لازماً ہو جاتی تھی اور دوسری صورت میں غلبۂ اسلام یقینی تھا؛ چنانچہ اورنگزیب نے دوسری صورت ہی پسند کی۔

جیسا کہ متوقع تھا ہندوستان کی راجپوت ریاستوں، مرہٹوں اور دکن کی شیعہ ریاستوں نے سلطنت کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا۔ سیواجی کا والد شاہ جی بھونسلا دکن کی شیعہ ریاست کا وزیرِ اعظم بن گیا اور کئی دوسرے مرہٹہ سردار کلیدی اسامیوں پر فائز ہو گئے۔ تخت نشینی کی جنگ کے بعد اورنگ زیب نے راجہ مرزا جے سنگھ اور راجہ جسونت سنگھ کو منصب داری کے جلیل القدر عہدوں پر فائز کر کے راجپوتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اندرونی طور پر مرہٹوں سے ملے رہے اور سلطنت کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ اب اورنگ زیب کے مقابلے میں راجپوت، ست نامی، مرہٹے اور دکن کی شیعہ ریاستیں ایک عظیم چیلنج کی حیثیت میں موجود تھیں۔ اورنگ زیب ایک اولوالعزم شہزادہ تھا؛ لہٰذا اس نے ان تمام طاقتوں کے خلاف مسلسل جہاد کا آغاز کر دیا اور زندگی بھر سلطنت کے بدخواہوں کی سرکوبی میں مصروف رہا۔ اس نے محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے ۱۶۵۸ء

سے حکمرانی کا آغاز کیا اور مہاراشٹر سمیت دکن کے سارے علاقے پر غلبہ حاصل کر کے سلطنت کے ان بدخواہوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا، جو یہ سمجھنے لگے تھے کہ دکن اور ایران کے دو طرفہ دباؤ کے نتیجے میں سلطنتِ مغلیہ پس کر رہ جائے گی۔

سرحدی شورش:

وسطی اور جنوبی ہند میں شہنشاہ کی برسوں تک کی مصروفیت کا ایک تباہ کن نتیجہ نکلا کہ شمالی ہند، بالخصوص صوبہ کابل کا علاقہ اس کی ذاتی توجہ سے محروم ہو گیا۔ قبل ازیں شہنشاہ اکثر کابل اور کشمیر کے دوروں پر آیا کرتے تھے اور ہر علاقے کے مقامی مسائل بذاتِ خود حل کر لیا کرتے تھے۔ رعایا کو بادشاہ کے حضور اپنی شکایت پیش کرنے کے مواقع حاصل ہو جایا کرتے اور اس طرح سرکاری اہل کار اور منصب دار بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے چوکس رہا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ اورنگ زیب کو یہ گمان ہوا ہو کہ چونکہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے؛ لہٰذا ہندو مسلم کشمکش کے اس نازک دور میں اگر بادشاہ کا طرفدار نہ بھی ہوا تو کم از کم پُرامن تو رہے گا، مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ خوشحال خان خٹک، ایمل خان آفریدی اور بہاکو خان یوسف زئی نے تمام سرحدی علاقے میں سلطنت کے خلاف منافرت کے جذبات ابھار دیئے اور ہر طرف بغاوت اور انتشار کی فضا قائم کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے میں حالت یہ ہو گئی کہ شاہراہ کابل پر سے مسافروں، تجارتی قافلوں بلکہ شاہی افواج تک کا گزر ناممکن ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ سرحدی بغاوت سلطنت کی کمر میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھی اور اس سے ہندوؤں ہی نے فائدہ اٹھایا۔

خوشحال خان خٹک کا خاندان اس کے دادا اکوڑے کے زمانے سے سلطنت کا وفادار ملازم چلا آ رہا تھا۔ حکومت نے اس خاندان کو گھاٹ کا محصول وصول کرنے اور شاہراہ کابل کی حفاظت کا ہم ذمہ ادا کرنے پر متعین کر رکھا تھا، لیکن جب اورنگ زیب عالمگیر نے نئی تجارتی پالیسی کے تحت تمام سلطنت سے گھاٹ کا محصول معاف کر دیا تو اس سے خوشحال خان کی آمدنی پر بڑا اثر پڑا اور علاقے میں اس کا وقار بھی مجروح ہوا؛ چنانچہ اسی بنا پر وہ حکومت کی مخالفت پر اتر آیا۔ خوشحال خان خٹک ایک باہمت اور بہادر سپاہی ہونے کے علاوہ پختو زبان کا بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنی قابلیت اور اعلیٰ خدمات کی بدولت کسی نہ کسی طرح منصب داری کے بلند مرتبے تک ترقی کرے، مگر الٹا ہوا یہ کہ اس

کا وقار گر گیا۔ دراصل خوشحال خان خٹک کے اپنے ہی اہلِ خاندان جن میں اس کے چچا بہادر خان اور فیروز خان پیش پیش تھے، اس سے حسد کرنے لگے اور انہوں نے حکومت کو اس کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ انہی کی سازشوں کی وجہ سے ۱۶۶۱ء میں خوشحال خان خٹک کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس موقع پر اس نے بڑے ارمان سے یہ شعر کہے ؎

ماوے زہ بہ مغل پہ نوکری کنبی
دکیو نہ کبوم وسوور مپینو نال

اور پھر کہا کہ ع پروده که د مغلو پہ نمک یم

ترجمہ: "میرا تو خیال تھا کہ مغلوں کی ملازمت میں اپنے گھوڑے کی رکابیں دونے کی اور اس کے نعل چاندی کے بنواؤں گا۔ "میں مغلوں کا نمک پروردہ ہوں۔"

خوشحال خان خٹک کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ سلطنت کا وفادار ہونے کے باوجود اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈالا گیا اور بغیر کسی تحقیق کے نظر بند کر دیا گیا۔ بہر حال تقریباً اڑھائی کی نظر بندی کے بعد مہابت خان کی سفارش پر اسے رہا کر دیا گیا اور وہ ایک بار پھر سلطنت کا وفادار نظر آنے لگا، مگر اس کے اقربا پھر بھی اس کے خلاف سازشوں کا چکر چلاتے رہے۔ افسرانِ بالا اس کی مخالفت کرتے رہے اور وہ ایک بار پھر باغی ہو گیا۔ حالت یہ تھی کہ خود اس کا بیٹا سلطنت کا وفادار تھا۔ اس زمانے میں خوشحال خان نے پشتو شاعری کے ذریعے پشتون عوام کو سلطنت کے خلاف اُبھارنا شروع کر دیا۔ کافی عرصہ کی کشمکش کے بعد اس کی موت اس حالت میں ہوئی کہ وہ سلطنت کا وفادار تھا۔

اسی زمانے میں بہاکو خان یا بھاگو خان یوسف زئیوں کا ایک معتبر سردار تھا، انہی حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے باغیانہ روش اختیار کر لی۔ پختون عوام کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لئے اس نے بھیرہ خوشاب کے رہنے والے ایک مولوی کو اپنا رہبر بنا لیا۔ اسی مولوی کی رہبری کی آڑ میں بہاکو خان نے سب سے پہلے پکھلی سرکار کے علاقے میں دست درازیاں شروع کیں۔ اس کی انہی دست درازیوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف یوسف زئی پٹھان لکھتا ہے:

[1] "بہاکو خان یوسف زئی نے ہزارہ کی طرف رُخ کیا تو اس کی غرض حکومت سے

---

[1] یوسف زئی پٹھان صفحہ ۳۱۱

ٹکر لینا نہ تھی، بلکہ وہ اس علاقہ کو آزاد سمجھ کر اقتدار حاصل کرنے کا متمنی تھا۔"

صاف نظر آرہا ہے کہ مصنف یوسف زئی پٹھان کا یہ ریمارک بہاکو خان کے باغیانہ فعل کی ایک بے دلیل کوشش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بہاکو خان اتنا ہی بے خبر انسان تھا کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی پڑوسی ریاست پکھلی عرصہ دراز سے سلطنتِ مغلیہ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے والی اندرونی طور پر خود مختار تھے ــــــــــــــــ مگر سلطنت مغلیہ سے الحاق کے بعد انہوں نے شاہی القابات ترک کر کے شہنشاہ کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ آئینی طور پر اکبری دور ہی سے پکھلی کو ایک سرکار کا درجہ دے کر کابل کے صوبے کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔ پھر کیا یہ بات بھی بہاکو خان سے پوشیدہ رہ سکتی تھی کہ اسی زمانے میں سلطان شادمان خان جیسا مشہور ہزاری منصب دار اس ریاست کا حکمران رہ چکا تھا۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جب اورنگزیب عالمگیر عرصہ دراز تک مرکزی اور جنوبی ہند میں ہندوؤں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر مجبور ہوا تو یہ سرحدی علاقہ اس کی ذاتی توجہ سے محروم رہ گیا۔ یہاں گوناگوں مسائل پیدا ہو گئے اور مختلف قبائلی سردار شہنشاہ کی طویل غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان میں کود پڑے اور تمام سرحدی علاقے میں بغاوت اور بدامنی کی فضا پیدا ہو گئی۔ چونکہ مذہبی نعرے کے بغیر تمام مسلمان حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے پر اتنی جلدی آمادہ نہ ہو سکتے تھے، اس لئے پکھلی سرکار میں ترکوں کے مظالم اور ان کی عیاشیوں کے افسانے گھر گھر پھیلا دیئے گئے اور ان کے خلاف "جہاد" کے لئے ایک عیار مولوی کو بھی بھیرہ و خوشاب کے علاقے سے درآمد کر لیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے قبائلی ملکوں کو کیا خبر تھی کہ وہ "ترکانِ جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر بالآخر سکھوں اور انگریزوں جیسے دشمنانِ دین کی غلامی کا جوا گلے میں ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

چھانجل یا چھاچھل پر یوسف زئیوں کا حملہ:

ملا چالاک یا ملا بھیروی کی قیادت میں ۱۶۶۶-۶۷ء میں یوسف زئیوں نے پانچ ہزار کی تعداد میں دریائے سندھ کو عبور کیا اور پکھلی سرکار کے قلعہ چھاچھل پر اچانک حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ موجودہ تحصیل بٹگرام میں دریائے سندھ کے کنارے سے بمشکل پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور صدیوں سے دریائے سندھ کے

کنارے کی پاسبانی اسی قلعہ سے کی جارہی تھی۔ علاقہ یوسف زئی کے راستے پر بھی اسی قلعہ سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس قلعہ کا فوجدار شمشیر خان تھا، جسے "عالمگیر نامہ" میں "گماشتہ شادمان خان" لکھا گیا ہے۔ اس قلعہ کے کھنڈرات کے قریب اب بھی ایک بڑا پتھر پڑا ہوا ہے جسے لوگ ہندکو زبان میں شمشیر گٹ یعنی شمشیر خان کا پتھر پکارتے ہیں۔ اتفاق سے اس وقت والئی پکھلی سلطان محمود خورد ترک فوج کو ہمراہ لے کر قبائلی بغاوتوں ہی کو فرو کرنے کے سلسلے میں حسن ابدال کے راستے سرحدی علاقہ کو روانہ ہو چکا تھا، اس لئے شمشیر خان کو گلی باغ کے صدر مقام سے کوئی امداد نہ مل سکی؛ تاہم اس نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اس کے چند سپاہی دشمن کی کثیر تعداد کا دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور قلعہ پر یوسف زئیوں کا قبضہ ہو گیا۔ شمشیر خان نے قلعہ سے پلٹ کر پکھلی خاص کو جانے والے راستے پر زبردست پہرہ لگا دیا اور یوسف زئی مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔ شمشیر خان نے اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ گلی باغ کے صدر مقام اور قلعہ اٹک میں بھجوا دی۔ وہاں سے یہی رپورٹ شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دی گئی۔ اس موقع پر اورنگ زیب عالمگیر نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس میں صوبیدار کابل کے علاوہ اٹک، نیلاب اور علاقہ گکھڑ کے جاگیرداروں کو بھی یوسف زئیوں کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے ضروری احکامات دے دیئے گئے۔ اس سلسلے میں مآثر عالمگیری میں لکھا گیا ہے:

[1] "۱۶۶۶ء بمطابق ۱۰۷۷ھ میں ان شورہ پیشوں نے ایک مجہول فقیر کو فقیر شاہ کا لقب دے کر اپنا سردار بنا لیا ہے اور چالاک درویش نے مکاری اور فریب کاری سے فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے۔ فوجدار اٹک مستمی کامل خان کو حکم ہوا کہ نیلاب کے تمام جاگیردار اتفاق کر کے ان بدبختوں سے معرکہ آرائی کریں۔ صوبیدار کابل کو حکم ہوا کہ شمشیر خان کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ان فتنہ انگیزوں کے خلاف معرکہ آرائی اور مدافعت پر مقرر کرے۔"

عالمگیر نامہ میں یوسف زئیوں کی فتنہ انگیزیوں کی ایک طویل داستان بیان کرتے ہوئے قلعہ چہاچہل پر ان کے حملے کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

[2] "دریں ایام از کوتہ اندیشی، ہوائی شورش پروری و فساد کیشی در دماغ پندار

---

[1] مآثر عالمگیری صفحہ ۶۶

[2] عالمگیر نامہ از محمد کاظم مطبوعہ ۱۰۴۰ھ، ۱۰۳۵-۴۰ء

افگندہ قدم بوادیٔ خلاف وطغیان گزاشتند و بہاکوئی، شقاوت خوئی کہ سرکردہ آں جمعے بے راہ روی بود بمقتضائے شقاوت فطری وشرارت ذاتی محرک سلسلۂ افساد گشتہ قبائلِ آں قومِ جاہل را باخود متفق و ہمدستان ساخت ویکے از گدایانِ مجہول را باد عائی آنکہ از نژاد مقتدایاں آں گروہِ جہالت پژوہ است محمد شاہ لقب نہادہ دست آویز فتنہ انگیزی کرد ونخست ملا چالاک کہ از ملایانِ بے نشانِ ولایت بھیرہ وخوشاب است ودرمیانِ آں مجاہیل دوگانچۂ زرق وتلبیس کشودہ بدست آویزایا وتزویر سمت یوسف زئی برقلعہ چاچہل کہ درحدودِ پکھلی است، رفتہ قلعہ مذکور را کہ باشمشیر نام گماشتۂ شادمان مرزبان آنجا درآں بود، بلطائف عذر ومیکدت متصرف شد ودرآں حدود آغازِ شورش انگیزی نمودہ۔"

مندرجہ بالا اقتباس ثابت کرتا ہے کہ بہاکو خان یوسف زئی اپنے بل بوتے پر بغاوت اور سرکشی کی ہمت نہ رکھتا تھا، اس لئے اس نے عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے بھیرہ خوشاب کے رہنے والے ایک مولوی (ملا چالاک) صاحب کو اپنے ساتھ ملایا اور اسے محمد شاہ کا لقب دے کر اپنی قوم کا رہبر بنالیا۔ یہ ملا بھیروی ایک چالاک اور عیار شخص تھا۔ اس نے ترکوں کے خلاف عوام میں منافرت کی لہر دوڑادی۔ پھر علاقہ یوسف زئی سے اس نے پانچ ہزار پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے قلعہ چاچہل پر اچانک حملہ کر دیا اور اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ سر جادو ناتھ کو عالمگیر نامہ کے مندرجہ بالا اقتباس کے ایک لفظ "ملا چالاک" سے بڑا مغالطہ لگا اور اس نے ہزارہ گزیٹیر میں بیان کئے گئے سید جلال بابا ہی کو ملا چالاک تصور کر لیا جو فی الحقیقت غلط ہے۔ ہزارہ گزیٹیر اور تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس صاحب میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ سید جلال بابا حضرت پیر بابا کی چوتھی پشت میں سے تھا اور اس کی اسی خاندانی نسبت کی وجہ سے والی پکھلی سلطان محمود خورد نے اسے اپنی ریاست میں آباد کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کا عقد مواصلت بھی اس سے کر دیا ——— سید جلال! اور حضرت پیر بابا کے حالات اسی کتاب میں علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت بیان کئے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ سید جلال بابا وہ ملا چالاک ہرگز نہ تھا جس کا ذکر عالمگیر نامہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔ ملا چالاک جسے بہاکو خان یوسف زئی نے محمد شاہ یا فقیر شاہ کا لقب دے کر اپنا رہنما بنالیا تھا، بھیرہ خوشاب کا باشندہ تھا۔ ہزارہ گزیٹیر اور تاریخ ہزارہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ سید جلال بابا نے سلطان محمود خورد کی عدم موجودگی میں ۱۷۰۳ء میں سواتی لشکر کے ساتھ گلی باغ کے صدر مقام پر قبضہ کیا تھا، بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ سید جلال بابا کے سواتی [illegible] ۱۷۰۷ء [illegible] ۱۷۱۳ء

کے لگ بھگ گلی باغ پر قبضہ کیا۔

۱۶۶۶-۶۷ء میں قلعہ چہا چہل پر یوسف زئیوں کا حملہ ان کی بغاوت اور جارحیت کا کھلا ثبوت تھا۔ لہٰذا ان کی اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ضروری احکامات جاری کئے گئے۔ شمشیر خان کے علاوہ نیلاب اور اٹک کے جاگیرداروں کے ساتھ علاقہ گکھڑ کے مراد قلی سلطان گکھڑ، مہا سنگھ بھدریہ، رامچندر اور عبدالرحیم کو بھی باغیوں کی سرکوبی کے لئے متعین کیا گیا۔ ان منصب داروں نے کامل خان کی قیادت میں ہر دو سے آگے بڑھ کر دریائے سندھ کے شمال مشرقی کنارے پر پیش قدمی شروع کی۔ سخت لڑائی کے بعد یوسف زئیوں کو شکست فاش ہوئی۔ ۲ مئی کو شمشیر خان نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور اوہند (ہنڈ) کے فوجی مرکز سے آگے بڑھ کر مینڈر، پنج پیر اور چند منصور کے مقامات پر یوسف زئیوں کو شکستوں پر شکستیں دیتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ یوسف زئیوں کی امداد کے لئے اکازئی اور ملازئی قبائل بھی آ گئے، لیکن شاہی فوج نے توپخانہ اور گھڑ سوار فوج کو استعمال کرتے ہوئے ۲۸ جون ۱۶۶۶ء کو قبائلیوں کو شکست فاش دی۔ تین سو افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور بہت سے افراد دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گئے۔ اسی دو۔ ان میں ایک تازہ دم شاہی فوج میر بخشی محمد آمین خان کی قیادت میں شاہباز گڑھ سے گزر کر باجوڑ کے علاقے میں آگے بڑھی اور پھر وادیٔ سوات میں داخل ہو گئی۔ دُور دُور تک سوات کے علاقے میں یوسف زئیوں کے اہم ناکوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد میر بخشی محمد آمین خان واپس ہنڈ چلا آیا اور اس علاقے میں متعین شاہی فوج کی کمان شمشیر خان کو دے کر ۱۴ اکتوبر ۱۶۶۷ء کو شاہی فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے شاہی دربار کو روانہ ہو گیا۔ شاہی افواج کی ان فوجی کارروائیوں کی بدولت ۱۶۷۲ء تک علاقہ یوسف زئی میں امن و امان قائم رہا۔ علاقہ پنجکلی میں یوسف زئیوں کی پیش قدمی رُک گئی اور انہیں دریائے سندھ کے تمام جنوب مشرقی کنارے سے باہر نکال دیا گیا۔

شہنشاہ کی آمد:

۱۶۷۲ء میں قبائلیوں نے محمد آمین خان صوبیدار کابل کی درّہ خیبر سے گزرتی ہوئی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اس علاقے میں ایمل خان آفریدی زبردست خطرہ بن چکا تھا اور شاہراہ کابل آئے دن کی ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس پر سے نہ صرف تجارتی قافلوں اور مسافروں

بلکہ شاہی افواج تک کا گزرنا محال ہو چکا تھا؛ لہٰذا ان حالات سے نمٹنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیر نے بذاتِ خود دکن کی مہمات کی نگرانی ترک کر کے ادھر آنے کا فیصلہ کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۷۴-۷۵ء میں حسن ابدال پہنچا اور یہیں کیمپ لگا کر تمام سرحدی مہمات کی نگرانی کرنے لگا۔ اس نے سلطان مکرم خان کو ہزارہ کی بجائے باجوڑ کو روانہ کیا تاکہ باغیوں کے مرکزی علاقے میں ضرب لگا کر بغاوت کو کچل دیا جائے۔ سلطان مکرم خان آگے بڑھا اور اس نے یوسف زئیوں کے علاقے میں بعض مقامات پر قبضہ کر لیا۔ انہی دنوں بہاکو خان یوسف زئی فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا اظہارِ اطاعت کے لئے حسن ابدال پہنچ کر بادشاہ کے حضور حاضر ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اسے معافی دینے کے بعد ایک جاگیر بھی عطا کر دی اور پھر واپس رخصت کر دیا۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں علاقہ یوسف زئی اور پکھلی سرکار میں مکمل طور پر امن و امان قائم ہو گیا اور شاہراہِ کشمیر کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا، لیکن وادیٔ پشاور اور شاہراہ کابل بدستور خطرے میں تھی اور ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ اس علاقے میں شاہی منصب دار امن قائم کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں، اس لئے شہنشاہ نے دکن سے چند چیدہ افسروں کو حسن ابدال طلب کیا۔ ان افسروں میں ایک مشہور منصب دار آغر خان ترک بھی تھا۔ اس بہادر سردار نے شاہی فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے تین ماہ کا فاصلہ صرف چالیس دن میں طے کیا اور شہنشاہ کے حضور حاضر ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اسے وادیٔ پشاور کے علاقے میں متعین کیا۔ علاقہ گکھڑ، پکھلی، نیلاب اور اٹک کے چیدہ چیدہ سردار بھی آغر خان کی قیادت میں آگے بڑھے۔ آغر خان نے ایک ہی ہلے میں ہندوں کو شکست دے دی۔ پھر یکے بعد دیگرے علی مسجد، نیک بہادر، لمغان اور کنڈل چک کے مقامات پر اس نے قبائلیوں کو شکستیں دیں۔ ایمل خان آفریدی اس علاقے میں شاہی افواج کیلئے سب سے بڑا خطرہ تھا اور اسی نے شاہی افواج کو سب سے زیادہ نقصان بھی پہنچایا تھا، اس لئے آغر خان نے ایمل خان سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ لڑائی کے دوران میں ایمل خان آفریدی بڑی بے جگری سے لڑا۔ لڑتے لڑتے آغر خان اور ایمل خان ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے کہ ان میں دست بدست لڑائی ہونے لگی، لیکن عین نازک موقع پر ایمل خان آفریدی کے معاونین نے اس کے گھوڑے کا رُخ دوسری طرف کر دیا اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ [illegible] اس طرح آفریدیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بیشتر [illegible] جنگ [illegible] آغر [illegible] کیا گیا۔ [illegible] اس کے دو شعر

مندرجہ ذیل ہیں ہے

چوں افغان نیاورد طاقت بجنگ !
شدند آں زماں منہدم بید رنگ !
بہرہ کوہ و ہر سو پریشان شدند،
چو شانہ زدہ مو پریشان شدند،

تھوڑے ہی عرصے میں تمام سرحدی علاقے میں "آغر راغلے" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ آغر خان نے تلوار کے زور سے امن و امان بحال کر دیا اور بغاوتوں کا طوفان کچھ عرصہ کے لئے تھم گیا۔ تقریباً ایک سال تک حسن ابدال میں قیام کرنے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر واپس چلا گیا۔ مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے سلطنت کو سرحدی بغاوتوں کی وجہ سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ دکن سے تجربہ کار افسروں کو بلا کر یہاں متعین کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں مرہٹوں کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ اورنگزیب حالات کا اس طریقے سے مقابلہ نہ کرتا تو نتیجہ کیا نکلتا۔ طاقت اور روپیہ کے استعمال کے علاوہ سرحدی علاقے کی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیسری صورت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ جو لوگ اورنگ زیب عالمگیر کی سرحدی پالیسی میں کیڑے نکالنے پر بضد ہیں، انہیں اس تیسری صورت کی نشاندہی کرنی چاہیئے جو حالات کے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب وہ آخری مسلمان حکمران تھا جس نے سلطنتِ مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو آخری سہارا دیا اور جس نے شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے شمالی اور جنوبی ہند سے تمام بغاوتوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ اسی کی ہمت اور جرأت تھی کہ اسی برس کی عمر میں اس نے ونکنکرا Vinkankara کی آخری لڑائی میں مغل فوج کی کمان کرتے ہوئے مرہٹوں کو آخری شکست دی اور سلطنت کے وقار کو بحال کر دیا۔ سیواجی مرہٹہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین سمبھاجی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور اس کے پوتے ساہو کو اورنگ زیب عالمگیر نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، جہاں وہ مسلسل پندرہ برس تک قید رہا اور بالآخر اسے اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی رہائی مل سکی۔ اس نے ہندوؤں کو اتنے مناصب اور جاگیریں عطا کیں جو اس سے پہلے انہیں کبھی نہ عطا ہوئی تھیں، لیکن ہندو چونکہ سلطنتِ مغلیہ کو تباہ کر کے اپنی سلطنت قائم کرنے کا خواب پورا نہ کر سکے، اس لئے وہ بالعموم اس کے مخالف ہی رہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں

سلطنتِ مغلیہ کی سرحدیں سب سے زیادہ وسیع ہوگئیں۔ تمام جنوبی ہند بلکہ برما میں تناسرین تک کا علاقہ سلطنتِ مغلیہ کا حصہ بن گیا، فتاویٰ عالمگیری اورنگ زیب کا علمی شاہکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اصل قصور اس کی اسلام دوستی تھی، جسے متعصب انگریز اور ہندو مورخ کسی صورت برداشت نہ کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت کا اتنا بُرا امیج پیش کیا کہ بعض مسلمان بھی ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر اسے بُرا بھلا کہنے لگے اور ہمارے ایک قومی شاعر کو کہنا پڑا کہ: ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ظالم تھا، ہندوکش تھا، ستمگر تھا

سُلطان محمود کی گمشُدگی:

سابقہ سلاطین پکھلی کی طرح سلطان محمود خورد بھی سرحدی بغاوتوں کو کچلنے کی کارروائیوں میں حصہ لیتا رہا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس میں سلطان محمود کے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر موجود ہے۔ سلطان محمود خورد یوسف زئیوں کی شورش اور فتنہ انگیزیوں ہی کے بارے میں اورنگ زیب عالمگیر سے تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے دہلی روانہ ہوا تھا۔ دہلی سے واپسی کے بعد وہ بدستور فوجی کارروائیوں میں حصہ لیتا رہا، لیکن کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود پکھلی سرکار میں سلطان محمود کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ عوام مولوی بھیروی کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر پہلے ہی ترکوں کے مخالف بن چکے تھے اور وہ کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں ترکوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔ سلطان محمود کی گمشدگی کے بعد اگر ترکوں میں کوئی قابل حکمران موجود ہوتا اور وہ اس کی حکمرانی پر متفق ہو جاتے، تو شاید انہیں اتنے بُرے دن نہ دیکھنے پڑتے۔ لیکن حالات کے تیور بتا رہے تھے کہ ان کے مقدر کا ستارہ غروب ہو چکا ہے کہ وہ کسی بھی سلطان زادے کی حکمرانی پر متفق نہ ہوئے اور ان کے مابین ایک طویل خانہ جنگی شروع ہو گئی جو بالآخر ان کے زوال کا سبب بنی۔

سلطان محمود خورد کے چھ بیٹے تھے، جن کے نام یہ ہیں: سلطان مغل خان، سلطان فاضل خان، سلطان عاقل خان، سلطان مرید خان، سلطان دلیل خان اور سلطان طاہر خان المعروف طاہری۔ ان چھ بیٹوں میں سے سلطان فاضل خان اپنے دو بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر کو ساتھ لے کر میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس طرف سے شاہراہِ کشمیر اور پکھلی سرکار کی سرحد کی حفاظت کی جائے۔

اس وقت دریائے سندھ کے اس پار کے قبائل میدان ہزارہ قارلق کی طرف پیش قدمی کرنے لگے تھے۔ بونیر، سوات

علاقہ مانکرائے پر قابض ہو گئے اور اس طرح شاہراہِ کشمیر اور پکھلی کی سرحد خطرے میں پڑ گئی تھی۔ سلطان فاضل خان ۱۶۶۹ء کے لگ بھگ پکھلی سے چل کر موضع سلطان پور (دوڑ) پہنچا اور یہیں پڑاؤ لگا کر شاہراہ کشمیر کے دونوں اطراف کی حفاظت کرنے لگا۔ اس نے ترک فوج کو ملوک خان کی قیادت میں میدان ہزارہ قارلق کے مرکزی قصبہ مانکرائے پر حملہ کرنے کے لئے آگے روانہ کیا۔ یہ موضع غورغشتیوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ ملوک خان نے مانکرائے پر حملہ کر دیا اور سخت لڑائی کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ لڑائی کے دوران میں مانکرائے کا قدیم قصبہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ ترکوں نے غورغشتیوں کو اس علاقے سے باہر نکال دیا۔ اس طرح ندی دوڑ کا تمام شمال مشرقی کنارہ تا بحد تربیلہ ترکوں کے قبضے میں آ گیا، لیکن اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پکھلی سرکار میں ترکوں کے مابین خانہ جنگی شدت اختیار کر گئی، اس لئے یہ سلاطین زادے علاقہ سلطان پور اور مانکرائے ہی میں آباد ہو گئے۔

سلطان محمود کے دوسرے بیٹوں میں سے سلطان دلیل خان علاقہ مظفر آباد میں باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب گلی باغ کے دارالریاست میں سلطان محمود خورد کے صرف دو چھوٹے بیٹے سلطان مرید خان اور سلطان عاقل خان موجود تھے؛ لہذا ترکوں کے زوال کی آخری ضرب کا نشانہ انہی کو بننا پڑا۔ ۱۷۱۳ء میں جب سلطان محمود خورد کے داماد سید جلال بابا نے سواتی لشکر کے ساتھ گلی باغ پر قبضہ کیا۔ اس وقت سلطان مذکور کے دونوں کمسن بیٹے سلطان عاقل خان اور سلطان مرید خان درۂ کونش کے علاقے میں روپوش ہو گئے۔ اس وقت سواتی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکوں کی کوئی فوج نہ تھی۔ سلطان محمود خورد کے بیٹوں کی عدم موجودگی ہی کی بنا پر سید جلال بابا نے پکھلی پر قبضۂ وارثانہ کا دعویٰ کیا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ولیس میں پکھلی پر سید جلال بابا کے اس قبضۂ وارثانہ کا ذکر موجود ہے۔

٭

ہزارہ قارلق کی تقسیم

ہزارہ قارلق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے گزشتہ اوراق میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ۱۳۹۸ء کے تیموری حملے سے قبل ولایت پکھلی کے مختلف حصوں کے نام مختلف ادوار میں اراشہ، ابی ساریز اور بال میک دیش مشہور تھے۔ تیموری حملے کے بعد امیر تیمور نے قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو اس ملک کی حفاظت کے لئے پکھلی میں متعین کیا اور مانکرائے سے اٹک تک وسیع میدان اس ہزارہ منگ کو جاگیر کے طور پر عطا کر دیا؛ چنانچہ یہی واقعہ اس میدان کی وجہ تسمیہ بنا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد تک یہ میدان ولایت پکھلی ہی کا ایک حصہ بنا رہا لیکن ۱۵۸۹ء میں اکبر بادشاہ نے اس میدان کو پرگنہ کی حیثیت دے کر اسے اٹک کے ساتھ شامل کر دیا اور بقیہ پکھلی سرکار سلطان حسین خان والی پکھلی کی ملکیت ہی میں رہنے دی گئی۔ آئین اکبری اور توزک جہانگیری میں اس میدان کا نام ایک پرگنہ ہی کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ آئین اکبری میں اس میدان کا سالانہ لگان بھی درج کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک اس میدان کی یہی حیثیت قائم رہی۔

اکبری عہد سے قبل اس میدان میں گوجر، آوان یا اعوان، کھٹڑ اور دلازاک آباد تھے اور حکمرانی عرصہ دراز سے ترکوں کی تھی۔ جہانگیر کے عہد میں گکھڑوں کا ایک معتبر سردار دیوان فتح خان ابن سید خان علاقہ گکھڑاں (راولپنڈی۔ سید پور) سے آکر موضع خان پور میں آباد ہوا۔ سلطنت مغلیہ کے ابتدائی زمانے میں ترین چھچھ ہزارہ کے علاقے میں آباد تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے کچھ افراد بھی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک اس میدان میں آکر آباد ہو گئے۔ سرائے گدائی اور درویش ترینوں کی ابتدائی بستیاں تھیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں غور غشتی قوم بھی سرحدی بغاوتوں کے زمانے میں اس میدان میں آگے بڑھ کر علاقہ مانکرائے پر قابض ہو گئی تھی۔ سندھ کے اس پار کے قبائل کا رجحان اسی میدان کی طرف تھا اور ان کی پیش قدمی سے

یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اس میدان پر قابض ہونے کے علاوہ شاہراہِ کشمیر کے لئے بھی خطرہ نہ بن جائیں، اس لئے والی پکھلی سلطان محمود خورد کا ایک بیٹا سلطان فاضل خان اپنے دو بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر خان سمیت ایک فوج لے کر پکھلی خاص سے چل کر موضع سلطان پور (دوڑ) میں آیا۔ یہیں سے آگے بڑھ کر ملوک خان کی سرکردگی میں ترکوں نے مانکراتے پر حملہ کر دیا اور غور غشتیوں کو اس علاقہ سے مار کر بھگا دیا۔ اس طرح نہ صرف شاہراہِ کشمیر بلکہ سرکار پکھلی کی مغربی سرحد مختلف قبائل کی یورش سے محفوظ ہو گئی، چونکہ سرکار پکھلی میں سلطان محمود خورد کی شہادت کے بعد ترکوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی؛ لہذا سلطان فاضل خان، ملوک خان اور شمشیر خان اور ان کی اولاد علاقہ مانکراتے اور سلطان پور ہی میں آباد ہو گئی۔

۱۶۷۲-۷۵ء میں سرحدی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیر بنفس نفیس حسن ابدال تشریف فرما ہوا، اس وقت گوجر، ترک، دلازاک اور ترین ہی اس میدان کی معتبر قومیں تھیں۔ زیادہ تر زمینیں گوجروں کی ملکیت میں تھیں اور دیگر اقوام بالخصوص ترین گوجروں کی زمینیں ہتھیانے میں لگے ہوتے تھے۔ سرحدی بغاوتوں نے سارے علاقے میں بدامنی کی فضا قائم کر دی تھی اور ہر قبیلہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کی املاک پر دست درازی کرنے لگا تھا۔ دلازاکوں کو اگرچہ گوجروں کی شکایت پر شہنشاہ جہانگیر نے اس میدان سے بے دخل کر کے لاہور منتقل کر دیا تھا، تاہم ان کی کچھ تعداد یہاں باقی رہ گئی اور کچھ دلازاک بے دخلی کے بہت عرصہ بعد دوبارہ یہاں واپس آ چکے تھے؛ لہذا وہ بھی گوجروں کی املاک پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

ان حالات میں گوجروں نے حسن ابدال کے مقام پر شہنشاہ کی آمد کو غنیمت سمجھا۔ اس وقت گوجروں کا سب سے زیادہ معتبر آدمی دولت بیگ چودھری تھا جو کوٹ نجیب اللہ کے قریب سکونت پذیر تھا۔ دولت بیگ نے سب سے پہلے حسن ابدال پہنچ کر شہنشاہ کا استقبال کیا اور شہنشاہ نے خوش ہو کر اسے مقدم کا لقب عطا کیا۔ ترکوں کے عہد میں گوجر سرداروں کے لئے مقدم ہی کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کے حسن ابدال کے قیام کے دوران میں گوجروں نے دوسری اقوام بالخصوص ترینوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف شہنشاہ کے حضور میں ایک شکایت پیش کی۔ تاریخ ہزارہ کیپٹن ویس Wace کا بیان ہے کہ اتفاق سے اس وقت صالح محمد خان دلازاک بھی دربار عام میں موجود تھا۔ اس نے اس جھگڑے کی ثالثی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں اور گوجروں نے اپنی نادانی سے اسے ثالث قبول کر لیا۔ صالح محمد خان

دلازاک گوجروں سے اس شکایت کا بدلہ لینے کا متمنی تھا جو انہوں نے ۱۶۰۷ء میں جہانگیر کے پاس پیش کی تھی
وجہ سے نتیجے میں ساٹھ ہزار دلازاکوں کو اس میدانِ سے بے دخل کر کے لاہور منتقل کر دیا تھا؛ چنانچہ
صالح محمد خان دلازاک حسن ابدال سے اس میدان میں آیا اور اس نے میدانِ ہزارہ قارلق کے کل چوراسی
دیہات کو کیس اکیس دیہات کی چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا جن کے نام مندرجہ ذیل تجویز کیے گئے۔

۱۔ پٹی گوجری دولتا چودھری
۲۔ پٹی ترکی مانک رائے
۳۔ پٹی دلازاک سرائے صالح
۴۔ پٹی ترینی درویش

تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کے بیان کے مطابق صالح محمد خان نے ۱۶۷۲ء میں سرائے صالح کا موضع آباد کیا اور اس تدبیر سے اس نے نہ صرف گوجروں سے بدلہ لیا، بلکہ دلازاکوں کو ایک بار پھر اس میدان میں باوقار زندگی بسر کرنے کا مواقع فراہم کر دیا۔ انگریزی عہد کے پہلے بندوبست میں گوجروں اور دلازاکوں کے بزرگوں نے میدانِ ہزارہ قارلق کی مندرجہ بالا تقسیم کا سال ۱۶۶۶ء بیان کیا ہے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سن درست نہیں۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر ۷۵-۱۶۷۴ء ہی میں حسن ابدال تشریف فرما ہوا اور اسی تاریخ ہزارہ میں مقدم دولت بیگ کے حسن ابدال پہنچ کر بادشاہ کے استقبال کرنے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ پھر جو تقسیم عمل میں آئی۔ اس کی رُو سے گوجری کی پٹی کا نام "پٹی گوجری دولتا چودھری" تجویز کیا گیا۔ اس سال یعنی ۱۶۷۲ء سے قبل دولت بیگ کا یا دیگر گوجروں کا دکن یا وسطی ہند میں جا کر شکایت پیش کرنا محال تھا اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان تھا کہ اس علاقے میں صالح محمد خان دلازاک شاہی دربار میں حاضر ہوتا؛ لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم ۷۵-۱۶۷۴ء ہی میں عمل میں آئی۔

اس تقسیم کی رُو سے گوجروں کو زبردست نقصان پہنچا، وہ اپنی اکثر املاک سے محروم کر دیے گئے۔ قبل ازیں ترک پکھلی سرکار کے حکمران تھے، انہیں اس میدان کے اکیس دیہات پا کر یقیناً فائدہ ہوا۔ ترکوں نے وہی دیہات حاصل کیے جو پکھلی سرکار کی سرحد کے قریب واقع تھے۔

اس طرح پکھلی سرکار کی سرحد وسیع تر ہو گئی۔ دلازاکوں کے حق میں یہ تقسیم نعمتِ عظمیٰ

ثابت ہوئی، انہیں مدت دراز کے بعد اس میدان میں باوقار زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس
ترینوں کے حق میں بھی یہ تقسیم بڑی سودمند ثابت ہوئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیم میدان ہزارہ قارلق
ترینوں کے عروج کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ قبل ازیں اس میدان میں ترینوں کا کوئی سیاسی کردار نہ
مندرجہ بالا چاروں پٹیوں کے لحاظ سے میدانِ ہزارہ قارلق پر لگان کی نئی شرح مقرر ہوئی
لگان پہلے کی طرح اب بھی اٹک بنارس کے قلعہ میں واجب الادا ہوا کرتا تھا۔ درّانیوں کے
تک میدانِ ہزارہ قارلق کی یہی تقسیم قائم رہی اور مندرجہ بالا چاروں اقوام یہاں پرسکون اور خوشحال
بسر کرتی رہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر میدانِ ہزارہ قارلق کے اس بندوبست کے بعد حسن ابدال۔
واپس دہلی کو روانہ ہوا۔ شہنشاہ کے حسن ابدال میں ایک سال کے قیام کے دوران میں سرحدی بغ
فرو کر دی گئیں اور میدانِ ہزارہ قارلق [illegible] سرکار میں قبائلیوں کی پیش قدمی کا خطرہ ٹل گیا۔

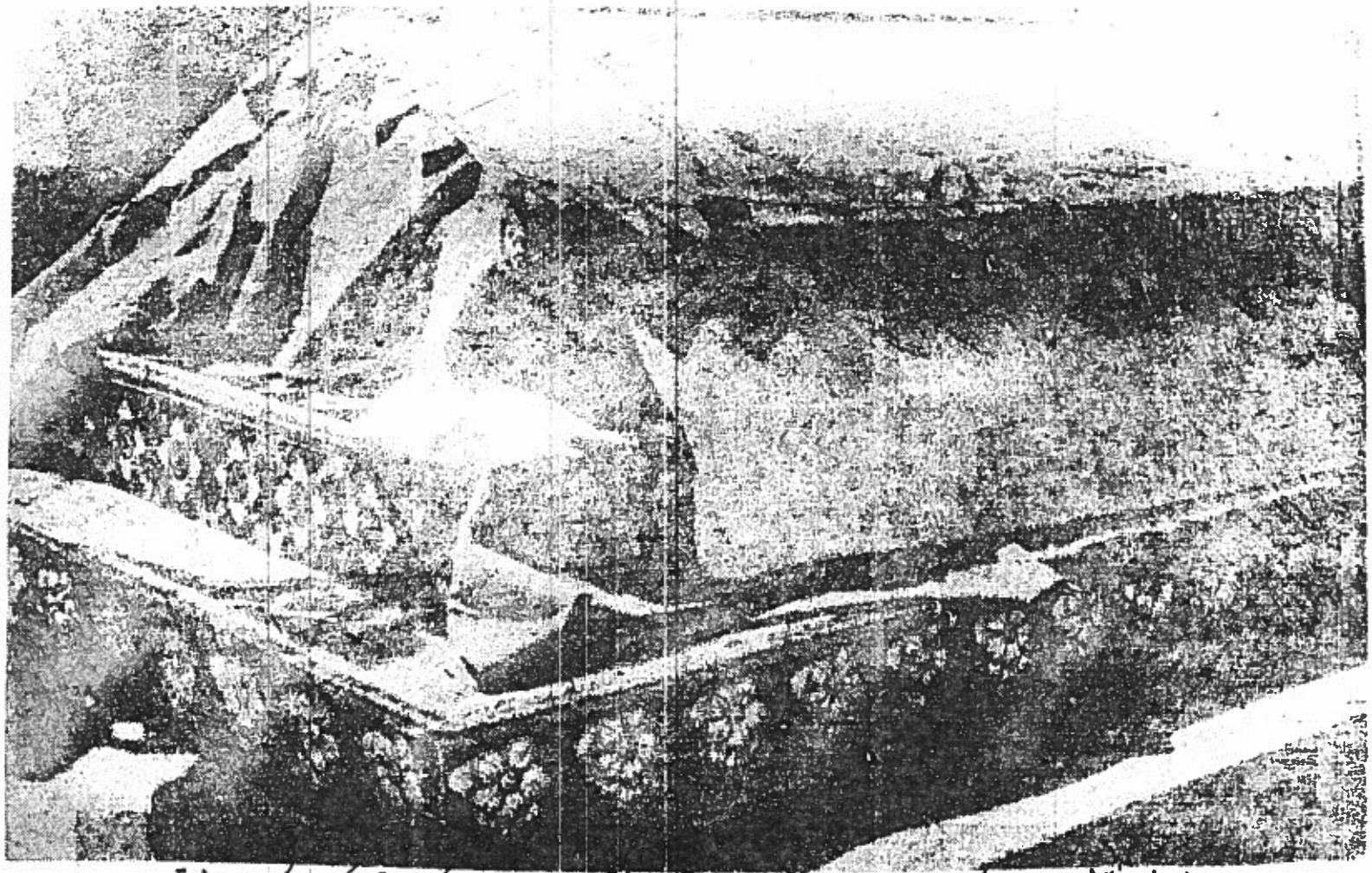

دیوان راجہ فقیر محمد صاحب المعروف دیوان راجہ بابا کا مزار اسی مقام پر واقع ہے جہاں سلطان تھپی نے آپ کو موت کی سزا سنائی تھی۔

۱۱۔ راجہ فقیر محمد المعروف دیوان راجہ بابا

آپ دور علی سلطان محمود خورد کے عہد کے بلند پایہ عالم دین، صاحب طریقت بزرگ اور صوفی شاعر تھے۔ آپ کا سلسلہ طریقت حضرت معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جا ملتا تھا، اسی لئے وہ علاقے بھر میں سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ اور ولی اللہ کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے۔ شاید اسی مناسبت سے ہی بعض لوگ انہیں سید بھی کہتے ہیں۔ لغوی اور اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے سید سے مراد سردار ہوا کرتا ہے اور عرب میں اس لقب کا استعمال عام شرفا کے لئے بھی کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ملک میں سید عموماً حضرت علیؓ کی اس اولاد کو سمجھا جاتا ہے جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھی۔ اَن پڑھ لوگ ہر صاحب مزار کو پیر صاحب شاہ صاحب، یا شاہ جی کے القابات سے پکارتے ہیں، حالانکہ شاہ بھی ایک ایرانی زبان کا لفظ ہے اور مختلف ادوار میں یہ ایک لقب کے طور پر نہ صرف ایرانی یا افغانی بلکہ ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ کے بُدھ اور ہندو حکمرانوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی ہم ایران اور افغانستان کے حکمرانوں کے لئے شاہ ایران اور شاہِ افغانستان کے لقب استعمال کرتے ہیں، حالانکہ وہ فاطمی یا عرب نہیں۔ ہمیں وثوق کے ساتھ دیوان راجہ فقیر محمد صاحب کا شجرہ نسب معلوم نہیں، لیکن جیسا کہ ان کے کلام سے واضح ہو رہا ہے، وہ اپنے لئے راجہ کا تخلص استعمال کرتے ہیں۔ تمام اہلِ ہزارہ جانتے ہیں کہ ہزارہ کے لوگ پُرانے زمانے سے ہی حکمران کے لئے راجہ کا لقب استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ اب بھی لوگ یہاں تُرکوں کو راجہ ہی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ گکھڑوں کو بھی یہاں راجہ ہی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ولایت پکھل یا برِصغیر کے کسی اور حصے میں سیدوں کو راجہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہو۔ راجہ فقیر محمد گلی باغ کے رہنے والے تھے، لہٰذا ہم گمان کر سکتے ہیں کہ آپ نسلاً ترک ہی تھے۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس میں آپ کا مکمل نام راجہ

فقیر محمد ہی لکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگ غلطی سے لفظ دیوان کو "دیوانہ" سمجھ رہے ہیں۔ ترکوں کے عہد میں دیوان ایک بلند مرتبہ سیکرٹری یا وزیر کو کہا جاتا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ راجہ فقیر محمد طریق فقیری اختیار کرنے سے قبل دیوان کے مرتبے پر فائز رہ چکے ہوں گے، اور یا پھر آپ کے خاندان کے افراد کو دیوان پکارا جاتا ہوگا۔ برصغیر میں اب تک ایسے خاندان موجود ہیں جن کے ناموں کے ساتھ دیوان کا لقب استعمال کیا جاتا ہے۔

دیوان راجہ فقیر محمد المعروف دیوان راجہ بابا گلی باغ کی چھاؤنی کے شمال مغربی حصے میں سکونت پذیر تھے۔ ایک مشہور روایت ہے کہ ترک سلطان نے دیوان راجہ بابا کو تحفے کے طور پر ایک گھوڑا بھیجا، اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس شاہی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر دیوان راجہ بابا نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ آپ نے گھوڑے کو ذبح کرا کے فقرا میں تقسیم کر دیا اور اس کی ایک ٹانگ سلطان کے پاس روانہ کر دی۔ سلطان اپنے گھوڑے کی ٹانگ دیکھ کر اور دیوان راجہ بابا کا جواب سن کر سخت برہم ہوا اور اس نے سخت غصے میں آ کر حکم بھیجا کہ اس کا گھوڑا سالم بھیجا جائے، ورنہ راجہ بابا کو سخت سزا کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ دیوان راجہ بابا نے فرمایا کہ جب یہ گھوڑا مجھے تحفہ کے طور پر بھیجا گیا تھا، تو پھر یہ میری مرضی تھی کہ میں جیسے چاہتا اسے استعمال کرتا۔ بہرحال سلطان کا حکم سننے کے بعد آپ نے مردہ گھوڑے کی ہڈیوں کو جمع کر کے ان پر اپنی لاٹھی ماری اور قم باذنی کہا۔ گھوڑا آپ کی کرامت سے زندہ ہو گیا، مگر اس کی ٹانگیں تین ہی تھیں۔ آپ نے تین ٹانگوں والا گھوڑا سلطان کو بھیج کر فرمایا کہ چوتھی ٹانگ تمہارے پاس ہے، اسے تم خود ہی لگا لینا۔ کہتے ہیں کہ سلطان یہ ماجرا دیکھ کر اور بھی غضب ناک ہوا اور اس نے دیوان راجہ بابا کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جب آپ گرفتار ہو کر اس کے پاس حاضر ہوئے تو اس نے آپ کو پھانسی کا حکم دے دیا۔ سلطان کی عدالت جہاں اب دیوان راجہ بابا کا مزار ہے، کی پچھلی سمت میں اس لوہار کی دکان تھی جو ملزموں کو پھانسیاں فٹ کیا کرتا تھا۔ جب لوہار نے دیوان راجہ بابا کے گلے میں پھانسی ڈالنے کی کوشش کی تو آپ کی کرامت سے پھانسی ٹوٹ گئی۔ پاس کھڑے ترک افسر اس منظر کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ پھر دیوان راجہ بابا نے جذب میں آ کر زمین پر زور سے ایک نیزہ مارا جس سے کچھ پانی نکل آیا۔ آپ نے دوسری بار پھر نیزہ مارا جس سے مزید پانی نکلا۔ تیسری بار آپ نے ایک اور نیزہ مارا جس سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ جب چوتھی بار آپ اپنا نیزہ اٹھانے لگے تو پاس کھڑے ہوئے ترک افسر گھبرا کر آپ سے معافی مانگنے لگے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تین حصہ تک

تباہ ہو جائیں گے، اور چوتھا حصہ باقی رہ جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب!

دیوان راجہ بابا کی اس بددُعا کا چرچا اب بھی ترکوں کے تمام گھرانوں میں پایا جاتا ہے، چونکہ آپ سلطان محمود خورد کے عہد کے بزرگ تھے، اس لئے جس ترک سلطان کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے، وہ سلطان محمود خورد ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کتاب کی فراہمی کے سلسلے میں دیوان راجہ بابا کے مزار کی زیارت کی ہے اس مزار کے گدی نشین ترک ہی ہیں۔ ان گدی نشین ترکوں کا خاندان سلطان لشکری کی اولاد میں سے ہے۔ ہمارے ملک میں یہ عام رواج ہے کہ ہر صاحب مزار کی گدی نشین اس کی اولاد یا خاندان ہی میں سے ہوا کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے اس خیال کو اور بھی تقویت ملتی ہے کہ دیوان راجہ بابا نسلاً ترک ہی تھے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ترک دشمن انقلاب کے باوجود لوگ ایک ترک خاندان کے افراد کو آپ کے مزار کا گدی نشین تسلیم کر لیتے۔ اب آپ کے مزار کے گدی نشینوں کے علاوہ ترکوں کا کوئی دوسرا خاندان گلی باغ میں موجود نہیں۔ آپ کا مزار عبرت کا مقام ہے۔ اس زمانے میں یہ ترک سلطان کی عدالت تھی۔ عدالت قلعے کے دیوان عام میں واقع تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بارہ دری بھی تھی۔ بارہ دری کا ڈھانچہ اب بھی موجود ہے۔ اس کے پاس ہی خندق کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ آپ کا مزار اسی جگہ واقع ہے، جہاں ترکوں کے عہد میں اکبر اور جہانگیر جیسے شہنشاہ، سلاطین پکھلی سرکار کے ذاتی مہمان ہوا کرتے تھے۔ آپ کے مزار کے پاس ہی سلطان محمود خورد کی سنگ مرمر کی قبر کا ایک ڈھانچہ اب بھی پڑا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کا یہ ڈھانچہ بنوایا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ دیوان راجہ بابا کو پھانسی کی سزا دینے والے والی پکھلی کی قبر کا بھی آج نام و نشان تک باقی نہیں اور دیوان راجہ بابا آج وہیں آرام فرما ہیں جہاں اس نے آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ جب میں آپ کے مزار پر حاضر ہوا تو آپ کے گدی نشینوں نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ کچھ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں اسی سلطان محمود خورد کی اولاد میں سے ہوں، تو انہوں نے مجھے بڑے شوق سے دیکھا۔ آپ کے مزار کے گدی نشین رحمان گل نے مجھے دیوان راجہ بابا کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنا شجرہ نسب بھی دیا۔ میں نے تمام مشہور صوفی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دیوانِ راجہ کا کلام شاعری اور صوفیانہ فکر کے لحاظ سے کسی طرح بھی رومیؒ، عطارؒ، حافظؒ اور سنائیؒ سے کم نہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اہل سوات میں آج تک کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہو سکا جو آپ کے کلام کی طباعت کا اہتمام کرتا۔ آزاد کشمیر کے مقابلے

کے ایک صاحب نے آپ کے کلام کی طباعت کرائی تھی، مگر اس میں جابجا غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ آپ کے مجموعۂ کلام میں سے چند اشعار نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل سطور میں درج کئے جاتے ہیں، ان سے آپ کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تقدیرِ الٰہی

پیش از وجود ہر کس کاتب نوشت حرفے — جف القلم بماشد اکنوں چہ گونہ گردد
آں را کہ حق تعالیٰ میموں نہ کرد ہرگز — بعد از ہزار کوشش میموں چہ گونہ گردد
تدبیر بخت ہر کس بیروں ز دست ہر کس — اکنوں ز جستجوئے افزوں چہ گونہ گردد
راجہ بخواہ رحمت زیرا آں کہ گفت احمد — مرحوم حق تعالیٰ ملعوں چہ گونہ گردد

قدرتِ الٰہی

گاہ خاک[1] را مہماں کنم، گاہ نار[2] را شیطاں کنم — ایں ہم کنم آں ہم کنم کس را نباشد چوں مرا
مومن کنم بے گانہ را، مسجد کنم بت خانہ را — عاقل کنم دیوانہ را، کس را نباشد چوں مرا
از کافراں احمدؐ نگر، از لات بت آمد عمرؓ — از نوحؑ کافر شد پسر کس را نباشد چوں مرا
آں بچۂ را بے گناہ، انداختم در قعرِ چاہ — از چاہ کردم بادشاہ کس را نباشد چوں مرا

سرِّ پنہاں

آشکارا یافتم من سرِّ پنہاں در جہاں — گاہ احمدؐ گاہ آدمؑ گاہ حوّا یافتم
گاہ او معشوق آمد، گاہ عاشق آمدہ — زیں معانی گاہ مجنوں گاہ لیلیٰ یافتم
سالہا باشد کہ من جستم حبیبِ خویش را — ایں زماں در ہر چہ دیدم عین اُو را یافتم
چوں وجودِ کس ندارد، بالحقیقت جز خدا — آں وجودِ محضِ مطلق عین ہر جا یافتم
گفت راجہ ناگہاں جاناں رخے رامے نمود — صد ہزاراں جست کردم حسن او را یافتم

---

[1] اشارہ ہے معراج شریف کی طرف [2] اشارہ ہے ابلیس کی طرف [3] یعنی یوسف علیہ السلام

بے توجہ کار آید

کونین را بیارند بر دوے جہاں نگارند
بر دست من سپارند بے توجہ کار آید

بالائے عرش رفتم، بر تخت نور خفتم
واللہ راست گفتم، بے توجہ کار آید

راجہ بگفت ہر دم، ہژدہ ہزار عالم
یکبارگی بیارند بے توجہ کار آید

اندر جہاں نگنجد

اندر کنارِ جاناں اسرار ہا مے گفتم
جبریل با ملائک اندر میاں نگنجد

ایں خاکِ بے ادب را نسبت باو چہ باشد
اما چو او نوازد کس را زباں نگنجد

بلبل چوں گل ببیند، گویا بہ گل نشیند
بے چارہ زاغ مسکیں در بلبلاں نگنجد

آں روئے محض مطلق، بے چوں و بے چگونست
از وہم و فہم بیروں صورت در آں نگنجد

سرمست و لاابالی پروائے کس ندارد
آنکس ز کس نباشد اندر کساں نگنجد

آں دم کہ یک زمانے با دوست خود بیاشم
آں دم دمے ست باقی اندر دماں نگنجد

اندر جمالِ جاناں، راجہ دوام غرق ست
از فرقِ ایں مراتب اندر جہاں نگنجد

ترکِ دنیا

اے جواں تا بر نیائی از میانِ لا الہ
صد ہزاراں جاں بازی بوئے اللہ کے بود

عاشقاں را در دو عالم جز خدا کس دوست نیست
پیشِ مجنوں ہیچ گہ جز نقشِ لیلیٰ کے بود

قلبِ مومن حرم خانہ، دخل غیرے شد حرام
یک زنے را با دو شوہر عقد یک جا کے بود

یک ولایت چوں دو سلطاں بادشاہی میکنند
آں ولایت دائما جز شور و غوغا کے بود

بر درِ مخلوق رفتن غیر خواری نیست نیست
ایں خواری خویشتن را کارِ عاقل کے بود

ایں جائے وفا نیست

فانی است ہمہ چیز کہ ایں دار بقا نیست — بردار دلِ خویش کہ ایں جائے وفا نیست
ما ایم خراباتیم دریں دہرِ خراباتی — دردیست دریں سینہ کہ جز دوست دوا نیست
ما عینِ ہما ایم کہ در عشق رسیدیم — کذاب بود آں مرد کہ او عینِ ہما نیست
آں موت حیات ست کہ در کوئے حبیب است — موتے کہ در آں کوئے بود است روا نیست
از خویش جدا ایم کہ با خویش نباشیم — افسوس بر آں مرد کہ از خویش جدا نیست
ہر جا کہ برفتیم بجز دوست ندیدیم — ایں قول کہ گفتیم صوابست خطا نیست
راجہ کہ بدیں چشم عیاں دید بیاں چیست — اما چہ تواں کرد کہ در چشم شما نیست

نورِ حق

یک نور را خصلت چنیں ہم او سما ہم او زمیں — ہم خود ملک ہم آدمی در ہر سرِ سر بہ بیں
یک نور را اندر جہاں صورت شود در ہر زماں — گاہے چنیں گاہے چناں در ہر سرِ سر بہ بیں
گاہ روح گردد گاہ تن گاہ مرد گردد گاہ زن — گاہ بچہ گردد پرفتن در ہر سرِ سر بہ بیں
گاہ صید شد گاہ دانہ شد گاہ زلف شد گاہ شانہ شد — گاہ شمع گاہ پروانہ شد در ہر سرِ سر بہ بیں
گاہ نور شد گاہ نار شد گاہ یار گاہ اغیار شد — گاہ خفتہ گاہ بیدار شد در ہر سرِ سر بہ بیں
کوتاہ کن راجہ زبان یک نور را بنگر عیاں — ہم خود شدہ جملہ جہاں در ہر سرِ سر بہ بیں

دیدارِ یار

در کوئے او ہر بار رفتم تا بہ بینم روئے او — لطف او بر من نگر دیدار او ہر بار شد
چوں خورم مستِ شرابِ لم یزل از دستِ دوست — بعد خوردن جان ما ہم مست ہم ہشیار شد
چوں تجلی کرد جاناں بر دلِ من ناگہاں — ایں دلم بعد از تجلی مخزنِ اسرار شد
مطرباں را زد دگر تا طبلِ شادی در زند — بختِ راجہ گشت میموں بار دیگر یار شد

انسب نسب بہم

بے کام و بے زبانم انسب نسب نسبم
بے نام و بے نشانم انسب نسب نسبم

سلطان بے وزیرم، دانائے بے نظیرم
گرچہ نہ تن اسیرم انسب نسب نسبم

ہم بندہ ہم خدایم، ہم شاہ ہم گدایم
ہم وصل ہم جدایم انسب نسب نسبم

من مست فی الستم از خیر و شر برستم
سر نہفتہ گفتم انسب نسب نسبم

من مرغ لامکانم، جز لامکاں ندانم
بر تختِ قدسیانم انسب نسب نسبم

در کوئے مے فروشاں، عشاق بادہ نوشاں
افتادہ سینہ جوشاں انسب نسب نسبم

راجہ کہ نورِ حق است در ذات محوِ غرق است
اندر میاں چہ فرق است انسب نسب نسبم

مستِ الست ہستم

شہباز شاہسوارم پروازِ قدس دارم،
آنجا شکار آرم مستِ الست ہستم

رفتم بعرش اکبر، خوردم شرابِ اطہر
واصل شدم کہ اظہر مستِ الست ہستم

ما ایم عینِ وحدت آزاد ہم ز کثرت
باشد نہ ہیچ ملت مستِ الست ہستم

دلبر بگفت راجہ دائم تو باش ایں جا
با ما تو باش یکجا مستِ الست ہستم

جگرِ خویش چشیدم

یکدم کہ بلا دوست بآرام بود حیف
حقا کہ دریں دہر چنیں حیف ندیدم

با دوست کسانیکہ نباشد زہے عمرش
بر بام فلک قدس چنیں شور شنیدم

از خویش بمیرند کہ آں موت حیات است
واللہ بعدِ موت بمقصود رسیدم

سرمستیٔ خون است بجز خونِ جگر نیست
راجہ کہ منم خونِ جگر خویش چشیدم

جز خدا مقصود نیست

حمد گفتن عاشقاں را فرض آمد در وصال
پیش چشم حمد گویاں جز یکے محمود نیست

عاشقاں را نقد آمد آں جمالِ دوست خویش
زیں جہت در شانِ شان دیدار حق موعود نیست

نزد اینان غیر حق معدوم محض است نیست شک — بالحقیقت در دو عالم جز خدا معبود نیست
در عبادت حق تعالیٰ باش دائم چست چست — زانکه هرگز در دو عالم راجه را مقصود نیست

سیمرغ کنت کنزاً

نه اسمم نه جسمم نه عقلم نه جانم — نه انسم نه جنسم نه اینم نه آنم
چه جبروت چه ملکوت چه لاهوت چه افلاک — همه زیر پائے ماست که سیمرغ همانم،
نه وصلم نه فصلم نه قریبم نه بعیدم — نه از دوست جدایم که ما عین همانم
در دو سرائے لانم، بے رنگ نور صافم — عنقائے کوہ کافم و مطلب نوشانم
در عقل تو نه گنجم در فهم تو نه سنجم — سیمرغ کنت کنزاً راجه زہے عرفانم

این چشم ندارم

در عشق چنانم که معشوق فراموش — در ذکر چنانم که مذکور نه دانم
اسرار خرابات همه وصف خرابات — خفاش چه داند که بخورشید سوالم،
راجه به تماشائے جهان هائے عظیم است — امّا چه تواں کرد که این چشم ندارم

عاقل نیابد فن ما

گفتار شد سرکار ما زنار شد دستار ما — چیزے مگو در کار ما عاقل نیابد فن ما
عالم بود در لانعم عاقل بود در فکر و رنج — عاشق بود با وے بهم عاقل نیابد فن ما
سرمست او شیدا شود، آزرده و رسوا شود — از خویش ناپیدا شود عاقل نیابد فن ما
کامل کجا در درد ما، عالم کجا در غور ما — از عقل بیرون طور ما عاقل نیابد فن ما
راجه کشا میخانه را، خم ها بده دیوانه را — افسانه کن افسانه را عاقل نیابد فن ما

گر یار نباشد

آں یار کجا یار کہ با یار نباشد
در بند سرِ زلف گرفتار نباشد

تحقیق چنیں گشت کہ برباد ہمے گشت
العمر کہ مصروف بہ دلدار نباشد

آواز زلاہوت چنیں خاست زجبروت
عشاق کجا مست کہ ہشیار نباشد

گفتند کسانیکہ مے ناب چشیدند
آں مرد چرا زیست کہ میخوار نباشد

گلزار کہ بے یار بود خارزاں بہ است
گلزار بلا یار بجز خار نباشد

بازار بود آں کہ درو خمر فروشید
بازار بلا یار بجز خار نباشد

راجہ کہ چنیں گفت کے داند خبر ہشیار
بالا مقر آں محرم اسرار نباشد

وجود محض مطلق

وجودِ محض مطلق را ہمہ جا ہر زماں دیدم
بہر سوئے بہر کوئے بہر صورت عیاں دیدم

ندیدم من مگر او را کہ غیر از او عدم محض است
فنا دیدم ہمہ کس را چہ او را در میاں دیدم

تجلی را نہایت چوں نباشد در ہمہ عالم
تجلی او میانِ کس میانِ ناکساں دیدم

زہے معنی کہ اندر فہم باید ہیچ کہ بر من
ہمہ معنی بہ سہ حرفے بہر نفس عیاں دیدم

ہو الاول ہو الآخر، ہو الظاہر ہو الباطن
ہموں ظاہر ہموں باطن ہموں مظہر ہماں دیدم

اگر رفتم باو رفتم، اگر خفتم باو خفتم
ندیدم ہیچ چیزے را مگر او درمیاں دیدم

زہے دیدہ کہ آں دیدہ بجز او را نمے بیند
بحمد اللہ کہ آں دیدہ بصاحب دیدگاں دیدم

بہر حالے پس از بینا شدہ راجہ چنیں گوید
بنورِ چشمِ باطن عین خود را اندراں دیدم

در نور خدا ایم

نوریکہ لطیف است کہ از فہم نہاں است
ایں نور بہر وصف دریں دہر عیاں است

معلوم چنیں گشت دریں دہر بہ تحقیق
آبے کہ خضر خورد بہر جوئے رواں است

نقاشِ جہاں نقش جہاں خوب بیاراست
کیں نقش چہ نقشند کہ از دیدہ نشاں است

ایم کہ در نورِ خدا ایم دریں دہر
آنچہ تواں کرد شما کورِ عیاں است

راجہ کہ دریں دہر ہمیں بود ہماں گفت — چیزیکہ وجود است آں خود عین ہما است

خورشید ہر دو عالم تاباں شدست مارا — امروز شاہِ شاہاں مہماں شدست مارا
جبریل با ملائک درباں شدست مارا — ہر صبح و شام آں جا طیراں شدست مارا
آں راہ قدسیاں را دشوار سخت آید — از فضلِ حق تعالیٰ آساں شدست مارا
افلاک با کواکب سکانِ ملاء اعلیٰ — ہر یک ز چاکری شاداں شدست مارا
چیزے کہ انبیاء را امکاں نہ بود ہرگز — آں چیز خود بآساں امکاں شدست مارا
احمدؐ بعرش حاضر، موسیٰ بکوہ ناظر — از لطف در کنارم رحماں شدست مارا
دیدارِ حق تعالیٰ در ما عیاں ست پیدا — دیدہ بصر بہ بیناں برہاں شدست مارا
بینند روئے مارا، دوزخ حرام گردد — بر کشفِ ایں عجائب فرماں شدست مارا
اوصافِ ذاتِ واحد ظاہر شدست مارا — با ذوقِ ایں معانی عرفاں شدست مارا
دریائے بے نہایت پایاں تواں کجا شد — لنگر بغیر کشتی پایاں شدست مارا
احساں شکرِ احساں مردم کجا تواند — چندیں ہزار ہر دم احساں شدست مارا
با خلق احتیاجے راجہ نماند ایں جا — زیرا آنکہ در اطاعت رحماں شدست مارا

پند و نصائح

فقر والی اللہ در گوشش کن — اگر ہوش مندی سخن گوشش کن
توانگر اسیر ست توانگر اسیر — بہر حال درویش باشد امیر
ترا فقر فخری نماید جمال — بدیں فقر فخری بیابی کمال
تونگر ہمہ عمر حیراں بود — ز بہرے ہوائے پریشاں بود
قرارے نہ دارد کسے در جہاں — کہ غم ہا پریشاں کنند ہر زماں
بدیں آدمی صد ہزاراں بلاست — کہ بہر شکم ہر کسے مبتلاست
شکم مردم چو گاؤ خر است — ز سگ بلکہ از خوک فائق تر است

تصوف نہ کارے حسیساں بود — سرانجام دادن نہ آساں بود
کسے راکہ در عشق باشد مقام — بود ذوقِ کونین بروے حرام
بجز وصلِ دلبر ندیدم جمال — بجز وصل جاناں ندیدم کمال
چوں بسیار گردم بدیدم جفا — کہ از غیر ہرگز ندیدم وفا
بغیرے دلارام باشد ممات — چوں باُو بمانند باشد حیات
اگر مردِ ہستی ز دنیا گزر — پس آنگہ دلِ خود بمولیٰ سپر
بہ یک تن دو جاں را تحمل کجاست — بیک جاں دو خالق دو مولیٰ کجاست
حیاتی کہ باشد ز دُنیا سُرور — نباشد مگر آں متاع الغرور
خدا را بقاست خدا را بقا — دگر ہر چہ بینی فنا در فنا
دریں دہر صوفی بود باصفا — بجز دوست خود را نسازد وفا
بود فانی از خویش باقی بحق — ز علمِ لدُنّی بگوید سبق
بجز ہُو ہُو اللہ ندارد متاع — بجز نور رحمت ندارد شعاع
قرآں را چہ خوانی کہ مومن نۂ — تو بے غم نہ باشی کہ ایمن نۂ
چو رازق روزی دہد بے عدل — تو ہر دو بگردی چرا اے دغل
کسے راکہ عزت بود در نہار — بہ رازق مطلق کند اعتماد
ہزاراں ندامت بباشد ترا — کہ با دوست دائم نبودم چرا
بدیں پند راجہ بیارائی جاں — نگر حالِ خود را چہ باشد بر آں

انبیاء و اولیاء را حق بداں — سر معنی کردہ ام با تو عیاں
من رانی گفت احمد مصطفےٰ — چند باشی در حباب اے بے وفا
لی مع اللہ گفت احمد در بیان — لیک چہ دانند آں حسنات آں
از رموز سرِ حق آگاہ نۂ — لاجرم کوری و مردِ راہ نۂ

عاقلی در کارِ دنیا غافلی در کارِ دیں — بہرِ غفلت دور ماندی از رہِ اسرارِ دیں

یار را بگزاشتی اغیار را برداشتی — راستی ایں خطرہ در دل از کجا انگاشتی

گفت شیطاں پیش کردی گفت رحماں رقتنا — کس تواند کرد ہرگز آنچہ تو کردی جفا

در خودی کردی نظر مسدود گردی در ہوا — ایں ہوا را اے برادر کے روا دارد خدا

پاسبانِ نفس باید تا نگردد دربدر — چوں بگردد دربدر او خوار گردد سربسر

شرم باید از خلائق خوف باید از خدا — ہر کرا ایں نیست فکر او نگشت از حق جدا

بہر کشتن نفس کافر تیغِ خود را تیز کن — امرِ حق را پیش گرداں از شر پرہیز کن

بیخ بر کن آں درختے را کہ بروے بار نیست — عاشقاں را کار بایدِ راست با گفتار نیست،

گفت راجہ خوش بکن ایں پند با اندِ دلپذیر — از ہمہ پرہیز کلی با خدا محکم بگیر

زابلیس عبرت بباید گرفت — خودی در خدائی نشاید گرفت

بجز خود پرستی ندیدم بدی — تو از خود بکن دور کفر و بدی

اگر راست خواہی برو راہِ راست — بجز راست راہے دگر راہ خطاست

رضائے خداوند راجہ بجو — بجز امرِ باری دلِ خود مشو،

دیوان راجہ بابا کے کلام سے مندرجہ بالا اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ اگرچہ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ آزاد کشمیر کے ایک صاحب نے چھپوایا تھا اور اس کی ایک کاپی پشاور یونیورسٹی میں بھی موجود ہے، لیکن اس مجموعہ میں تمام اشعار موجود نہیں۔ چونکہ گزشتہ اڑھائی سو برس کے طویل عرصے میں یہی ایک ادھورا سا مجموعۂ کلام چھپوایا گیا ہے، اس لئے اکثر نسخے قلمی شکل میں ہی موجود رہے ہیں۔ ان قلمی نسخوں کی نقل کرتے وقت اکثر اصحاب سے بعض الفاظ کے ہجوں کی غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اشعار بھی غلطیوں سے پاک نہیں۔ بہرحال اگر کوئی صاحب فن محنت کرنے پر آمادہ ہو جائیں، تو ان غلطیوں کی اصلاح ممکن نہیں۔

آپ [illegible] اور منازل سلوک کے

حقائق کے بارے میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ آپ کے تعلق باللہ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جہاں ایک طرف آپ سیر الی اللہ میں فنا و بقا کی بلند ترین منزلوں پر پرواز کرتے نظر آتے ہیں، وہاں مقامِ عبدیت میں اتباعِ سنت کے ساتھ ان کا رشتہ کہیں منقطع نہیں ہوتا۔

لِکُلِّ قَوْمٍ اَجَل کے قرآنی اصول کے مطابق ترکوں کے عہدِ حکومت کا زمانہ پورا ہو چکا تھا۔ ترکوں میں وہ تمام برائیاں پیدا ہو چکی تھیں جو ایک زوال پذیر قوم میں پیدا ہوا کرتی ہیں، اس لئے آپ کی زبان حقیقت بیان سے ترکوں کے زوال کی صدا بلند ہوئی۔ والیٔ سلطان محمود خورد اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے لئے روانہ ہوا اور بالآخر اس کی موت سرحدی علاقے میں واقع ہوئی۔ اس کی موت کے بعد بہت جلد ترکوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی میں سلطان مقرب خان والیٔ دھنتوڑ کا پلڑا بھاری رہا، لیکن اس کے مظالم کے خلاف دیگر ترک سرداروں نے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں ایک شکایت روانہ کر دی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کی شکایت پر ایک شاہی منصبدار مبارز الدین خان گکھڑ کو متعین کیا جس نے سلطان مقرب خان کے مخالف ترکوں کے تعاون سے اس کی بغاوت کو فرو کر دیا، مگر اس کے باوجود پچھلی سرکار میں سلطان محمود خورد کی اولاد اور دیگر ترک سردار کسی ایک سلطان زادے کی حکمرانی پر متفق نہ ہو سکے۔ پچھلی سرکار اس خانہ جنگی کے زمانے میں کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور ترکوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر علاقہ کے لوگ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۷۱۳ء میں سلطان محمود خورد کے داماد سید جلال بابا نے سواتی لشکر کے ساتھ دیوان راجہ کی موجودگی ہی میں گلی باغ پر قبضہ کر لیا۔ آپ اس تاریخی واقعہ کے بعد فوت ہوئے اور آپ کا مزار اسی عدالت میں تعمیر کیا گیا جو قلعہ کے دیوانِ عام میں واقع تھی۔

بعض لوگوں کو ابھی تک تعجب ہوتا ہے کہ دیوان راجہ بابا نے ترک ہوتے ہوئے ترکوں کو کیوں بددعا دی۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ یہ بددعا ترک کی حیثیت سے نہیں دی گئی تھی، بلکہ یہ تو اس صاحبِ عرفان بزرگ کی زبانِ حقیقت بیان کے الفاظ تھے جس نے وجد میں آکر انسب نسب نسبم کا نعرہ لگایا تھا جو انسان اس دارِ فانی کے طلسم رنگ و بُو کو توڑ کر بقا باللہ کے بلند مرتبے کو حاصل کر چکا ہو، اس کا اندازِ فکر اہلِ دنیا کے اندازِ فکر سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے کیا نوح علیہ السلام اور دیگر پیغمبروں نے اپنی بداعمال قوموں کو بددعائیں نہیں دی تھیں؟ اہلِ دنیا اور اہل اللہ کے اندازِ فکر میں

امتیاز کرنے کے لئے ہی مولانا رُوم نے فرمایا تھا ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر
شیر آں باشد کہ مردم را دَرد
شیر آں باشد کہ مردم مے خورد

❖

ترکوں کا زوال

ترکوں کے زوال کے آثار اورنگ زیب عالمگیر کے آخری دور ہی میں ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر عرصۂ دراز تک وسطی اور جنوبی ہند کی مہمات میں اتنا مصروف رہا کہ صوبۂ کابل کا یہ علاقہ اس کی ذاتی توجہ سے محروم ہوگیا۔ بادشاہ کی اس طویل غیر حاضری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس علاقے کے منصب دار اور جاگیر اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتنے لگے۔ یہاں طرح طرح کے مقامی مسائل پیدا ہوگئے، لوگ تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ زبردست لوگ زیردستوں کے حقوق غصب کر رہے تھے، لیکن مصیبت زدہ اور مظلوم لوگوں کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ آگرہ یا دہلی جیسے دور دراز مقامات پر پہنچ کر اپنی شکایات بادشاہ کے گوش گزار سکیں، جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ سرحدی علاقے میں ایمل خان، بہاکو خان اور خوشحال خان خٹک جیسے قبائلی سرداروں نے زبردست ہنگامے کھڑے کر دیئے۔ شاہراہِ کابل غیر محفوظ ہوگئی۔ اس پر سے نہ صرف تجارتی قافلوں بلکہ شاہی افواج تک کا گزرنا محال ہوگیا۔ علاقہ گکھڑ، اٹک، نیلاب، اور پکھلی سرکار کے منصب دار اس علاقے میں امن وامان قائم نہ کر سکے۔ محمد آمین خان صوبیدار [illegible]، کاخل خان فوجدار اٹک اور شمشیر خان بھی معمولی کامیابیاں ہی حاصل کر سکے۔

والئ پکھلی سلطان محمود خورد سرحدی بغاوتوں ہی کے سلسلے میں اورنگ زیب عالمگیر سے ملاقات کرنے کے لئے دہلی روانہ ہوا، لیکن اس کے مقدر میں واپسی نہ تھی۔ اورنگ زیب سے ملاقات کے بعد سلطان محمود خورد انہی سرحدی بغاوتوں کے فرو کرنے کی مہمات میں شامل ہوا اور اپنا فرض ادا کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ ۱۶۶۶-۶۷ء میں یوسف زئیوں نے پہلی بار دریائے سندھ کو عبور کر کے

پکھلی سرکار کے مشہور سرحدی قلعہ چھانجل یا چھاچھل پر اچانک حملہ کر دیا۔ قلعہ کے کمانڈر شمشیر خان نے معمولی جمعیت کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، مگر اسے پکھلی سے کوئی کمک نہ مل سکی جس کی وجہ سے قلعہ پر یوسف زئیوں کا قبضہ ہو گیا۔ شمشیر خان نے اس واقعہ کی اطلاع اٹک کے [illegible] کو پہنچائی اور پھر وہاں سے ساری صورت حال اورنگ زیب بادشاہ کے نوٹس میں لائی گئی۔ موقع پر ایک شاہی [illegible] صوبیدار کابل اور متعدد منصب داروں کو یوسف [illegible] کی سرکوبی کے لئے [illegible] منصب داروں کی اجتماعی کوششوں سے یوسف زئیوں کو اس علاقے سے [illegible] خراج نے سوات اور باجوڑ کے علاقے میں داخل ہو کر کئی اہم [illegible] پر قبضہ [illegible]

[illegible] اورنگ زیب عالمگیر بنفس نفیس حسن ابدال تشریف فرما ہوا اور وہ تمام واقعات [illegible] ہوئے جن کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں کر دیا گیا ہے۔ تقریباً ایک سال کے قیام کے بعد اورنگ زیب حسن ابدال سے واپس روانہ ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب سرحدی علاقہ میں امن و امان بحال ہو چکا ہے، لیکن بغاوت کے اسباب اتنے گہرے تھے کہ بادشاہ کی واپسی کے بعد بھی کشیدگی کی فضا بدستور قائم رہی۔

پکھلی سرکار میں سلطان محمود خورد کی شہادت کے بعد ترک کسی نئے حکمران کے انتخاب پر متفق نہ ہو سکے۔ کافی عرصہ تک سلطان محمود کی شہادت یا گمشدگی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہے اور بالآخر ترکوں کے درمیان ایک خطرناک خانہ جنگی شروع ہو گئی جو ان کے زوال کا سب سے بڑا سبب بن گئی۔

خانہ جنگی:

سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی سرکار کے عہد میں علاقہ مظفر آباد کا ترک حاکم کمال خان تھا۔ حاکم تاول سلطان قیاس الدین تھا جو سلطان محمود کا حقیقی بھائی تھا۔ اس کا دوسرا بھائی سلطان مقرب خان حاکم دمتوڑ تھا۔ چھانجل کے قلعے کا فوجدار شمشیر خان تھا، لیکن گلی باغ کے صدر مقام میں سلطان محمود نے موجودہ کاغانی سیدوں کے مورث اعلیٰ سید جلال بابا اور گڑھی حبیب اللہ کے خوانین کے

مورثِ اعلیٰ مسمّٰی مراد خان کو اپنا معتمد بنا رکھا تھا۔ مراد خان کا دوسرا بھائی سیّد جلال بابا کے پاس معتمد تھا، اس کا نام ہی بھائی خان تھا۔ آئندہ اوراق میں سیّد جلال بابا کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا رہے ہیں سلطان محمود کے عہد میں سیّد جلال اور مراد خان ریاستِ پکھلی سے گزر کر کشمیر کی طرف جا رہے تھے جس وقت سلطان محمود کو ان کے گلی باغ میں قیام کی اطلاع ملی تو اس نے ان دونوں کی مہمان نوازی کی اور پھر انہیں اپنے ہاں ٹھہرالیا۔ سیّد جلال بابا چونکہ حضرت پیر صاحب بابا کی اولاد میں سے تھا، اس لئے سلطان محمود نے اس سے اپنی بیٹی کا عقد بھی کرا دیا۔ اس طرح یہ حضرات پکھلی سرکار میں سلطان کے معتمد بن کر اربابِ بست وکشاد بن گئے۔ بقیہ ترک سردار سلطان کی ان نوازشات سے ناخوش تھے اور انہیں ان حضرات کے اس قدر عروج وترقی سے صدمہ پہنچا۔ سلطان محمود نے سیّد جلال بابا کو درّہ بھوگڑ منگ اپنی بیٹی کے جہیز کی صورت دے رکھا تھا، اور اس پہ بڑا مہربان تھا، مگر کچھ عرصہ بعد اسے سیّد جلال بابا کی باغیانہ حرکات کا شبہ پیدا ہوا؛ لہٰذا اس نے اپنے خفیہ دزدان کو سیّد جلال بابا کے قتل کا حکم دے دیا۔ سیّد جلال بابا ان کے حملے سے بچ کر بھاگ گیا اور سیدھا سوات کے علاقے میں چلا گیا، لیکن مراد خان بدستور گلی باغ میں سلطان کا معتمدِ خاص بنا رہا۔

سرحدی علاقے کی بغاوتوں کے زمانے میں سلطان محمود خورد اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوا، لیکن اس کے مقدر میں پکھلی واپس آنا نہ تھا اور وہ دہلی سے واپسی کے بعد حضرو کی لڑائیوں ہی میں شہید ہو گیا۔ عرصۂ دراز تک پکھلی میں اس کی واپسی نہ ہوئی تو یہاں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ اگرچہ قلعہ چھاچھل یا چھاچھل پر یوسف زئیوں کے حملے کو مغل افواج کے راست اقدام نے ناکام بنا دیا تھا اور یوسف زئی علاقہ سوات میں دب گئے تھے اور ان کے اہم مقامات کو قبضہ میں لے کر شاہی افواج نے اس علاقے میں امن وامان بحال کر دیا تھا، لیکن ریاست کے اندرونی حالات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ سلطان محمود کا ایک بیٹا مغل خان فوت ہو گیا۔ اس کا دوسرا بیٹا فاضل خان ۱۶۶۹ء میں غورغشتیوں اور دیگر قبائلیوں کی یلغار کو روکنے کے لئے اپنے دو بھتیجوں سمیت ہزارہ قارلق کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا تیسرا بیٹا دلیل خان مظفر آباد کے علاقے میں تھا۔ گلی باغ کے صدر مقام میں سلطان محمود کے صرف دو بیٹے مسمیان سلطان مرید خان اور سلطان عاقل خان ہی موجود تھے۔ یہ دونوں چھوٹے بیٹے تھے اور ریاست کے معاملات کی باگ ڈور عملاً مراد خان کے ہاتھ میں تھی جسے خود سلطان

محمود نے اپنا معتمد خاص بنا رکھا تھا۔ اصل ترک فوج سلطان محمود خورد کے ساتھ پہلے ہی سے سرکار پکھلی کے باہر اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

سلطان محمود کی گمشدگی یا شہادت کے بعد ترک سلاطین زادے کسی ایک کی حکمرانی پر متفق نہ ہو سکے اور نہ ہی مرکزی حکومت کی جانب سے سلطان محمود خورد کا جانشین نامزد کیا گیا۔ ترک سلاطین زادے مراد خان کی پرواہ کئے بغیر اپنے اپنے علاقے میں من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ ان کے درمیان کوئی رابطہ باقی نہ رہا۔ ریاست کا نظم و نسق بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ عوام میں ترک سرداروں کے مظالم اور عیاشیوں کے چرچے عام ہو گئے۔ رفتہ رفتہ کشیدگی اور بدامنی کی فضا خانہ جنگی میں بدل گئی اور تقریباً تمام چیدہ چیدہ سلاطین زادے ایک دوسرے سے مشت و گریبان ہو گئے۔

سلطان مقرب خان کی شورش:

ترکوں کے مابین ہونے والی خانہ جنگی میں سلطان محمود خورد کے دو بھائی سلطان مقرب خان اور سلطان قیاس الدین پیش پیش تھے۔ طویل کش مکش کے بعد سلطان مقرب خان حاکم دہتوڑ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ سلطان مقرب خان ایک سخت گیر انسان تھے۔ اس نے اپنے بھتیجوں اور دوسرے اقربا پر بڑی زیادتیاں کیں، لیکن طاقت کے بے دریغ استعمال کے باوجود ترک سردار اس کی حکمرانی پر متفق نہ ہو سکے، چونکہ ان کی اپنی صفوں میں بھی انتشار تھا اور وہ متحد ہو کر بھی سلطان مقرب خان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اس لئے ان میں سے چیدہ افراد نے سلطان مقرب خان کی چیرہ دستیوں کے خلاف اورنگ زیب عالمگیر کے پاس ایک شکایت روانہ کی۔ ان کی اس شکایت پر عالمگیر نے سلطان مبارز الدین خان گکھڑ کو جو کہ ایک شاہی منصب دار تھا۔ سلطان مقرب خان کی سرکوبی کے لئے ادھر روانہ کیا۔ مبارز الدین خان پیش قدمی کرتا ہوا دہتوڑ پہنچا۔ تاریخ گکھڑاں کا بیان ہے کہ سلطان مقرب خان کے پاس چالیس ہزار فوج تھی اور سلطان مبارز الدین خان بھی ایک جم غفیر لے کر اس کے مقابلے میں آیا تھا، لیکن یہ اس کتاب کے مصنف کی روایتی مبالغہ آرائی ہے۔ اس وقت نہ تو سلطان مقرب خان کے پاس چالیس ہزار فوج کا ہونا ممکن تھا، اور نہ ہی اس کے مقابلے کے لئے کسی جم غفیر کو لے جانے کی ضرورت تھی۔ قبل ازیں ریاست پکھلی کی وراثت کا معروف طریقہ تین سو سال کے طویل عرصے سے یہی چلا آ رہا تھا کہ

نقشہ گلی باغ

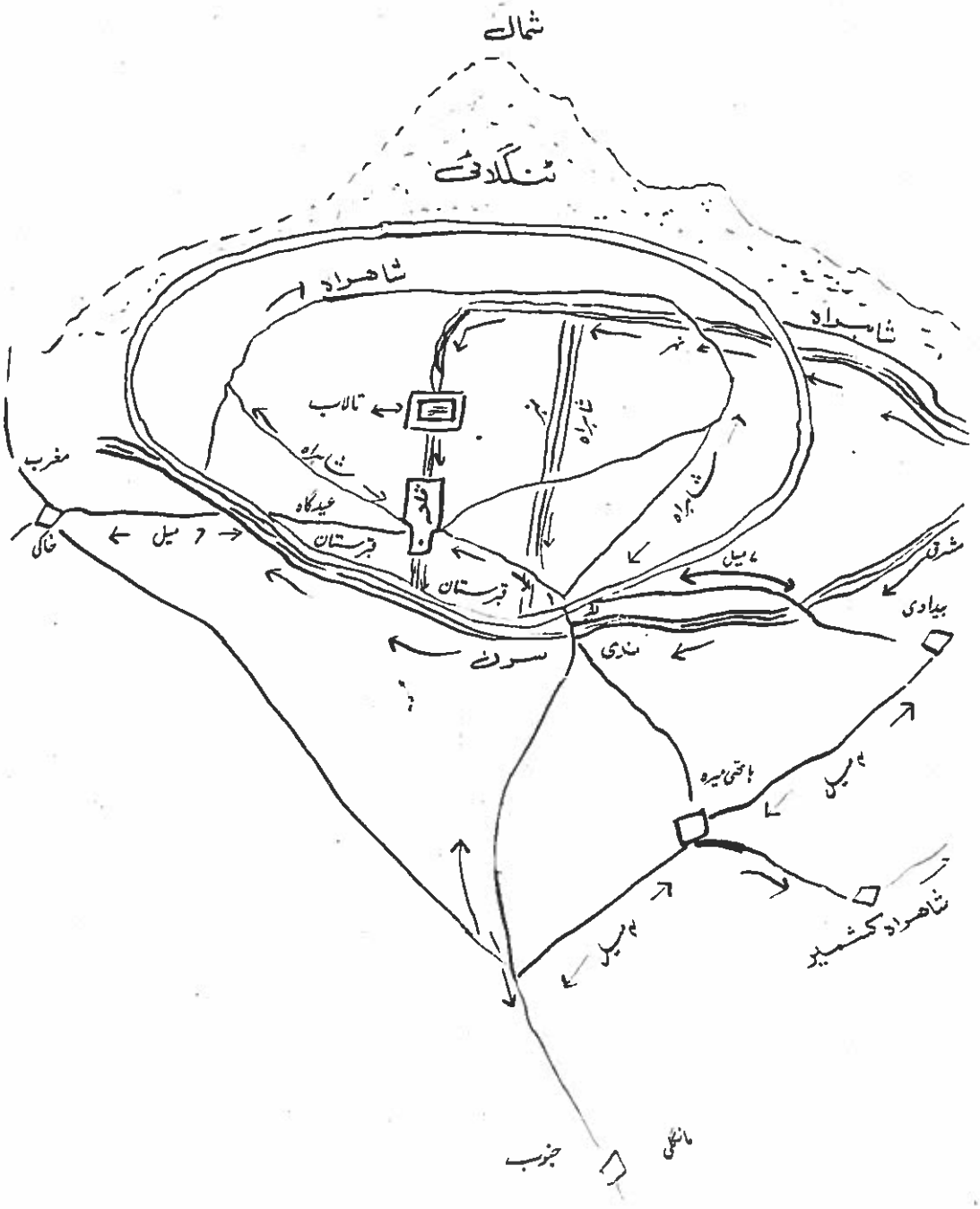
شمال
ٹنگلائی
شاہراہ
شاہراہ
تالاب
مغرب
عیدگاہ
قبرستان
قبرستان
خاکی
۲ میل
۲ میل
مشرق
بیادی
ندی
ہاتھی میرہ
۲ میل
۲ میل
شاہراہ کشمیر
جنوب
مانگلی

حکمرانی کی فوتیدگی کے بعد اس کا بڑا بیٹا اس کا جانشین بن جاتا تھا اور شہنشاہ اس کی جانشینی کی منظوری عطا کر دیا کرتے تھے۔ سلطان مقرب خان نے وراثت کے اس معروف طریقے کو نظر انداز کر کے محض طاقت کے بل بوتے پر ریاست کا حکمران بننے کی جسارت کی اس لئے نہ صرف اورنگ زیب عالمگیر بلکہ ریاست کے عوام بھی دل سے اس کے مخالف بن چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان مبارزالدین خان شاہی فوج لے کر میدانِ ہزارہ قارلق سے آگے بڑھ کر دہنتوڑ کے قریب پہنچا تو عوام نے اور ترک سلاطین زادوں نے کھل کر اس کا ساتھ دیا۔ سلطان مقرب خان نے بڑی بے جگری کے ساتھ لڑائی لڑی، لیکن اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لڑائی میں دہنتوڑ کے قلعے اور قصبے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ سلطان مبارزالدین خان گکھڑ شاہی فرمان کے مطابق ریاستِ پکھلی سے واپس لوٹ گیا اور اورنگزیب عالمگیر نے اس سے خوش ہو کر دانگلی کی جاگیر اسے عطا کر دی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی حکمرانی کا یہ آخری دور تھا اور وہ بڑے انہماک کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا، اس لئے وہ ریاستِ پکھلی کے معاملات پر پوری توجہ نہ دے سکا؛ چونکہ سلطان محمود کی فوتیدگی کی ابھی تصدیق نہیں ہوئی تھی، اس لئے ریاست کی وراثت کا فیصلہ بھی نہ ہو سکا۔ سلطان مبارزالدین کی واپسی کے بعد حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ دہنتوڑ کا علاقہ سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان کے دو خاندانوں میں تقسیم ہو گیا۔ سلطان پور اور رجوعیہ کے علاقے پر سلطان فاضل خان قابض تھا۔ علاقہ مانکرائے ملوک خان کے قبضے میں تھا۔ سلطان قیاس الدین تناول کے بیشتر علاقے پر قبضہ جما بیٹھا تھا اور مظفرآباد کے علاقے میں کمال خان سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ گلی باغ کے دارالریاست میں سلطان محمود کے صرف دو چھوٹے بیٹے سلطان مرید خان اور سلطان عاقل خان ہی موجود تھے، لیکن معاملات کی باگ دوڑ مراد خان کے ہاتھ میں تھی۔ چونکہ مراد خان کو سلطان محمود نے اپنا معتمدِ خاص بنا رکھا تھا، اس لئے ریاست کے معاملات کو وہی چلا رہا تھا اور سلطان محمود کے یہ بیٹے اسی کے بھروسے پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس طرح ریاست پکھلی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور اس کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا اور اس کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت کے زوال کے آثار واضح ہونے لگے۔ یوسف زئیوں کا دینی پیشوا ملا چالاک جسے بہاکو خان یوسف زئی نے اپنا پیشوا بنا رکھا تھا، پہلے ہی سے ولایت پکھلی کے ترکوں اور مرکزی حکومت کے

خلاف عوام میں نفرت پیدا کر چکا تھا۔ سید جلال بابا کی مخالفت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ادھر پکھلی خلص میں دیوان راجہ بابا کی بددعا کا چرچا عام ہوا۔ ترکوں کے خلاف عوامی جذبات کی لہریں اٹھنے لگیں اور میدان قبائلیوں کی یلغار کے لئے بالکل تیار ہوگیا۔

قبائلی یلغار:

اورنگ زیب عالمگیر ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا۔ اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے تخت نشینی کی جنگ شروع کر دی۔ اس کا بڑا بیٹا بہادر شاہ دوسرے بھائیوں سے زیادہ قابل تھا اس لئے تخت نشینی کی جنگ میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ تقریباً آٹھ سال تک بہادر شاہ نے کامیاب حکمرانی کی، لیکن اب سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے اسباب نمایاں ہونے لگے تھے اور شاہی خاندان میں کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جو اتنی وسیع سلطنت کے انتظام کو بطریقِ احسن چلانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جن علاقوں سے اورنگ زیب عالمگیر نے تمام بغاوتوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ وہیں سے از سرِ نو بغاوتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں نے اپنی نااہلی کی بنا پر سرحد اور بالخصوص ریاستِ پکھلی کے معاملات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

ریاست پکھلی کے اندرونی حالات نہایت ابتر تھے اور دریائے سندھ کے مغربی علاقے کے قبائل کی پیش قدمی کے لئے بہت سازگار تھے۔ قبل ازیں علاقہ یوسف زئی میں ملا چالاک اور بہاکو خان جہاد کے نام سے اورنگ زیب عالمگیر اور پکھلی کے ترک حکمرانوں کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے۔

اگرچہ شاہی افواج کی مداخلت نے ان کی بغاوت کو فرو کر دیا تھا اور یہ دونوں افراد اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے، لیکن پکھلی کے علاقے میں ملا چالاک کے پروپیگنڈے کی بدولت عوام میں ترکوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ انہی دنوں دیوان راجہ بابا نے بھی گلی باغ کے دارالریاست میں ترکوں کو ایک بددعا دے دی جس کا چرچا دور دراز تک ہوگیا۔ سید جلال بابا سلطان محمود کا داماد ہونے کے سبب ریاست کے تمام حالات سے بخوبی آگاہ تھا۔ مراد خان اور بھائی خان جیسے پرانے دوستوں کے علاوہ پکھلی کے علاقے میں اس کے کئی اور وفادار ساتھی بھی موجود تھے۔ پکھلی سے بھاگتے وقت وہ کافی رقم بھی اپنے ساتھ سوات لے گیا تھا اس لئے

علاقہ سوات میں اس نے آسانی کے ساتھ ایک لشکر تیار کرلیا۔ سید جلال بابا نے چار ہزار افراد کے سواتی لشکر کے ساتھ دریائے سندھ کو عبور کرکے پکھلی سرکار کے قلب پر حملہ کردیا۔ چونکہ یہاں اس کا دیرینہ دوست مراد خان ریاست کے معاملات چلا رہا تھا، اس لئے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ان دونوں کے درمیان مفاہمت کے کتنے امکانات موجود ہو سکتے تھے۔ ۱۷۱۳ء کے لگ بھگ سید جلال بابا کے سواتی لشکر نے بغیر کسی مزاحمت کے قلعہ گلی باغ پر قبضہ کرلیا۔ مراد خان کی ہدایت کے مطابق عاقل خان اور مرید خان حرم کی خواتین کو ہمراہ لے کر کونش کے علاقے میں روپوش ہوگئے۔ گلی باغ کے شہریوں نے سید جلال کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن سوائے رسوائی کے انہیں کچھ نہ ملا۔ لڑائی کے دوران میں گلی باغ کا دو منزلہ شہر جل کر خاکستر ہوگیا۔ گلی باغ کے بعد بیداوی اور دوسرے اہم قصبوں میں بھی لوٹ مچی۔ ترک پریشانی کے عالم میں پہاڑی درّوں میں روپوش ہوگئے۔ سرکار پکھلی میں ترکوں کی کوئی فوج موجود تھی جو ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرتی۔

سواتیوں کے بعد تنولی قوم نے بھی علاقہ مہابن سے نکل کر دریائے سندھ کو عبور کرکے موجودہ تناول کے علاقے پر یلغار شروع کردی۔ رفتہ رفتہ ترکوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے تناولی باشندے موجودہ تناول کے تمام علاقے پر قابض ہوگئے۔ علاقہ تناول کے اہم دیہات کی صورت دیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تازہ دم تنولی اسی زمانے میں علاقہ تناول پر قابض ہوئے جو قدیم تنولی یہاں موجود تھے وہ بھی ان نئے تناولیوں کے ماتحت ہوگئے۔ ترکوں کے پاس بحالی اور اس کے اردگرد کے چند دیہات باقی بچے۔

علاقہ مظفرآباد میں بمبہ قوم کے سلطان قاسم نے ترکوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا اور عوام اس کی قیادت میں ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کوڑمنگ کے آخری ترک حاکم مسمّی کمال خان کو قتل کردیا۔ چونکہ پکھلی خاص پر سید جلال بابا کے سواتی لشکر کا قبضہ مکمل ہوچکا تھا، اس لئے وہاں سے علاقہ مظفرآباد کے ترک حاکم کو کوئی کمک مل نہ سکی اور بمبہ قوم بالاکوٹ سے بھولیاس کی گھاٹی تک کے تمام علاقے پر قابض ہوگئی۔ ترک پہاڑی علاقے میں روپوش ہوگئے یا کشمیر چلے گئے۔

۱۷۱۹-۲۰ء میں دمتوڑ کے دونوں ترک خاندانوں کے مابین ایک نئی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ایک رات دن کی لڑائی میں ترکوں نے جی بھر کر ایک دوسرے کی گردنیں ماریں اور لڑائی کے خاتمہ پر ان کے ان کے کچھ ہی قابل ذکر افراد بچے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جدون کسانوں نے علاقہ گندف

کے جدون باشندوں کو دعوت دی اور انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے دھمتوڑ اور علاقہ درش پر قبضہ کرلیا۔ دھمتوڑ کا قصبہ سلطان مقرب خان کی شورش کے وقت سے ہی تباہ حال تھا، لیکن ترکوں کی اس نئی خانہ جنگی نے اسے بالکل ہی تباہ و برباد کرڈالا۔

تربیلہ کے علاقے سے گزر کر علی زئی اور اتمان زئی قبائل نے میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف آگے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ اس طرح ولایتِ پکھلی کے تمام قابلِ ذکر علاقے ایک ایک کرکے ترکوں کے قبضے سے نکل گئے۔ مرکزی حکومت روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھی، اس لئے وہ اس علاقے میں کوئی مثبت کردار ادا نہ کرسکی اور یہاں قبائلی دور شروع ہوگیا۔ ریاست پکھلی کی وحدت ختم ہوگئی اور مختلف قبائل جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے علاقے پر دست درازیاں کرنے لگے۔ ترکوں کی تقریباً آدھی تعداد کشمیر چلی گئی، کیونکہ وہاں ابھی تک مغل حکمرانی کررہے تھے جو ترک پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق کے علاقے میں باقی رہ گئے، ان میں سے ترکی پٹی مانکرائے والے نسبتاً بہتر حالت میں تھے۔ بعدازیں ترکوں کی تاریخ مانکرائے کے ترکی پٹی ہی کی تاریخ رہ گئی۔ ترکی پٹی مانکرائے کے حالات ایک الگ عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں بیان کئے جارہے ہیں۔ دھمتوڑ پر جدونوں کے قبضے کے تقریباً پندرہ سال بعد یہاں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی زمانے میں سلطان قیاس الدین حاکمِ تناول کی اولاد میں سے اصالت خان نے بحالی کا موضع آباد کرکے اس کے اردگرد کے چند مواضعات پر قبضہ کرلیا اور اس طرح مزید کچھ عرصہ تک کے لئے اس خاندان کے ترک اس علاقے میں باوقار زندگی بسر کرتے رہے۔

مندرجہ بالا واقعات ثابت کرتے ہیں کہ پکھلی سرکار میں ترکوں کے زوال کا آغاز اورنگزیب عالمگیر کے آخری عہدِ حکومت ہی میں شروع ہوگیا تھا اور ۱۷۰۷ء میں اس کی وفات کے ساتھ ہی یہاں خانہ جنگی میں مزید شدت پیدا ہوگئی جس کا آخری نتیجہ قبائلی یلغار اور پھر درانیوں کی آمد کی صورت میں برآمد ہوا۔

اگر برِصغیر ہندوپاکستان میں تیموری ترکوں کی آخری عظیم سلطنت یعنی سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ شمال کی جانب سے اس کے زوال کا عمل پکھلی سرکار ہی سے شروع ہوا تھا۔ سلطنت کے زوال کا یہ عمل تسخیرِ گل باغ کے بعد تقریباً

ایک سو برس تک جاری رہا، تا آنکہ انگریزوں نے آخری تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر کو تخت سے معزول کر کے تیموریوں کی عظمت کا آخری چراغ گل کر دیا۔ بعدازیں دنیا کے نقشے میں صرف ترکانِ عثمانی ہی کی سلطنت باقی رہی جو جدید ترکیہ کی شکل میں ابھی تک قائم ہے ؎

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ،

نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم، ترکانِ تیموری

٭

گکھڑ

گکھڑوں کی اصل:

تاریخ گکھڑاں کا دعویٰ ہے کہ گکھڑ کیگوہر کیانی کی اولاد میں سے ہیں اور وہ زمانہ قبل از اسلام میں اصفہان سے نکل کر سینکڑوں برس تک کابل، کشمیر، پنجاب بلکہ تبت تک کے دور دراز علاقوں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ پھر عرصہ دراز کے بعد انہیں پنجاب سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا گیا جہاں سے وہ دوبارہ سلطان محمود غزنوی کی افواج میں شامل ہو کر پنجاب میں داخل ہوئے۔

سلطان محمود غزنوی نے گکھڑ شاہ کی خدمات سے خوش ہو کر اسے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقے کی جاگیر عطا کر دی۔ تاریخ گکھڑاں میں سلطان محمود غزنوی کا ایک فرمان بھی نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مذکور نے گکھڑ شاہ کو اس علاقے کی جاگیر عنایت کی تھی۔ تاریخ گکھڑاں کی بیشتر معلومات کیگوہر نامہ مصنفہ رائے دونی چند پر مبنی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ تاریخ گکھڑاں کا مصنف اپنے اس دعوے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں پیش کر سکا کہ گکھڑ فی الواقع نسلاً کیانی ہیں اور ان کے جدِ امجد مسمّٰی گکھڑ شاہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ کابل سے پنجاب میں داخل ہوئے تھے، اسی لئے مؤرخین نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زمانۂ قبل از اسلام میں گکھڑوں نے "سینکڑوں" برس تک کابل سے کشمیر تک کے علاقے میں حکمرانی کی ہوتی، تو ان کے حکمرانوں کا نام ضرور تاریخ میں محفوظ ہوتا، لیکن تاریخ گکھڑاں کا مصنف کسی ایک بھی ایسے حکمران کا نام نہیں بتا سکا جس تک اس زمانے میں گکھڑوں کا شجرہ نسب پہنچتا ہو۔ گکھڑوں کے شجرہ نسب میں جو نام درج ہیں، ان میں سے کسی ایک نام کا حکمران بھی اس علاقے میں نہیں گزرا۔ البیرونی، عتبی اور دیگر تمام مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے حملے سے قبل کابل سے کشمیر تک کے تمام درمیانی علاقے پر کابل کی ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ گندھارا کی بدھ اور ہندو سلطنتیں تقریباً چار سو برس سے قائم

رہی تھیں۔ ان سلطنتوں کے حکمران نسلاً تاتاری تھے۔ ایرانی یا کیانی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مؤرخ کو تاریخ گکھڑاں کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کہ زمانۂ قبل از اسلام میں گکھڑ اس علاقے پر سینکڑوں برس تک حکمرانی کر چکے تھے۔

رہا گکھڑ شاہ کے سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ کابل سے یہاں تشریف لانے اور جاگیر حاصل کرنے کا معاملہ تو اس کے حق میں بھی کوئی وزنی دلیل موجود نہیں۔ اس دور کی کسی معتبر تاریخ میں گکھڑ شاہ کے کابل سے یہاں آنے کا ذکر موجود نہیں۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ سلطان محمود غزنوی نے گکھڑ شاہ کو ایک جاگیر عطا کی تھی، تب بھی اس سے نہ تو اس کی کابل سے آمد ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مشرف باسلام ہونا ثابت ہوتا ہے۔ غزنوی افواج میں کابل، سرحد اور پنجاب کے تمام اہم علاقوں کی چیدہ چیدہ اقوام مثلاً افغان، پٹھان، آوان، گکھڑ اور بعض دیگر ہندو سپاہی سبھی شامل تھے۔ مؤرخین نے غزنوی افواج میں ہندو سپاہیوں کی تعداد دس ہزار بیان کی ہے۔ ان ہندوؤں میں سے بعض کو عمدہ خدمات بجا لانے کی وجہ سے جاگیریں بھی عطا کی گئیں۔ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ غزنوی سلطان نے نواسہ شاہ اور تلک نامی ہندو کو ہی پہلے پہل اپنی ہندی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا تھا، حالانکہ نواسہ شاہ اس پال خاندان کا فرد تھا، جو اسلام کا بدترین دشمن تھا اور جسے غزنویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونا پڑا تھا؛ لہٰذا کسی ہندی باشندے کو جاگیر عطا کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ لازماً مسلمان ہی ہوا ہوگا یا وہ ضرور کابل ہی سے غزنوی فوج کے ہمراہ یہاں داخل ہوا ہوگا۔

گکھڑوں کی اصل معلوم کرنے کے سلسلے میں ان کا وہ شجرہ نسب بھی قابلِ غور ہے جسے خود تاریخ گکھڑاں نے بیان کیا ہے۔ تاریخ گکھڑاں کے اس شجرہ نسب میں کابل شاہ کے بعد چند پشتوں تک گکھڑوں کے بزرگوں کے مندرجہ ذیل نام تحریر شدہ ہیں:

کابل شاہ یا قابل شاہ
↓
گکھڑ شاہ
↓
بج شاہ
↓
مہپال ← سیوگی
↓
موہم
↓

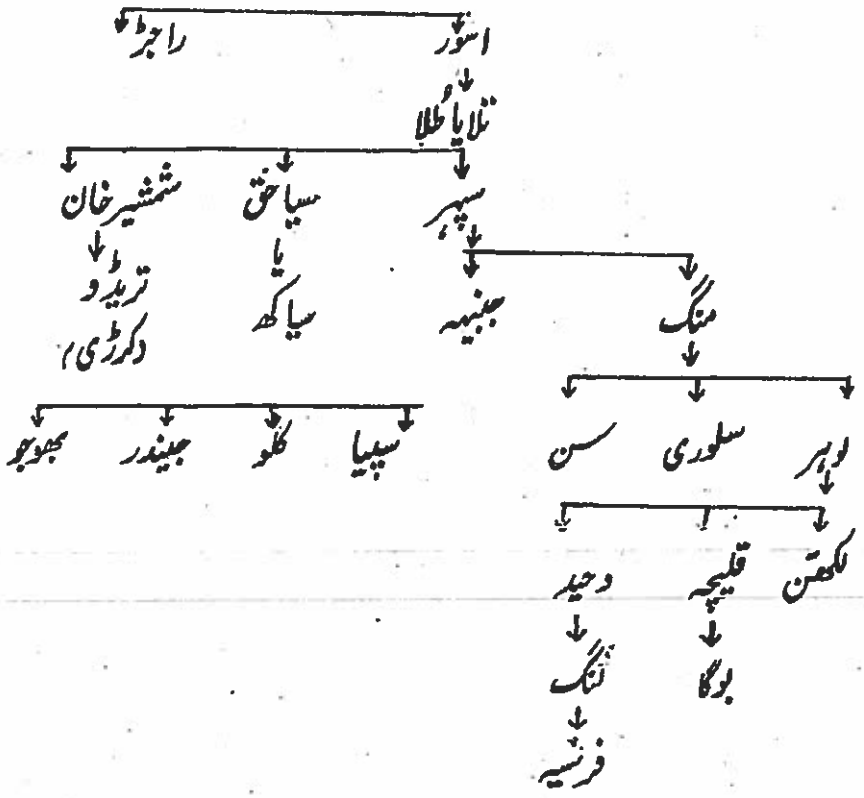

ان ناموں پر غور کرنے سے صاف نظر آرہا ہے کہ تمام ابتدائی نام ہندی الاصل زبانوں کے ہیں۔ ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کے عنوانات کے تحت تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ غزنوی حملوں سے قبل موجودہ افغانستان، موجود صوبہ سرحد اور سلطنت ٹیکسلا کے علاقے تا بحدِ کشمیر تک مسلسل چار سو برس تک ان بدھ حکمرانوں کی حکومت قائم رہی تھی۔ کابل، ہنڈ اور صوابی کی تحصیل میں لاہور کے مقامات ان حکمرانوں کے دارالحکومت رہ چکے تھے۔ کابل کے ان ترکی النسل بدھ حکمرانوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نسلاً کشن خاندان کے مشہور حکمران مہاراجہ کنشک سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں کشن خاندان کے حکمرانوں کو کشن شاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور ان کے آخری دور میں کابل کے حکمرانوں کا لقب قابل شاہ پڑ گیا تھا۔ ۸۷۰ء میں ساسانی جرنیل یعقوب ابن لیث نے قابل شاہ ہی کو شکست دی تھی۔ قابل شاہوں کی حکمرانی کے بارے میں عتبی اور البیرونی کے علاوہ تاریخ سیستان مطبوعہ ۱۹۳۰ء طہران کا مطالعہ نہایت سودمند ہے۔ ترکی شاہیہ کابل کا آخری حکمران لگاتر من تھا جسے اس کے وزیر کلر شاہ نے دھوکے سے قید کر کے تختِ کابل پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان قابل شاہوں کے علاوہ افغانستان کے علاقے میں کسی اور ایسی تاریخی شخصیت کا نام نہیں ملتا جس کا نام قابل شاہ ہو۔

اگر گیگو ہر نامہ اور تاریخ گکھڑاں کا مندرجہ بالا شجرہ نسب کابل کے اسی قابل شاہ تک پہنچتا ہو تو اس

نقشہ مانگلی

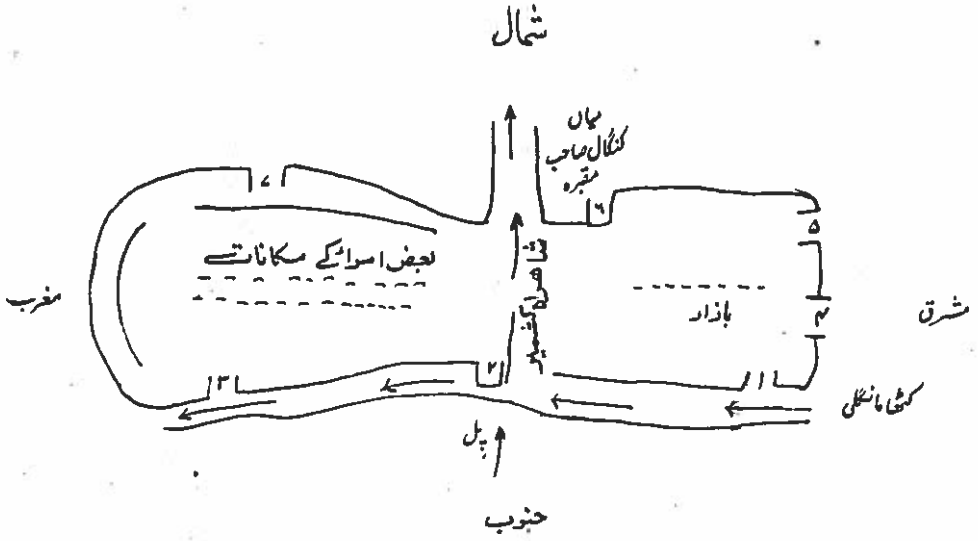
شمال
میاں
کنگال صاحب
مقبرہ
بعض اسوائکے مکانات
بازار
مغرب
مشرق
کٹھا مانگلی
پل
جنوب
۱
۲
۳
۴
۵
۶
۷

اس سے گکھڑ ایرانی النسل نہیں، بلکہ ترکی النسل ثابت ہوں گے اور اس سے الفنسٹن اور کننگھم کے اس بیان کی تائید بھی ہو جائے گی کہ گکھڑ ترکی النسل ہیں۔ ان کا سینکڑوں برس تک حکمرانی کرنے کا دعویٰ بھی قابل فہم ہو سکتا ہے۔ شاہ اور خان کے القابات غزنوی دور سے قبل بھی [illegible] علاقے میں رائج تھے [illegible] نام کے ساتھ ان القابات کو دیکھ کر یہ مغالطہ نہیں [illegible] کہ اس [illegible] ناموں والے افراد مسلمان ہی ہوتے ہوں گے۔

ترکی زبان کے مخصوص لب و لہجہ کی روشنی میں اس زمانے کی اقوام پاکستان کے ناموں پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ محض گکھڑ نام کی وجہ سے اکثر مؤرخین کو گکھڑوں کی اصل معلوم کرنے میں سخت مغالطہ ہوا ہے۔ غزنوی دور میں اور اس کے بعد مسلسل کئی صدیوں تک کھٹڑ، کاکڑ، کھوکھر، گوجر اور گکھڑ اقوام ایک ہی علاقے میں سکونت پذیر رہیں۔ ترک کھٹڑ کو گت کاکڑ کو ککر، گوجر کو کجور اور گکھڑ کو کھکر پکارتے تھے میاں فرشتہ سے لے کر سرکار تک اکثر مؤرخین گکھڑ کو کھوکھر ہی سمجھتے رہے۔ اسی مغالطے کی بنا پر گکھڑوں کو کیدراج کی اولاد قرار دیا گیا۔ انہیں جے پال کا حواری اور سلطان محمود غزنوی کا مدِ مقابل بھی قرار دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ گکھڑوں ہی کو سلطان محمد غوری کا قاتل بھی ٹھہرایا گیا۔ کشمیر کے علاقے میں اسی لفظ گکھڑ کو کشمیری زبان کے مخصوص لب و لہجہ میں ککڑ و پکارا جاتا ہے۔ جب تک کسی لفظ کے اصل مادہ اور مختلف علاقوں میں اس کے استعمال کو مدِ نظر نہ رکھا جائے، اس کی حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ گکھڑوں کے ہندوانہ ناموں کو دلیل ٹھہراتے ہوئے فرشتہ، ابن بطوطہ اور اکثر انگریز مصنفین نے انہیں ہندی الاصل قوم قرار دیا ہے۔ ایبٹسن گکھڑوں کے اس دعویٰ کو مسترد کرتا ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ یہاں آئے تھے لیفٹیننٹ کرنل وائٹکلی ایبٹسن کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:[1]

"Several tribes notably the Gakhars and Awans claim to have come with Mehmud Ghaznawi though it is difficult to reconcile their statements with the historical record of the time".

---

[1] دی پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل وائٹکلی II ایڈیشن صفحہ ۷

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گکھڑوں نے کاغذاتِ مال میں ہمیشہ اپنی قوم گکھڑ ہی درج کرائی ہے اور مغل دور کے تمام تاریخی ریکارڈ میں بھی انہیں گکھڑ یا کھکر ہی لکھا جاتا رہا ہے۔ گکھڑوں کے بعض بزرگ ہزاری منصب داروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی ہوتے رہے ہیں اور توزکِ بابری سے عالمگیر نامہ تک کی تمام معتبر کتبِ تاریخ میں ان کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے، لیکن کسی کتاب میں بھی انہیں کیانی یا ایرانی نہیں بلکہ ہمیشہ گکھڑ یا کھکر ہی لکھا گیا ہے۔ اگر ہم ابن خلدون کے نظریۂ چار پشت فیصدی کے حساب سے گکھڑوں کے شجرۂ نسب کا جائزہ لیں، تو اندازے کے مطابق گکھڑ شاہ کو سلطان محمود غزنوی کے دور میں زندہ موجود ہونا چاہیئے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی قوم کو ہندی الاصل قرار دینے کے معنی صرف اتنے ہیں کہ وہ قوم سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملوں سے قبل یہاں آباد تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نسلی طور پر بھی وہ قوم زمانۂ قدیم سے ہندی ہی تھی۔ گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے واضح ہو چکا ہوگا کہ ترک مسلمانوں کی آمد سے قبل افغانستان اور پاکستان کے شمال مشرقی حصے پر صدیوں سے ترکی النسل اقوام حکمرانی کر رہی تھیں۔ انہی اقوام میں سے ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کی مشہور سلطنتیں بھی تھیں۔ سلطان محمود غزنوی اور راجہ جے پال اور آنند پال کے درمیان نسلی اختلاف کچھ زیادہ نہ تھا، بلکہ اصل اختلاف دین و مذہب کا تھا۔ تورانی ترک اس زمانے یعنی دسویں صدی تک مشرف باسلام ہو کر اسلام کی سربلندی کے لئے سربکف ہو چکے تھے، لیکن ہندو شاہیہ کے حکمران بدستور اپنے قدیم ہندی مذاہب سے چمٹے ہوئے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کننگھم اور الفنسٹن گکھڑوں کو ترکی النسل باشندے قرار دیتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ایرانی قوم بھی زمانۂ قبل از اسلام ۵۳۳ ق م سے ۵۵۰ ق م تک اور پھر ۳۶۵ء سے ۴۵۵ء تک وادیٔ پشاور اور ٹیکسلا پر حکمرانی کر چکی تھی اور ان ایرانی النسل باشندوں کی اولادیں بھی یقیناً یہاں پائی جاتی ہوں گی، مگر ان دونوں یا تینوں امکانات کی موجودگی میں بھی ہم وثوق کے ساتھ گکھڑوں کی اصل کا کھوج نہیں لگا سکتے۔ جو بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ گکھڑ شاہ غزنوی دور میں موجود تھا اور اسی کے نام سے یہ قوم گکھڑ مشہور ہوئی۔ گکھڑ شاہ کے بعد یہ قوم صدیوں تک علاقہ گکھڑ یعنی مارگلہ اور پوٹھوہار کے علاقے میں آباد رہی۔ ترک حملہ آور صدیوں تک صوبۂ سرحد کے دروں سے گزر کر پنجاب اور دہلی کے دور دراز علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہے اور

علاقہ گکھڑ ہمیشہ سے ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس راستے کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ گکھڑ ان بیرونی حملہ آوروں کے ماتحت اور فرماں بردار رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد ترک حملہ آوروں نے ہمیشہ گکھڑوں کو اپنی افواج میں بھرتی کیا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے سے پہلے کا تاریخی ریکارڈ زیادہ تفصیل سے موجود نہیں، لیکن اس زمانے کے تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ گکھڑ ہمیشہ ترکوں کے وفادار رہے اور سلطنت کے استحکام کے لئے انہوں نے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ رفتہ رفتہ گکھڑ شاہ کی اولاد علاقہ گکھڑ میں پھلتی پھولتی رہی اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے زمانے تک ان کے کئی قبیلے اور خانوادے وجود میں آگئے۔ گکھڑوں کے تمام قبائل کے نام ان کے بزرگوں کے ناموں سے مشہور ہوئے اور وہ ابھی تک میدانِ ہزارہ سے لے کر جہلم تک کے وسیع علاقے آباد ہیں۔ گکھڑوں کے ان قبائل کے ناموں سے ان کی اصل پر مزید روشنی پڑتی ہے، اس لئے آئندہ صفحہ پر ان کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ ان ناموں کے مطالعہ سے ان کے ہندی الاصل ہونے کے تصور کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

فہرست خانوادہائے گکھڑاں

نمبر شمار	نام خانوادہ	نام مورث اعلیٰ	مواضعات جن میں آباد ہیں
۱	سوگیال	سیوگی	سوگیاں۔ جگی نڑالی۔ بڑالہ (پنڈی)
۲	طلیال	طلا	آڑہ خورد، بڈ ہار۔ پنڈ اجوال۔ سنہوٹ (جہلم) عبداللہ (میرپور)
۳	سکھال	سیاحق یا سیاکھ	سیاکھ۔ پنیامہ۔ پنڈ خیری (میرپور)
۴	چندال	چند	چھتروہ۔ پبل۔ چانہ اُناہ
۵	بنجال	چند	کٹھاڑ۔ جگیوٹ (چومکھ) تحصیل میرپور
۶	کل چندرال	کل چند (کرڑی)	چھترو۔ بہنگام۔ اندرہل۔ تحصیل میرپور
۷	تریڈوال	تریڈو	کوڑی
۸	جنبہال	جنبہہ	سملوٹھ (اندرہل)
۹	سونال	سُن	سنہوٹ (جہلم) و پوٹھوہار
۱۰	نونیال	سُن	" " "
۱۱	سلوری	سلوری	فاتح پہاڑ کشمیر
۱۲	لالوال	لالو سپزدم سلوری	چوتی پہاڑ کہہ
۱۳	بوگیال	بوگا یا بگھا	علاقہ رہتاس
۱۴	فرسیال	فرسیہ	علاقہ پوٹھوہار۔ بسندوٹ۔ علاقہ میرپور
۱۵	کیسوال	کیاس خان	تپہ پبی، وحویلی کیسوال۔ چوہان۔ پٹا نگڑی، ہرتوع۔ شاپور
۱۶	اسکندرال	سکندر خان	تپہ اسکندرالہ۔ لڑی۔ پڑڑی۔ کھریوٹ۔ بکڑالہ۔ ملایو۔ بڑال

نمبر شمار	نام خانوادہ	نام مورث اعلیٰ	مواضعات جن میں آباد ہیں
۱۷	بوگیال	بوگا ثانی	علاقہ راولپنڈی
۱۸	فیروزال	ملک فیروز خان	علاقہ سکھو راولپنڈی
۱۹	ہتھیال	ہاتھی خان	علاقہ پوٹھوہار (پلاکھر وغیرہ)
۲۰	سرنگال	سلطان سارنگ خان	پنڈی۔ خانپور۔ سید پور۔ ملک پور، فتح پور
۲۱	آدمال	سلطان آدم خان	پھروالہ۔ وانگلی۔ سلطان پور۔ میر پور
۲۲	کونیال	ملک کنہیا	کروڑ۔ پہاڑ
۲۳	پہاڑیال	کنہیا	وانگلی
۲۴	احمدال	ملک احمد	پوٹھوہار
۲۵	جسترال	جستر	دودوچھ (راولپنڈی)
۲۶	سدال یا سدھال	سدو خان یا سدھو	پونچھ تحصیل باغ
۲۷	بھجوال	بھوجو یا بھوج	بھجوال۔ پنیام۔ انکر۔ سنوٹ۔ تھلہ

بدایونی اور فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں گکھڑوں کا مشہور سردار کل چند تھا۔ انگریز مصنفین کے علاوہ قدیم مسلمان مورخین میں سے فرشتہ، ابن بطوطہ اور بدایونی نے بھی گکھڑوں کو ہندی الاصل قوم قرار دیا ہے اور تاریخ جہلم مطبوعہ ۱۸۸۰ء نے بھی مسلمان اور انگریز مصنفین کی تائید کرتے ہوئے ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا زمانہ محمد غوری کے عہد ہی کو قرار دیا ہے۔

گکھڑوں کے مختلف خانوادوں کی مندرجہ بالا فہرست اور ان کے شجرۂ نسب سے دو باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے بزرگوں کی اکثریت کے نام فارسی، ترکی یا عربی زبانوں کے نہیں بلکہ سندی زبانوں کے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے ناموں کے ساتھ فارسی یا ترکی الفاظ کا اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی اکثریت اب تک علاقہ گکھڑ یعنی جہلم سے خان پور تک کے علاقے میں آباد ہے۔ مؤرخین کی اکثریت کا بیان یہ ہے کہ غزنوی دور اور اس سے قبل گکھڑ، بخارا اور سمرقند کے ترکوں کی طرح بدھ

تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کا سن ۱۲۰۵ء بیان کیا جاتا ہے۔

ظہیر الدین بابر کے حملے کے بعد گکھڑوں کی تاریخ کا مستند مواد میسر ہوتا ہے۔ توزکِ بابری میں بابر گکھڑوں کو کھکر لکھتا ہے اور علاقہ گکھڑ ہی کو ان کا مسکن بیان کرتا ہے۔ وہ ہاتی کھکر (ہاتھی گکھڑ) کو اس کے مظالم کی وجہ سے سزا دینے کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ یہی ہاتھی خان ہتھیال گکھڑوں کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں ان کے علاقے کی جاگیریں زیادہ تر انہی کے مختلف خانوادوں میں تقسیم ہوتی رہیں۔ سلطان آدم خان، سلطان سارنگ خان اور بوگا خان کی اولاد کو منصب داریوں کے عہد سے نسبتاً زیادہ ملے۔ ان کا تاریخی اور اونچا گھرانا پھروالہ کے آدمال چیف کا ہے۔ گکھڑ ہمیشہ سلطنتِ مغلیہ کے وفادار رہے۔ ملخ سے پانی پت تک کوئی ایسا محاذِ جنگ نہ تھا جس میں انہوں نے حصہ نہ لیا ہو، مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی تاریخ کا اکثر حصہ علاقہ گکھڑ سے متعلق ہے، اس لئے وہ ہمارے مرکزی موضوع سے خارج رہ جاتا ہے۔

ہزارہ قارلق میں گکھڑوں کی آبادکاری:

ہزارہ گزیٹیئر ۱۸۸۳-۸۴ء[1] کا بیان یہ ہے کہ سولہویں صدی کے اختتام پر پہلے پہل دیوان فتح خان گکھڑ کو اس کے باپ سید خان نے موضع سید پور (علاقہ راولپنڈی) سے تحصیل ہری پور کے مشہور قصبہ خان پور میں آباد کیا۔ سید خان سلطان سارنگ کا بیٹا تھا، اس لئے گکھڑوں کا یہ قبیلہ سرنگال مشہور ہوا۔ توزکِ جہانگیری میں جہانگیر صاف صاف لکھتا ہے کہ گکھڑوں کے علاقے کی مدمار گلہ پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ جہانگیر کا عہدِ حکومت ۱۶۰۵-۲۷ء کے درمیانی عرصے پر مشتمل ہے۔ جہانگیر کے بیان کی روشنی میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مارگلہ ہی علاقہ گکھڑ کی آخری حد تھا۔ گکھڑوں کی ہزارہ قارلق میں آمد کے سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ سلطان سارنگ ۱۵۴۷ء میں سلیم شاہ سوری سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا، لہٰذا دیوان فتح خان کو اس کے دو پشت بعد میں زندہ موجود ہونا چاہیئے۔ اس طرح دیوان فتح محمد خان کو سولہویں صدی کے اختتام پر نہیں بلکہ سترھویں صدی کی ابتدا یعنی عہدِ جہانگیری میں موجود ہونا چاہیئے۔ بہر حال توزکِ جہانگیری کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علاقہ خان پور علاقہ گکھڑ کا حصہ نہ تھا۔ گکھڑوں اور ان کے علاقے

---

[1] ہزارہ گزیٹیئر ۱۸۸۳-۸۴ء، صفحہ ۹۹

کے بارے میں توزکِ جہانگیری میں یہ الفاظ موجود ہیں :

"دریں منزل کوتلے است مارگلہ نام بہ لفظ مارزدن راو کلہ قافلہ رامی گویند یعنی محلِ زدنِ قافلہ۔ حدِ ولایت گکھڑاں تا ایں جا است، عجب حیوان صفت جماعتے اند دائم بایک دگر درمقامِ منازعت و مجادلہ اند، بہر چند خواستم رفعِ ایں نزاع بشود اما کارگر نشد۔ جانِ جاہلِ بسختی ارزانی"

جہانگیر کے بعد شاہجہان اور اورنگ زیب کے ادوار گزرے، لیکن ان میں بھی خانپور کے سرنگال گکھڑوں کا کوئی سیاسی کردار سامنے نہ آسکا۔ ۱۶۷۴-۷۵ء میں جب اورنگ زیب عالمگیر سرحدی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے حسن ابدال تشریف فرما ہوا تو اسی زمانے میں میدان ہزارہ قارلق کی وہ تقسیم عمل میں آئی جس کا ذکر تاریخ ہزارہ اور ہزارہ گزیٹیر میں موجود ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے اس میدان کو چار پٹیوں میں تقسیم کیا گیا جن کے نام یہ رکھے گئے۔ پٹی گوجری دولتا چودھری، پٹی تورکی مانکرائے، پٹی دلازاک سرائے صالح اور پٹی ترینی درویش۔ ان چار پٹیوں کے علاوہ میدانِ ہزارہ قارلق کی کوئی اور پٹی نہ تھی، لہٰذا اس تقسیم سے ثابت ہوتا ہے کہ گکھڑ عہدِ عالمگیری تک میدانِ ہزارہ قارلق کے کسی حصے میں نہیں ہوتے تھے۔

سترھویں صدی کے اختتام کے قریب یعنی عہدِ عالمگیری میں گکھڑوں کو پکھلی سرکار کی حدود میں اثر انداز ہونے کا ایک موقع ملا۔ واقعہ یہ ہوا کہ سلطان محمود والی پکھلی اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوا اور ملاقات کے بعد وہ سرحدی علاقے میں باغیوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس کی عدم موجودگی میں ریاست کے معاملات کی باگ دوڑ اس کے معتمد خاص مراد خان کے ہاتھ میں رہی جو گڑھی حبیب اللہ کے خوانین کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ، سلطان قیاس الدین حاکم تناول اور کمال خان کوڑمنگ (مظفر آباد) مراد خان سے حسد کرتے تھے۔ جب کافی عرصہ تک سلطان محمود واپس نہ لوٹا اور نہ ہی اس کی شہادت کے بارے میں جب کوئی اطلاع موصول ہوئی تو پکھلی سرکار میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پکھلی سرکار کے سلاطین زادے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ کافی عرصہ کی کشمکش کے بعد سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ جو سلطان محمود والی پکھلی کا بھائی تھا۔ دھمتوڑ سے آگے بڑھ کر مانسہرہ اور پھر وہاں سے پکھلی

خاص میں داخل ہوگیا۔ سلطان مقرب خان ایک سخت گیر انسان تھا۔ اس نے نہ صرف عام لوگوں بلکہ اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو بھی اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع ہوگیا؛ چنانچہ پکھلی سرکار کے دوسرے سلاطین زادوں نے سلطان مقرب خان کے مظالم کے خلاف ایک شکایت اورنگ زیب عالمگیر کے پاس بھیجی۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا آخری دور تھا۔ اورنگ زیب نے سلطان مقرب خان کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مبارذالدین خان کو متعین کیا۔ مبارذالدین خان شاہی افواج میں منصبدار تھا اور کابل اور سرحد کے علاقے میں فوجی خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ شاہی فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے مبارذالدین خان پکھلی سرکار کے علاقے میں داخل ہوا۔ سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ شاہی فوج کے مقابلے کے لئے تیار ہوگیا۔ پکھلی سرکار کے دوسرے سلاطین زادے شاہی فوج سے تعاون کرنے کے لئے جمع ہوگئے۔ سخت لڑائی کے سلطان مقرب خان کو شکست ہوئی۔ دھمتوڑ کا قصبہ اور قلعہ اس لڑائی میں تباہ و برباد ہوگیا۔ مبارذالدین خان نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور اس کے بعد واپس روانہ ہوگیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے خوش ہوکر مبارذالدین خان گکھڑ کو اصالت خان کا منصب اور پرگنہ وانگلی بدل کر جاگیر میں دے دیا۔ مبارذالدین خان آدمال گکھڑ تھا اور پرگنہ فتحپور باہری (راولپنڈی) پہلے ہی سے آدمالوں کی جاگیر تھا۔ وانگلی بھی علاقہ گکھڑ کا اہم مقام تھا۔ مبارذالدین خان گکھڑ اگرچہ فوجی کارروائی کے بعد واپس چلا گیا اور اسے سرحدی علاقے میں ہی متعین کردیا گیا، لیکن اس کارروائی سے علاقہ دھمتوڑ میں گکھڑوں کے وقار میں اضافہ ہوگیا۔ گکھڑ راولپنڈی سے آگے بڑھ کر لورہ، ناڑہ، بلکہ رجوعیہ تک کے وسیع علاقے پر قابض ہوگئے اور اس علاقے کی ڈھونڈ، کرڑال اور گوجر اقوام کو ان کی ماتحتی قبول کرنا پڑی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد ہی میں اس علاقے میں شاہ عبداللطیف نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان سرگرمیوں کی بدولت اس علاقے کے باشندے جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہوکر روبہ زوال ہو رہی تھی؛ اس لئے کسی بادشاہ نے اس علاقے کی طرف نہیں دی جس کے نتیجے میں زبردست لوگ زیردست لوگوں کے حقوق غصب کرنے لگے اور ہر طرف بدامنی کی فضا پیدا ہوگئی۔

اورنگ زیب عالمگیر ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا اور ۱۷۲۹ء سے درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ درانیوں کے ابتدائی حملوں کے بعد درحقیقت یہاں کوئی مرکزی نظام حکومت باقی نہ رہا تھا اور جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں میں من مانی کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ درانیوں کی مہم میں چونکہ نوازش علی خان گکھڑ نے عمدہ خدمات سرانجام دی تھیں، اس لئے ابدالی حکمران نے راولپنڈی کا علاقہ گکھڑوں ہی کی جاگیر میں رہنے دیا تھا۔

درانیوں کے زوال کے بعد جب سکھوں کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا تو گکھڑوں کو بے انتہا مصائب جھیلنے پڑے۔ ترکوں کے زوال کے زمانے میں جس طرح پکھلی سرکار کی مختلف اقوام ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، اسی طرح ڈھونڈ اور کرڑال اقوام نے گکھڑوں سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کردی تھی۔ سب سے پہلے کرڑالوں کے ایک سردار مسمی مورچہ قلی خان ساکن ناڑہ نے باغیانہ روش اختیار کی۔ واقعہ یہ ہوا کہ معاملہ زمین ادا نہ کرنے پر گکھڑ راجہ نے مورچہ قلی خان کو قید کرکے اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا۔ رہائی پانے کے بعد مورچہ قلی خان نے گکھڑ راجہ کو قتل کرادیا۔ اس واقعہ کے بعد بغاوت کا رجحان زور پکڑ گیا۔ ڈھونڈ اور کرڑال اقوام نے گکھڑوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کا آغاز کردیا۔ بالآخر ورہ کے قریب ڈھونڈ اور کرڑال اقوام نے مل کر گکھڑوں کے خلاف آخری لڑائی لڑی جس میں راجہ علی بہادر زخمی ہوا۔ بعدازاں راجہ تالی خان گکھڑ نے دوبارہ باغیوں کے خلاف چڑھائی کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس طرح ڈھونڈ اور کرڑال اقوام گکھڑوں کے تسلط سے آزاد ہوگئیں۔

دوسری طرف اسی زمانے میں گکھڑوں پر سکھوں کا دباؤ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ۱۱۸۷ھ میں سردار ملکھا سنگھ نے گکھڑوں کے مرکزی علاقہ پوٹھوہار پر قبضہ کرلیا۔ ملکھا سنگھ نے گکھڑوں سے ان کا مرکزی مقام سیدپور بھی چھین لیا۔ اس طرح سکھوں کے دباؤ سے مجبور ہوکر نجف خان گکھڑ سیدپور سے خان پور منتقل ہوگیا۔ اب خان پور گکھڑوں کا مرکزی مقام بن گیا اور یہیں سے اٹھ کر گکھڑ ڈھونڈ اور کرڑال اقوام کے خلاف لڑائی بھڑائی کرتے رہے۔

سکھوں اور انگریزوں کے زمانے میں گکھڑوں کا سیاسی کردار اور ان کے تفصیلی حالات انشاءاللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے جائیں گے۔

٭

سیّد جلال بابا

سلطان محمود والیٔ پکھلی کے عہد میں دو شخصیتوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک تو موجودہ کاغانی سیّدوں کے مورثِ اعلیٰ سیّد جلال بابا تھے اور دوسرا گڑھی حبیب اللہ کے خوانین کا مورث اعلیٰ مراد خان تھا۔ سیّد جلال بابا چونکہ حضرت سیّد علی ترمذی المعروف پیر بابا صاحب کی اولاد میں سے تھا، اس لئے نہ صرف علاقہ سوات و باجوڑ بلکہ پکھلی سرکار میں بھی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اخوند درویزہ کے بیان کے مطابق سیّد علی ترمذی کا نسبی تعلق امیر تیمور کے بھانجوں سے تھا۔ آپ کے والد سیّد قنبر علی شاہ کو دربارِ ہمایونی میں باوقار مقام حاصل تھا اور انہیں نظیر بہادر کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ سیّد علی ترمذی نے سندھ کے مغربی کنارے کے پختون علاقہ سے پیر روشنائی کی تحریکِ الحاد کا خاتمہ کر کے صحیح اسلامی عقائد کی اشاعت کی اور شرعی قوانین کا نفاذ کرایا تھا، اس لئے اہلِ اسلام ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا احترام کرتے تھے۔ اس علاقے میں حضرت سیّد علی المعروف پیر بابا صاحب کے ساتھ عوام کی عقیدت مندی کا یہ عالم ہے کہ آج تک ہزارہ سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد ہر سال ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

حادثاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر سیّد جلال بابا اور مراد خان سوات کے علاقے سے نکلے اور پکھلی کے راستے کشمیر جاتے ہوئے گلی باغ کے صدر مقام میں ٹھہرے۔ مراد خان کے ہمراہ اس کا ایک بھائی مستی بھائی خان بھی تھا۔ جب سلطان محمود والیٔ پکھلی کو ان معزز افراد کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے ان سب کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ جب ان حضرات نے اپنی بے کسی اور پریشان حالی کی داستان بیان کی اور اپنا حسب نسب بیان کیا تو سلطان محمود کو ان کی حالتِ زار پر رحم آیا اور انہیں اس نے اپنے پاس

رکھ لیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سلطان محمود نے سید جلال بابا کے ساتھ اپنی بیٹی کا عقد کر دیا اور مراد خان کو اپنا معتمد خاص بنا لیا۔ سلطان محمود نے اپنی بیٹی کے جہیز میں درّہ بھوگڑمنگ دے دیا۔ سید جلال بابا کو اس طرح پکھلی میں باوقار مقام حاصل ہو گیا۔ اس نے مسمّی بھائی خان برادر مراد خان کو اپنا معتمد بنا لیا، اس طرح یہ حضرات پکھلی میں باوقار زندگی بسر کرنے لگے۔ سلطان محمود کے ترک افسر اس کی اس عنایتِ خسروانہ سے ناراض تھے، لیکن بامرِ مجبوری انہیں سلطان کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ سید جلال بابا چونکہ اب سلطان محمود کا معتمد خاص اور داماد بھی تھا، اس لئے اسے دُرونِ حرم کے حالات تک سے بھی اسے آگاہی حاصل ہو گئی۔ سید جلال بابا کے عزائم اتنے بلند ہو گئے کہ اس نے ترک افسروں کی پروا نہ کرتے ہوئے سلطان محمود کو اپنی مرضی پر چلانا شروع کر دیا، لیکن سید جلال بابا زیادہ عرصہ تک اپنے خفیہ عزائم کو نہ چھپا سکا اور سلطان محمود کو اس کے منصوبوں سے آگاہی حاصل ہو گئی۔ سلطان محمود سید جلال بابا کی باغیانہ روش سے اتنا برہم ہوا کہ اس نے اپنی خفیہ پولیس کو حکم دیا کہ وہ سید جلال بابا کو قتل کر دے۔ خفیہ پولیس کے آدمی رات کی تاریکی میں سید جلال بابا کے گھر گھس کر اس پر حملہ آور ہوئے، مگر وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا اور بھاگتے وقت اپنے ساتھ کافی نقدی بھی لے گیا۔ سید جلال بابا سیدھا سوات چلا گیا اور اس روپیہ کے زور سے جو بھاگتے وقت وہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ نیا منصوبہ بنانے لگا۔ مراد خان اور بھائی خان بدستور یہیں موجود رہے اور سلطان محمود پہلے کی طرح ان پر مہربان رہا۔

تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ولیس میں اس واقعہ کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ موجود ہیں:

"چوتھی پشت پیر بابا کے سید جلال بابا ملک بنیر سے مع مراد خان عرب کشمیر کو جاتے ہوئے اس جگہ گلی باغ ریاست کے جگہ دیکھ کر مقیم ہو گئے۔ سلطان محمود ترک اس ملک کا فرماں روا تھا؛ چونکہ دونوں خاندانی اور صاحبِ عزت تھے۔ چندے سید جلال بابا کو بزرگ اور اچھا جان کر سلطان محمود نے اپنی دختر سے عقد کر کے درّہ بھوگڑمنگ جہیز میں دے کر اسی جگہ آباد کر دیا۔ سید جلال بابا کا بسبب قرابت سلطان کے اندر و باہر میں دخل ہو گیا اور سب طرح سے فخر لے گیا۔ جب زور اس کا دن بدن زیادہ ہونے لگا۔ سلطان کو یہ امر ناگوار ہوا۔ اس کے مارنے کی فکر میں ہوا اور خفیہ دزدان کو اس کے

پیچھے چھوڑا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بمقام ڈگ علاقہ بھوگڑ منگ سید جلال بابا کو پہنچ کر زخمی کیا۔ سید جلال بابا بوقوع اس حال کے ملک بلنیر اپنے زادبوم میں چلا گیا۔ ملک صواتھ (سوات) سے لوگ سید جلال بابا کی بزرگی اور کرامت اور خاندان کے معتقد تھے۔ ان سے مشورہ کرکے لشکر صواتھ کو اپنے ہمراہ لیا اور سلطان پر چڑھائی کردی۔ اس موقع میں سلطان بذاتِ خود بادشاہِ دہلی کے پاس حاضر تھا۔ صواتھی نے بموجب رہنمائی سید جلال داماد سلطان کے اس ملک پر قبضہ دار ثانہ کرلیا۔"[1]

تاریخ ہزارہ کے مندرجہ بالا اقتباس سے اصل صورتِ حال پر کافی روشنی پڑتی ہے، لیکن مصنف سے اتنی فروگزاشت ضرور ہوئی ہے کہ سید جلال بابا کے زخمی ہوکر بلنیر بھاگ جانے اور پھر وہاں سے ایک لشکر تیار کرکے واپس چڑھائی کرنے کے درمیانی عرصہ کے حالات کو نظرانداز کردیا ہے جیسا کہ ترکوں کی خانہ جنگی کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سرحدی قبائل نے تمام سرحدی علاقے میں شورش اور ہنگامہ بپا کر رکھا تھا اور نہ صرف تجارتی قافلے بلکہ شاہی افواج تک کا شاہراہِ کابل سے گزرنا محال ہو چکا تھا۔ انہی حالات پر غور و فکر کرنے کے لئے سلطان محمود اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں دہلی روانہ ہوا تھا۔ دہلی جانے سے قبل اور اس کے بعد سلطان محمود دوسرے منصب داروں کے ہمراہ ان سرحدی شورشوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں پکھلی سرکار میں ترکوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس خانہ جنگی میں اگرچہ سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ کافی حد تک کامیاب رہا، لیکن بقیہ سلطان زادوں کی شکایت پر اورنگزیب بادشاہ نے مبارزالدین خان گکھڑ کی سربراہی میں ایک فوج بھیج کر سلطان مقرب خان کی شورش کو دبا دیا۔ مبارزالدین خان کی واپسی کے بعد حالات اور بھی ابتر ہوگئے۔ یہاں کے سلاطین زادے کسی ایک کی حکمرانی پر متفق نہ ہوسکے اور اس طرح پکھلی سرکار بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ علاقہ دھمتوڑ میں سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ علاقہ تناول میں سلطان قیاس الدین برادر سلطان محمود اپنی من مانی کرنے لگا اور علاقہ مظفرآباد میں کمال خان خودسر ہوگیا۔ گلی باغ میں سلطان محمود کے دو چھوٹے بیٹے مرید خان

---

[1] تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ولیس ۱۸۷۲ء صفحہ ۱۰۲۲

شجرۂ نسب ترکانِ موضع مانکرائے !!

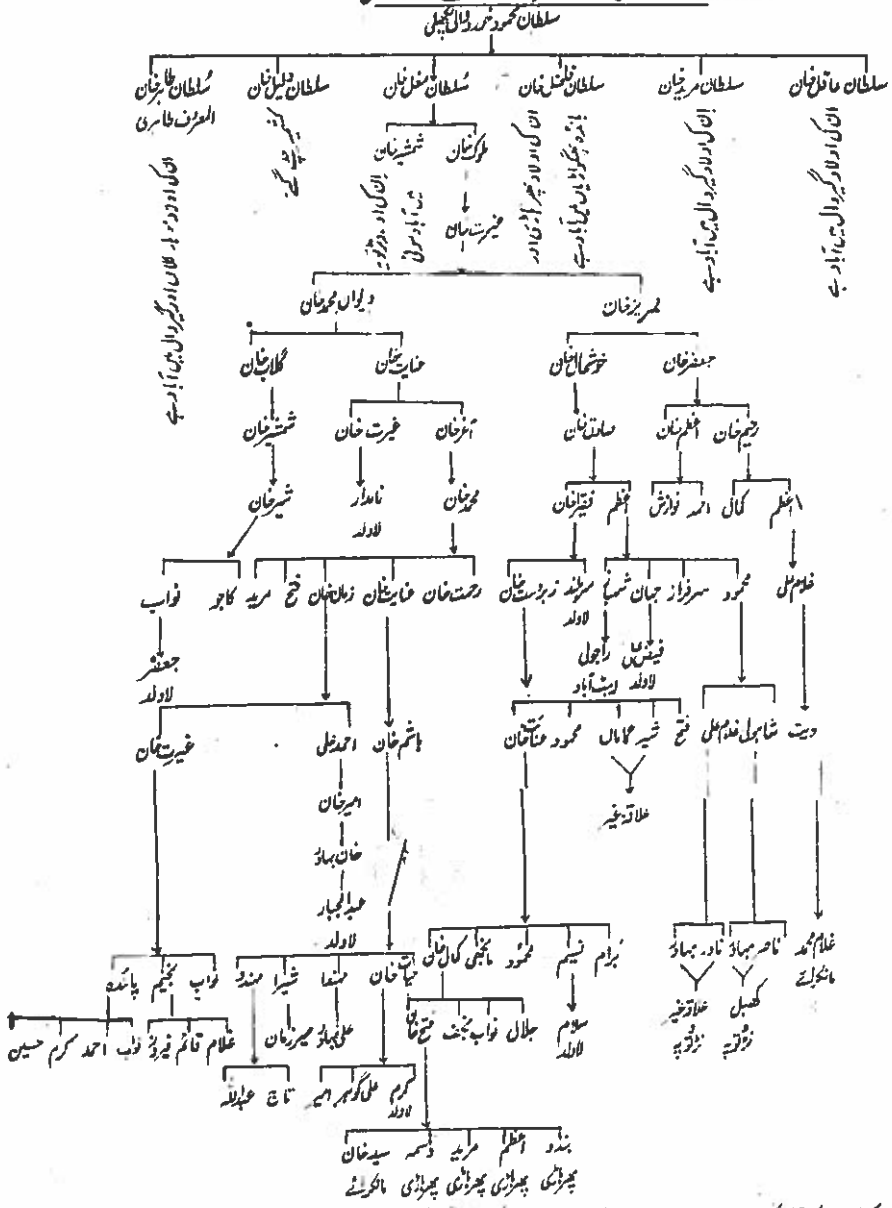

فتح خان اپنے باپ کمال خان کے قتل کے بعد تھپر باڑی کا نیا موضع آباد کر کے وہیں آباد ہو گیا۔ اس کا ایک بیٹا سید خان دوبارہ دونکرائے آکر آباد ہو گیا۔

اور عاقل خان اپنے معتمد خاص مراد خان کی رہنمائی میں دن گزار رہے تھے۔ سلطان فاضل خان اور ملوک خان میدانِ ہزارہ قارلق کے بعض دیہات پر قبضہ کر کے سلطان پور اور مانکرائے کے علاقہ میں سکونت پذیر تھے۔ ترکوں کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہا اور نہ ہی مرکزی حکومت کی طرف سے پکھلی سرکار کا کوئی دوسرا حکمران نامزد کیا گیا۔ سید جلال بابا کچھ عرصہ تک پکھلی میں زندگی بسر کرتے ہوئے ترکوں کی تمام کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس کے دیرینہ دوست مراد خان اور بھائی خان بھی یہیں موجود تھے؛ لہٰذا اس نے سوات کے علاقے سے لشکر تیار کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے پکھلی سرکار کے قلب پر حملہ آور ہوا۔ مراد خان نے مرید خان اور عاقل خان کو سید جلال بابا کے "لشکرِ جرار" کے حملے کی خبر سنانے کے بعد انہیں قلعہ سے نکل جانے کا مشورہ دیا؛ چنانچہ یہ سلطان زادے حرم کی خواتین کو لے کر علاقہ کونش میں روپوش ہو گئے اور سید جلال بابا نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس میں تسخیر گلی باغ کا سن ۱۷۰۳ء لکھا ہوا ہے۔ قلعہ کی تسخیر کے بعد گلی باغ چھاؤنی کے ترکوں نے شہر کو بچانے کی بے سود کوشش کی۔ لڑائی میں گلی باغ جل کر خاکستر ہو گیا۔ عوام کی ہمدردیاں سید جلال بابا کے ساتھ تھیں۔ سواتی لشکر نے گلی باغ اور بیدادی کے شہروں میں خوب لوٹ مچائی۔ ان میں سے کچھ اس کے بعد واپس سوات چلے گئے اور کچھ یہیں آباد ہو گئے۔ سید جلال بابا کے گلی باغ پر قبضہ کرنے کے بعد تمام پکھلی سرکار میں ہر طرف لوگ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکوں کے زوال کا سلسلہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

پکھلی خاص پر قبضہ کرنے کے بعد سید جلال بابا اور مراد خان نے اس علاقہ کی باہمی تقسیم کی۔ غور کا مقام ہے کہ اگر مراد خان فی الواقع سلطان محمود کا وفادار ہوتا تو کیا۔ اس فتح کے بعد سید جلال بابا اسے یوں مفتوحہ علاقہ میں حصہ دار بناتا؟ جو سواتی باشندے یہاں مقیم ہو چکے تھے۔ انہیں سید جلال بابا اور مراد خان سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے از سرِ نو جدوجہد کرنی پڑی۔ چونکہ سلطان محمود دہلی میں اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے بعد پکھلی واپس نہیں لوٹ سکا تھا اور اس کے بیٹے پکھلی سرکار کے مختلف حصوں میں تتر بتر ہو چکے تھے، اس لئے سید جلال بابا نے بقول تاریخ ہزارہ اس ریاست پر قبضہ وارثانہ کا دعویٰ کر دیا۔ تاریخ ہزارہ میں اگرچہ گلی باغ پر سید جلال بابا کے قبضے کا سن لکھا ہوا ہے، لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل ۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا نے گلی باغ

پر قبضہ کیا، جیسا کہ اسی کتاب میں ایک اور مقام پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر یوسف زئیوں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد ۱۶۷۵ء میں حسن ابدال سے واپس ہوا تھا اور وہ ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا۔ مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سلطنت کے زوال کا سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہوا۔

سید جلال بابا تسخیر گلی باغ کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوا اور اٹک تحصیل مانسہرہ کے مقام پر ہی دفن کیا گیا، جہاں اب تک اس کا مزار موجود ہے۔

❖

سُواتی

سواتیوں کی اصل:

مختلف کتبِ تاریخ میں سوات کو سواد، صواتھ اور سروات کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کے باشندوں کو سواتی، سوادی، صواتھی یا سرواتی لکھا اور بولا جاتا رہا ہے؛ لہذا سوات سے مراد وہ باشندے ہیں جو سوات کے رہنے والے ہوں۔ ان سواتی باشندوں میں کئی نسلوں کے افراد شامل ہیں سواتی اسی طرح کے افراد کا ایک مجموعہ ہیں جس طرح ہزارے وال، کشمیری، پختون یا پنجابی ہیں۔ سوات کے علاقے کی کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ طلوعِ اسلام سے قبل ہندو دھرم اور بدھ مت کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ اس میں ہندی الاصل باشندوں کے علاوہ یونانی، ایرانی اور تاتاری باشندے بھی مسکن پذیر تھے۔ سوات کے علاقے سے سکندرِ اعظم کا گزر ہوا، یونانی مصنفین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندرِ اعظم کافی عرصہ تک سوات اور باجوڑ کے باشندوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے جدّ و جہد کرتا رہا۔ یونانیوں (ہیروڈوٹس، سیلوکس) کے بیانات کے مطابق اس علاقہ میں اسپاسی (ایسپ زئی)، اساکین اور نیسا نامی قبائل آباد تھے۔ نیسا کی آبادی کا دعویٰ تھا کہ وہ یونانی الاصل ہیں۔ سکندرِ اعظم نے ان کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندرِ اعظم کی آمد یعنی ۳۲۶ء ق م سے بھی کچھ عرصہ پہلے کچھ یونانی باشندے سوات کے علاقے میں موجود تھے۔ غزنوی دور سے قبل سوات اور باجوڑ کا علاقہ تقریباً چار سو برس سے ترکی شاہیہ اور ہندو شاہیہ گندھارا کے تاتاری النسل بدھ اور ہندو حکمرانوں کے تابع

پندرھویں صدی کی ابتدا میں یوسف زئیوں کی آمد سے قبل سوات اور باجوڑ کے حکمرانوں کی تین شاخیں موجود تھیں۔ گبری، متراوی اور ممیال، گبریوں کا مرکزی مقام منگلور تھا۔ اوّل اوّل یہ قبیلہ باجوڑ کے نزدیک گبری یا جبری نامی ایک مقام پر آباد ہوا تھا، اس نسبت سے اس کا نام گبری مشہور ہوا۔ درحقیقت یہی سواتی جہانگیری سلاطین کی اولاد سمجھے جاتے ہیں، ان کے بزرگوں میں سلطان جہانگیر سلطان پکھال، سلطان بہرام اور سلطان اویس سوات کے مشہور حکمران تھے۔ جہانگیری سواتیوں کو اکثر مصنفین نے نسلاً تاجک لکھا ہے۔ سلطان پکھال کی اولاد علاقہ سوات میں برسرِ اقتدار تھی اور مومیا اور متراکی اولاد جنہیں متراوی اور ممیالی سواتی کہا جاتا ہے باجوڑ کے علاقے میں آباد تھی۔ پکھال اور مومیا اور متر اتینوں ہندی الاصل الفاظ ہیں۔ چودھویں صدی کے آخری حصے میں اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں ان ناموں والے افراد کے سوات و باجوڑ کے علاقے میں زندہ موجود ہونے سے ان کی اصل کا پتہ چل جاتا ہے۔ گزشتہ اوراق میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ زمانۂ قبل از اسلام میں جو بیرونی اقوام اس علاقے میں آکر آباد ہو گئیں۔ اُنہوں نے رفتہ رفتہ ہندو دھرم یا بُدھ دھرم اختیار کر لیا تھا اور وہ ہندی معاشرے میں کھشتریوں کا مقام حاصل کر گئی تھیں۔ اس علاقے میں یوسف زئیوں کی آمد سے قبل یعنی پندرھویں صدی کی ابتدا میں صرف دو ہی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ایک گبری اور دوسری دری حکمرانوں کی زبان گبری تھی اور رعایا کی زبان دری تھی۔ گبری زبان گبریوں کے تاجک ہونے کی ایک دلیل سمجھی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں تواریخ حافظ رحمت خانی کا بیان ہے:

"[1] در آں وقت سلاطینِ سوات و مردمِ جہانگیریہ بہ زبان گبری مے گفتند، و رعایۂ سوات زبان یادری مے گفتند۔ در آں وقت اہل سوات بر ہمیں دو زبان تکلم مے کردند۔"

ترجمہ: اس زمانے میں سلاطینِ سوات اور جہانگیریوں کی زبان گبری تھی۔ سوات کی رعایا یادری زبان بولتی تھی۔ اس وقت اہلِ سوات صرف یہی دو زبانیں بولتے تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس

---

[1] تواریخ حافظ رحمت خانی مؤلفہ پیر معظم شاہ صفحہ ۶۶

سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کی ابتدا تک یعنی یوسف زئیوں کی آمد سے قبل سوات میں زبان کا وجود نہ تھا۔

سیر المتاخرین میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"[1] یوسف زئی را بنگاہ در زمانِ میرزا الغ بیگ کابلی بدیں سرزمین رسیدہ از داؤد سلطان کہ خود را دخترزاد سلطان سکندر ذوالقرنین مے گیرند برگرفتند، گویند کہ سلطان برخے ابنائی خود را با لختے فوج و خویشاں دریں بلاد گزاشتہ بود۔ ہنوز چندے ازیں گروہ دریں کوہسار بسر مے برند و نسب نامہ سکندری در دست دارند۔"

ترجمہ: (میرزا الغ بیگ کابلی (ظہیر الدین بابر کا چچا) کے زمانے میں یوسف زئیوں نے اس سرزمین (سوات) کو داؤد سلطان سے چھین لیا جو کہ اپنے آپ کو ذوالقرنین کی بیٹی کی اولاد بیان کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سکندر نے اپنی اولاد میں سے بعض کو کچھ فوج دے کر اس علاقہ میں چھوڑ دیا تھا۔ اب بھی اس گروہ کے کچھ افراد اس کوہستان میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں نسب نامہ سکندری اٹھا رکھا ہے۔)

گزشتہ زمانے میں قرآن کے بارے میں مورخین کو بعض اوقات عجب مغالطہ لگا ہے۔ وہ غلطی سے سکندرِ اعظم کو ذوالقرنین سمجھتے رہے، حالانکہ سکندرِ اعظم مسلمہ طور پر یونان کے شاہ مقدونیہ کا بیٹا تھا اور وہ بتیس برس کی عمر میں ہندوستان سے واپسی کے سفر پر بابل پہنچ کر فوت ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تحقیقات کی روشنی میں قرآن کا ذوالقرنین سکندر یونانی نہیں، بلکہ سائرس اوّل شاہِ ایران تھا۔ سائرس اوّل ۵۵۰-۵۳۰ ق م کے درمیانی عرصہ میں وادی پشاور پر حکمرانی کر چکا تھا۔ بہر حال اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف زئیوں کی علاقہ سوات میں آمد سے قبل اس علاقے میں یونانی الاصل باشندے موجود تھے اور اکبری دور تک وہ اس کے کوہستان میں موجود رہے، مگر صدیوں کے تغیرات کے بعد اب ان کی نشاندہی محال ہے۔

ظہیر الدین بابر کے علاقہ سوات و باجوڑ میں نمودار ہونے تک یعنی ۱۵۱۹ء تک یوسف زئی

---

[1] سیر المتاخرین تالیف منشی نول کشور صفحہ ۶۵

اس علاقے میں اچھی طرح قدم جما چکے تھے۔ یوسف زئیوں کا اصل علاقہ افغانستان میں تھا، لیکن ظہیر الدین بابر کے چچا الغ بیگ ثانی نے انہیں زبردستی وہاں سے نکال دیا تھا۔ یوسف زئی پہلے تو دلازاکوں سے پناہ لے کر اس علاقے میں آباد ہوئے، لیکن جب ان کی آبادی میں اضافہ ہوا تو وہ تمام مقامی اور قدیم قبائل کے لئے مصیبت بن گئے۔ بابر نے باجوڑ کے سلطان حیدر علی کو شکست دے کر اس کی قوت ختم کر دی اور پھر یوسف زئیوں کی سرکوبی میں مصروف رہا، لیکن وہ بہت جلد یوسف زئی سردار شاہ منصور کی بیٹی مبارکہ بی بی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ مبارکہ بی بی سے نکاح کرنے کے بعد اس نے یوسف زئیوں کو معاف کر دیا۔ بابر کے ساتھ گبری سلطان اویس نے ملاقات بھی کی۔ بابر کی واپسی کے بعد یوسف زئی گبریوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ انہوں نے سلطان اویس کو کاشغر کے علاقے کی طرف مار بھگانے کے بعد منگلور جیسے اہم مرکزی مقام پر قبضہ کر لیا۔ تمام گبری، متراوی اور ممیالی سلاطین زادے تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے بعض ہزارہ کی طرف پناہ گزیں ہو گئے۔ بعض کاشغر کے علاقے کو چلے گئے اور اکثر یوسف زئیوں کے زیرنگیں ہو گئے۔ یوسف زئیوں کے غلبے کے بعد اس علاقے میں پختو زبان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ سوات اور باجوڑ کے قدیم باشندے اپنی قدیم گبری اور دری زبانوں کو بھلا بیٹھے اور پختون بن گئے۔ ظہیر الدین بابر کے ہندوستان فتح کرنے یعنی ۱۵۲۶ء تک یوسف زئی وادیٔ پشاور کی سب سے زیادہ باوقار قوم بن چکے تھے۔ ان کا قبائلی ملک کجو اس علاقے کا سب سے زیادہ طاقتور ملک تھا۔ سوات اور باجوڑ کے باشندوں کے علاوہ غوریا خیل، تڑ کانڑی اور دلازاک بھی یوسف زئیوں کے ماتحت ہو چکے تھے۔ اس وقت ولایتِ پکھلی کا ترک حکمران سلطان غیاث الدین عبداللہ خان تھا۔ اس زمانے میں سواتی ہزارہ میں بطورِ یلغار نہیں آئے تھے، بلکہ وہ یوسف زئیوں کی چیرہ دستیوں سے پناہ لینے کی خاطر یہاں آئے تھے۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک یہاں کی رعایا بن کر رہے۔ وہ بطورِ یلغار ۱۷۱۲ء میں سید جلال بابا کے لشکر میں شامل ہو کر آئے جس کا ذکر آئندہ سطور میں آ رہا ہے۔

جو سواتی باشندے علاقہ سوات یا باجوڑ میں موجود تھے۔ وہ مستقل طور پر یوسف زئیوں کے ماتحت ہو گئے۔ غلامی کی زندگی اختیار کرنے کے بعد وہ کافی حد تک اپنی قدیم تاریخ سے بھی ناواقف ہو گئے اور انہوں نے نہ صرف اپنی زبانوں کو بھلا کر پشتون زبان سیکھ لی، بلکہ ان کی عادات و اطوار

بھی یوسف زئیوں کی مانند ہوگئیں۔ سواتیوں کی اسی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہزارہ گزیٹیر ۸۲-۱۸۸۳ء میں لکھتا ہے: [1]

"Although the Swatis are not originally Afghans, but having adopted both the Afghan language and habits, and being mixed up with them, they go by the name of Afghans, and are mumbered among them. They are related to have originally resided in the territories of Sawat and Bajour; but at the time when Yueafzais had obtained a decided predominence and reduced the whole Takht-ul-Jabal to their sway, their emigrated to Swat".

اسی اقتباس میں آگے چل کر سواتیوں کے پہلی بار پختونی سرکار کے علاقے میں داخل ہونے کا ذکر موجود ہے۔ ہزارہ گزیٹیر گبری یعنی جہانگیری سواتیوں کو تاجک بیان کرتا ہے۔ راورٹی Raverty کا بھی یہی خیال ہے۔ ہزارہ گزیٹیر میالی اور متزادی سواتیوں کے اس دعوے کو مسترد کرتا ہے کہ وہ یوسف زئی ہیں۔ گبریوں کے بارے میں ہزارہ گزیٹیر کا بیان ہے: [2]

---

[1] ہزارہ گزیٹیر ۸۲-۱۸۸۳ء صفحہ ۷۳

[2] ہزارہ گزیٹیر ۸۲-۱۸۸۳ء صفحہ ۷۳

"The Gabris are said to have decended partly from the family of Sultan Quais, Sultan Bahram, Sultan Pakhal and Sultan Jahangir, who were all Sultars of Servat (Swat); and are called also Jahangrian Sultains. They originally are Tajiks, the rest of them consist of diffarent races".

ہزارہ گزیٹیر کا مندرجہ بالا بیان کسی تعصب یا سُنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں، بلکہ سوات کی تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہزارہ گزیٹیر کے اس بیان کو سیر المتاخرین کے گزشتہ حوالے سے ملا کر پڑھا جائے تو ان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ گبری، ممیالی اور متزادی سواتی یوسف زئیوں کی آمد سے پیشتر سوات میں حکمران تھے اور سوات میں ہندی، ایرانی، یونانی اور تاتاری نسلوں کے باشندے کثیر تعداد میں موجود تھے حکمرانوں کی زبان گبری تھی۔ یوسف زئیوں کی اپنی تاریخ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے اور حافظ رحمت خان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ سترھویں صدی کے افغان شجرہ نویسوں نے گبری، ممیالی اور متزادی سواتیوں کو افغان اقوام میں شامل نہیں کیا۔ خلاصۃ الانساب ان سواتیوں کے افغان اقوام ہونے کا قائل نہیں۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں سواتیوں کی اصل کا پتہ چلانا کچھ دشوار نہیں۔

پکھلی میں سواتیوں کی آمد:

اب رہا اس لشکر کا معاملہ جو سید جلال بابا اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد میں سوات سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ ہزارہ اور ہزارہ گزیٹیر میں صاف صاف لکھا ہے کہ اس لشکر میں اہل سوات کے تمام باشندوں کے افراد شامل تھے۔ یہ لشکر کسی ایک سواتی قبیلہ کے افراد پر مشتمل نہ تھا۔ سید جلال بابا کے اپنے خاندان کے اثر و رسوخ اور اس روپیہ کی مدد سے یہ لشکر تیار کیا تھا جو بھوگڑ منگ سے بھاگتے وقت وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، اس لئے اس سواتی لشکر کے سواتیوں کو نسلی طور پر ایک قوم قرار دینا ایک غلط بات ہے۔ اس لشکر کے متعلق ہزارہ گزیٹیر میں

Part II Page 5 ۵ ہسٹری آف افغانسز مصنفہ برن ہارڈ ڈوانز صفحہ ۵

لکھتا ہے :

"Jalal Baba collected a heterogenieus following in the Swat valley, West of the Indus wicting the Turks, appropriated the country now held by the Cis-Indus Swatis. Similarly about the same time the Tanalis crossed over from their original country on the West Bank of the Indus and appropriated the tracts in Hozara now known as Tanawal. The Jaduns, a tribe associated with Afghans but not themselves of Afghan origin, appropriated the old Turk rights in the country round Dhamtaur. The Karrals and Dhunds began to assert themselves some independance of the Gokhars, and in the Hazara plain the Turins entirely stamped out a large portion of the rights of the old GuJJar families, while the utmanzais crossed over the Indus to Turbela by the remaining Guffars in order to strengthen their position, appropriated under pretence of mortgages and sales, a large portion of the lands of those who had called in their aid"

لہ ہزارہ گزیٹیر صفحہ ۲۱ ، ۱۹۰۲-۰۳ء

اس اقتباس میں ترکوں کے زوال اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق کے علاقے میں پیش قدمی کرنے والے مختلف قبائل کی آمد کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کی کمزوری اور ترکوں کی خانہ جنگی کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔

تاریخ ہزارہ میں کیپٹن ویس لکھتا ہے:

"[1] دراصل یہ (سواتی) ایک قوم نہیں، صدہا متفرق اقوام سے یہ ایک لشکر صوات سے تیار کر کے ترکوں سے اس ملک کے فتح کرنے کے واسطے اس جگہ آیا ..... یہ لشکر جو فتح کر کے اسی جگہ رہ گیا، صواتھی کے نام سے مشہور ہو گیا تو رفتہ رفتہ یہ ایک قوم بن گئی۔"

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سواتیوں نے پکھلی کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اس کا نام اپنے جدِ امجد سلطان پکھال کے نام پر پکھلی رکھا، لیکن گزشتہ اوراق میں بیان کئے گئے تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ خیال قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے۔ سواتیوں کے کچھ افراد پہلی مرتبہ یوسف زئیوں سے شکست کھانے کے بعد ظہیر الدین بابر کے عہد میں یعنی ۱۵۱۹-۲۵ء کے لگ بھگ اس علاقے میں پناہ لینے کی غرض سے داخل ہوئے تھے۔ اس وقت ولایتِ پکھلی کا حکمران سلطان غیاث الدین عبداللہ خان تھا جس کا ذکر تواریخ حافظ رحمت خانی میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا اس وقت پکھلی فتح کرنے یا اس کا نام تجویز کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ تمام کتب تاریخ میں جن میں تاریخِ کشمیر مصنفہ محمد دین فوق، تاریخ کشمیر (اعظمی)، اکبر نامہ، سلطانی، سیر المتاخرین اور آئینِ اکبری شامل ہیں۔ اس ملک کا نام تیموری حملے سے قبل بھی پکھلی ہی بیان کرتی رہی ہیں۔ امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸-۹۹ء میں ہوا اور اس وقت سے یہاں ترکوں کی حکمرانی قائم ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطان پکھال پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں بھی اسے ملک کا نام تواتر کے ساتھ پکھلی ہی لکھا جاتا رہا ہے، اس لئے یہ کسی صورت ممکن ہی نہ تھا کہ سواتی ۱۷۱۳ء میں بھی اس کا نام پکھلی تجویز کرتے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۷۱۳ء میں جو سواتی لشکر سید جلال بابا سوات سے بھرتی کر کے لایا

---

[1] تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس صفحہ ۱۵۲

تھا۔ اس میں سواتیوں کا اپنا کوئی سردار یا ملک موجود نہ تھا، بلکہ لشکر کی کمان کلی طور پر سید جلال بابا کے ہاتھ میں تھی۔ حد یہ ہے کہ فتح کے بعد بھی سید جلال بابا ہی ان کا رہنما بنا رہا۔ اس کے ساتھ ہی علاقے کی تقسیم میں صرف مراد خان حصہ دار ہوا۔ سید جلال بابا سلطان محمود کا داماد ہونے کے سبب بھی اس علاقے پر اپنا قبضہ وارثانہ جتاتا رہا۔ آخر کار جو سواتی باشندے یہاں آباد ہو چکے تھے، انہیں اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے سید جلال بابا اور مراد خان کے خلاف نئے سرے سے جدّ و جہد کرنی پڑی۔ طویل کشمکش کے بعد وہ اپنا حصہ وصول کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ترکوں کے زوال کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس علاقے میں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق میں ترکوں کے زوال کے بعد کوئی ایسی مرکزی طاقت باقی نہ رہی تھی جو درانیوں کے مقابلہ کا چیلنج قبول کر سکتی۔ پکھلی سرکار بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم تھی۔ درّانی فوج ایک ایک عظیم ریاست کی فوج تھی جس کا مقابلہ کرنا چند غیر منظم قبائل کی بھیڑ کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ درّانی چونکہ سلطنتِ مغلیہ کے قائم مقام بننے کی جدّ و جہد کر رہے تھے؛ لہٰذا ترکوں کو ان سے ہمدردانہ رویّہ کی توقع نہ تھی۔ اس دَور کے خوانینِ ہزارہ نے درّانیوں کی وفاداری و فرماں برداری ہی میں اپنی خیریت دیکھی۔ درّانیوں نے یہاں براہِ راست حکمرانی کرنے کی بجائے مقامی باثر خوانین ہی کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلانا مناسب خیال کیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے عام طور پر ان قبائل کے خوانین کو منتخب کیا جو شاہراہِ کشمیر کے کنارے آباد تھے۔ پکھلی خاص میں ان کی نگاہِ انتخاب سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ پر پڑی۔ یہ خاندان ترکوں کے زمانے سے حکومت کا کاروبار چلانے کا تجربہ رکھتا تھا؛ چنانچہ سعادت خان درّانیوں کے عہد میں اس علاقے کا سب سے زیادہ باوقار شخص بن گیا۔

گبری یا جہانگیری سواتی زیادہ تر اتلی پکھلی، کاغان، بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ، مانسہرہ، شنکیاری، بھوگڑ منگ، کونش، نندہاڑ اور تھاہ کوٹ میں آباد ہوئے۔ ممیالی اور مترادی زیادہ تر نرلی پکھلی یعنی بھیڑ کنڈ، اگرور، ٹیکری اور دیشی کے علاقوں میں آباد ہوئے۔ ہزارہ گزیٹیر کے بیان کے مطابق سواتی باشندے افغانوں کی طرح مزید شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ان کی مشہور شاخیں خانخیل، سرخیل، ڈڈال، پنجغول، پنجمیرال، جہانگیری، ارغشالی، ملکال، ازنالی اور مندرال ہیں۔ سواتیوں کی اکثریت پختو زبان میں گفتگو کرتی ہے، لیکن عرصہ دراز سے پکھلی سرکار میں مقیم رہنے اور اس علاقے

کے دُوسرے باشندوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے وہ ہندکو زبان بھی جانتے ہیں۔ وہ عرصۂ دراز سے پنی قدیم گبری اور دری زبانوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ کردار کے لحاظ سے سواتیوں کو اہل ہزارہ میں جس وصف کی بنا پر امتیازی مقام حاصل ہے۔ وہ تاریخ ہزارہ مصنفہ ویس اور ہزارہ گزیٹیر کے بیان کے مطابق ان کا "سواتی چھل" ہے، جسے اہل ہزارہ خوب جانتے ہیں۔ ہزارہ گزیٹیر ۱۸۸۴ء اور تاریخ ہزارہ مصنفہ ویس میں سواتیوں کی بعض اخلاقی کمزوریوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں یہ کمزوریاں موجود بھی ہوں، لیکن کسی قوم کی سیاسی، معاشرتی یا اخلاقی حالت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی، لہٰذا ان کمزوریوں کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے، تب بھی انہیں اسی دور تک محدود تصوّر کرنا چاہیئے۔

٭

ترین

ترینوں کی اصل :

ترین اصلاً قندھار اور پشین کے علاقے کے باشندے تھے۔ افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری کی مشہور روایت کے مطابق ترین قوم کے مورثِ اعلیٰ کا نام ترین بن شرقیان یا شرجون بن سہ بن تھا۔ اسی نسبت سے اس کا شمار سربنی افغانوں میں کیا جاتا ہے۔ ترین کے تین بیٹے تھے جن میں سے ایک کا نام ابدال، دوسرے کا تور اور تیسرے کا نام سپین تھا۔ تور اور سپین کی اولاد ترین مشہور ہوئی۔ آگے چل کر ترین کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

تور ترین : سیگی، نورزئی، مکھیانی، ملکیار، علی زئی اور ابوبکر

سپین ترین : زام، ونیچی، سلیمانی، رئیسانی، مارپانی، لسیانی، اودانی اور ملکرانی۔

سلطنتِ مغلیہ کے عہد کا ترین وہ واحد قبیلہ ہے جسے ہزارہ قارلق اور کچھل سرکار میں منظم پر افغان لکھا گیا ہے۔ اتمان زئی، علی زئی اور کچھ دوسرے افغان قبائل اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہزارہ میں داخل ہوئے، اس لئے میں نے ان قبائل کا تذکرہ اس کتاب کی پہلی جلد کی بجائے دوسری جلد میں کرنا مناسب سمجھا ہے۔ ترین قبیلہ کی اصل معلوم کرنے کے لئے دراصل افغانوں کی اصل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

افغانوں کی اصل کے سلسلے میں اب تک بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکا کہ آیا افغان سامی نسل سے نسبی تعلق رکھتے ہیں یا تاتاری النسل اقوام میں سے کسی ایک کے ساتھ جہاں تک افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری کا تعلق ہے، وہ زیادہ تر ان افغان مصنفین کی تخلیق

ہے جو خود فارسی بولنے والے تھے اور سترھویں صدی کے دہلی درباروں سے منسلک تھے۔ ان میں سرفہرست مخزنِ افغانی کا مصنف نعمت اللہ ہے۔

سترھویں صدی سے قبل افغانوں کا کوئی شجرہ نسب دستیاب نہیں ہو سکا۔ افغانوں کی بنی اسرائیل تھیوری کا دارومدار ایک زبانی روایت پر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارمیا یا جرمیا بن طالوت کا بیٹا افغانہ سلیمان علیہ السلام کا جرنیل تھا۔ بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد افغانہ کے بیٹے بھاگ کر مکہ اور غور (افغانستان) کے علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس روایت کے بیان کے مطابق حضرت خالد بن ولید انہیں کی اولاد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے آنحضرتؐ کے زمانے میں غور والے افغان بھائیوں کو دعوتِ اسلام دی اور ان کا ایک وفد بقول ان کے قیس کی سربراہی میں مکہ پہنچا اور مشرف باسلام ہوا۔ اس کا نام آنحضرتؐ نے عبدالرشید رکھا اور اسے بطان یا بتان لقب عطا کیا۔ واپس جا کر قیس عبدالرشید نے اسلام کے لئے جہاد شروع کر دیا۔ اس روایت کی رو سے قیس عبدالرشید طالوت کی سینتیسویں پشت میں تھا جو سترہ سو برس کے طویل عرصے میں گزریں۔ اس روایت کی رو سے افغان بنی اسرائیل مشہور ہوئے۔ قیس عبدالرشید کی اولاد کا شجرہ نسب جس میں ترین بھی شامل ہیں، اسی روایت کے مطابق مندرجہ ذیل ترتیب دیا گیا ہے:

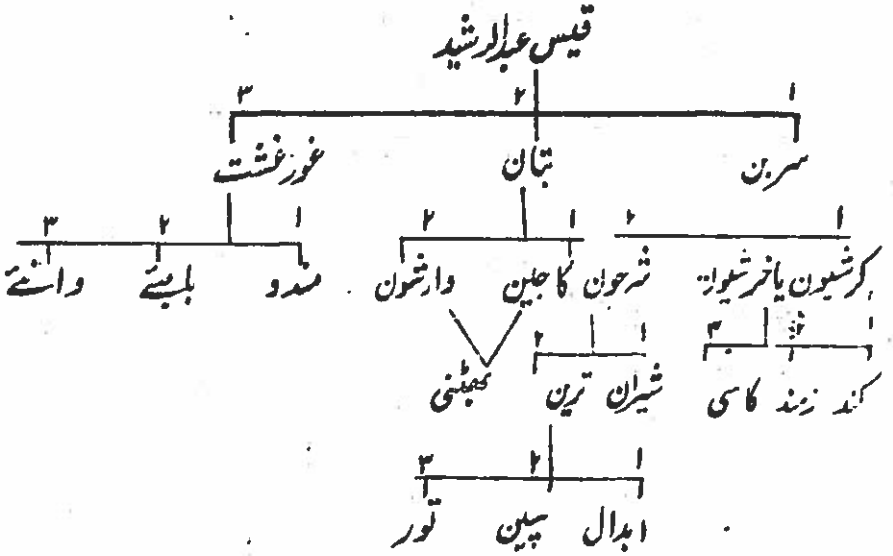

کافی عرصہ تک افغانوں اور پختونوں میں مندرجہ بالا روایت کا چرچا رہا۔ کوہ سلیمان اور درۂ خیبر کے ناموں کو بھی افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کی دلیل ٹھہرایا جاتا رہا اور نسلی طور پر مدینہ کے یہودیوں کو افغانوں ہی کی قوم قرار دیا جاتا رہا۔ مگر بیشتر مورخین بالخصوص دورِ جدید کے مصنفین افغانوں کی اس تھیوری

کو ناقابلِ اعتماد قرار دیتے ہوئے رد کر رہے ہیں۔ اب تک اس تھیوری کے خلاف جو تنقیدات سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ تاریخ بنی اسرائیل میں افغانہ بن ارمیا یا جرمیا نام کا کوئی فرد نہیں ملتا۔ اگر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جرنیل ہوتا تو تاریخ بنی اسرائیل میں اس کا ذکر ضرور موجود ہوتا۔

۲۔ کسی حدیث یا عربی تاریخ سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ قیس عبدالرشید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ یہ ثابت ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ قریش خاندان کے فرد تھے، بنی اسرائیل نہ تھے، اس لئے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنے غور کے یہودی النسل بھائیوں کو نسبی رشتے کی بنیاد پر دعوتِ اسلام دیتے۔

۳۔ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ ۵۸۷ء قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل مدینہ میں آباد ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۳۲ء میں رومیوں نے یہودیوں کو فلسطین سے باہر نکالا اور وہ اس کے بعد مدینہ میں آکر آباد ہوئے۔ یہودیوں کی اسی آبادکاری کے بارے میں مشہور مفسرِ قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے باہر نکال کیا۔ اس دور میں بہت سے یہودی بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔"[1]

مولانا مودودی صاحب نے مضبوط دلائل کے ساتھ اس روایت کی تردید کردی ہے کہ یہودی بخت نصر کے ہاتھوں فلسطین کی تباہی کے بعد حجاز میں آباد ہوئے تھے۔

۴۔ طبقاتِ اکبری، طبقاتِ ناصری اور دیگر تمام معتبر کتبِ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اموی اور عباسی دور میں عربوں کی پیش قدمی کے باوجود دسویں صدی عیسوی تک علاقہ غور کے باشندے

---

[1] تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۳۷۱، پارہ ۲۸ سورۃ حشر

ملحد تھے، حالانکہ ان کے اردگرد بسنے والے تمام ترک قبائل مثلاً غزنوی، قراخانی اور سلجوقی مشرف بااسلام ہو چکے تھے۔ مؤرخین نے غوریوں کو افغان نہیں، بلکہ نسلاً ترک قرار دیا ہے؛ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ علاقہ غور کے افغان نبوی دور میں مصروفِ جہاد ہو سکتے تھے۔ عتبی، البیرونی اور دیگر مؤرخین کا بیان ہے کہ سن ہجری کے بعد مسلسل چار سو برس تک موجودہ افغانستان اور صوبہ سرحد تا بحد کشمیر تک کے تمام سرحدی علاقے پر ترکی شاہیہ کابل اور ہندو شاہیہ گندھارا کے بدھ اور ہندو حکمرانوں کی حکومت قائم تھی۔ البیرونی سرحدی باشندوں کو صاف صاف "وحشی جنگجو ہندو قبائل" قرار دیتا ہے۔

۵۔ عتبی اور البیرونی کی تحریروں کے علاوہ بامیان کابل، سوات، پشاور اور ٹیکسلا کی کھدائیوں سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بدھ مت نہ صرف سرحد اور افغانستان بلکہ توران میں سمرقند و بخارا جیسے دور دراز علاقوں تک پھیل چکا تھا۔ لاہور تحصیل صوابی، ہنڈ اور چارسدہ بدھ مت کے مرکزی مقامات رہ چکے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو نہ صرف ہندو کش، بلکہ ان علاقوں کے کافر افغانوں سے بھی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ علاقہ غور میں بھی پہلی بار غزنوی فوج نے غلبہ حاصل کیا۔ مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ افغانستان کے علاقے میں پہلی بار غزنوی ترکوں کے عہد میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ جے پال، آنند پال اور پرتھوی راج کے خلاف تمام لڑائیوں میں افغان باشندے دونوں طرف سے لڑتے رہے۔

۶۔ سکندرِ اعظم نے ۳۰۵ ق م تا ۳۲۷ ق م کے درمیانی عرصے میں افغانستان اور سرحد کے علاقے میں غلبہ حاصل کیا۔ سیلوکس درہ خیبر کے علاقے میں پکٹیان اور ہیروڈوٹس پکتوایک (پختون) باشندوں کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ یونانی مصنفین اپرٹئے (اپریے، آفریدی) اسپالئی (ایسپ زئی) اور اساکین قبائل کی موجودگی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ ہیون سانگ اپوکین (افغان) باشندوں کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ ان مصنفین کی تحریروں سے اس علاقے میں پختون اور افغان باشندوں کی موجودگی کا زمانہ یونانی دور سے بھی قبل قرار دیا جا سکتا ہے۔

۷۔ لفظ افغان فارسی کے الفاظ آہ و فغان سے مل کر بنا ہے۔ ساسانی افغانوں کو ابغان اور ترک اوغان پکارتے تھے۔ ابنِ بطوطہ افغانوں کو فارسی بولنے والے ایرانی النسل باشندے قرار دیتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی بھی ایسی خیال کی تائید کرتے ہیں اور موجودہ افغان حکومت بھی یہی رجحان رکھتی ہے۔ ان دلائل کی بنا پر افغانوں اور پختونوں کو وہ آریائی باشندے قرار دینا خارج از

ہان نہیں، جن میں رفتہ رفتہ یونانی، ستھین، پارتھین، کشن اور ہن اقوام کے افراد کا اضافہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر افغانوں اور پختونوں کی شکل میں دو بڑے گروہ وجود میں آگئے۔

سر اولف کیرو بیلیو Bellew کے حوالے سے لکھتا ہے (دی پٹھان صفحہ ۱۳) کہ سربن کرشیون اور شرجون دراصل ہندی الفاظ، سرجن، کرشن اور سریابن (سورج بنسی) ہیں۔ کیرو نے میسن Mason کے اس خیال کو بھی درج کیا ہے (دی پٹھان صفحہ ۹۰) کہ آرمینی مصنفین سفید ہن قوم کو ہیپتال لکھا کرتے تھے اور سیاہ پوش کافر انہیں اوول پکارتے تھے؛ لہٰذا اس کے خیال کے مطابق ہو سکتا ہے کہ ہیپتال یا اودال دراصل ابدال ہی ہوں، عرب اور ترک ہن قوم کو حیطال Hepthal پکارتے تھے؛ لہٰذا ہمارے ہاں کی تاریخوں میں ہنون کو ہُن یا حیطال ہی لکھا گیا ہے۔ کیرو کے خیال میں ہن خون زیادہ تر سربنی افغانوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہن قوم اگرچہ ترکی النسل تھی، لیکن عرصہ دراز تک افغانستان اور شمالی ہند میں زندگی بسر کرنے کے بعد اس نے بدھ مت یا ہندو دھرم قبول کر لیا تھا۔ لفظ خان، تور اور مہر گل ہُن دور کی یاد دلاتے ہیں اور افغانوں یا پٹھانوں میں اب تک کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ افغانوں کی اصل پر تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ بات بھی ابھی تک تصفیہ طلب ہے کہ آیا افغان اور پٹھان ایک ہی قوم کے دو نام ہیں یا یہ دو الگ قومیں ہیں۔ اگر یہ ایک ہی قوم ہیں (جیسا کہ عموماً ہم سنتے ہیں) تو پھر اس بات کی کھوج لگانی پڑے گی کہ ان کے نام اور زبان میں یہ فرق کب سے اور کیونکر پیدا ہو گیا۔ پختونوں کے اندر بھی متعدد نسلوں کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک ترینوں کی پشین سے اس علاقے میں آمد کا تعلق ہے اس کے بارے میں تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ولیس کا بیان یہ ہے کہ مشہور روایت کے مطابق ترکوں کے اولین جلیل القدر مسلمان حکمران سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کے مختلف علاقے فتح کرنے کے بعد غزنی، غور، قندھار اور پشین کے علاقوں میں سے چند قبائل کو جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اپنی ہندی مقبوضات میں آباد ہونے کا حکم دیا۔ ان قبائل میں ترین بھی شامل تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے حکم سے ترینوں کا پہلا شخص مسمّی ہارون خان علاقہ چھچھ میں آباد ہوا۔ موضع ہارون آباد اسی ہارون خان کا آباد کردہ ہے۔

بعد ازاں اس کی اولاد علاقہ چھچھ ہی میں پھلی پھولی۔ بہت مدت بعد اسی ہاردن خان کی اولاد میں سے بوستان خان ترین نے ۱۶۲۰ء میں موضع دوتی آباد کیا۔ اس طرح جہانگیر کے آخری عہد میں ترینوں نے میدانِ ہزارہ قارلق کا رُخ اختیار کیا۔ بوستان خان ترین کے پوتے ملک درویش نے ۱۶۵۸ء میں تحصیل ہری پور کا موضع درویش آباد کیا۔ اسی سال اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا تھا۔ موضع درویش رفتہ رفتہ اس میدان میں ترینوں کا مرکزی مقام بن گیا۔ ملک درویش کے پوتے گدائی خان نے سرائے گدائی کا موضع آباد کیا۔ درحقیقت عہدِ عالمگیری ہی میں ترینوں کو اس میدان میں قدم جمانے کا موقع میسر ہوا۔

کچھ لوگ غلطی سے اور بعض محض زبردستی سے شمشیر حیات ترین کو ہزارہ قارلق کا باشندہ ترا دے رہے ہیں۔ بلاشبہ شمشیر حیات خان ترین اور شیر خان ترین سلطنتِ مغلیہ کے زمانے کے دو شاہی منصب دار تھے، مگر وہ ہزارہ قارلق کے نہیں، بلکہ قندھار کے علاقے کے رہنے والے تھے شمشیر حیات خان بختون باغیوں کی سرکوبی میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا اور بالآخر ٹھٹھہ کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ شیر خان ترین قندھار کے علاقے میں رہتا تھا، اسے جب سے شاہی ملازمت میں لیا گیا، وہ عمدہ خدمات بجالاتا رہا، لیکن اس کی بدقسمتی سے محاصرۂ قندھار کے دوران میں اس کی غداری ثابت ہوئی جس کی پاداشت میں اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی گئی۔ دو تین سال تک آگرہ میں تنگ دستی کے دن گزارنے کے دوران میں دق کے مرض میں مبتلا ہو کر وہیں فوت ہو گیا۔ چونکہ ان معتبر ترین سرداروں کے حالات مآثر الامراء (صفحہ ۶۵۷، ۶۷۶) اور رقعات عالمگیری میں موجود ہیں، اس لئے انہیں ہزارہ قارلق کے ترین سردار قرار دینا کسی صورت درست نہیں۔ رقعات عالمگیری میں اورنگ زیب قندھار کے قریب شیر خان ترین سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتا ہے۔ ہزارہ کے ترین صدیوں پہلے پشین سے چھچھ آئے اور پھر جیسا کہ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد سے کچھ قبل اس میدان میں اپنی چند ایک بستیاں بھی قائم کر چکے تھے۔ عہد عالمگیری میں ترینوں کو میدانِ ہزارہ قارلق میں باوقار مقام حاصل ہو گیا۔

ہزارہ قارلق میں ترینوں کی آبادکاری:

عہد عالمگیری میں سرحدی علاقہ بدامنی کا شکار ہو گیا۔ اورنگ زیب تخت نشینی کے بعد دستی

اور جنوبی ہند میں راجپوتوں، مرہٹوں اور دکن کی شیعہ ریاستوں کی بغاوتوں کو دبانے میں اتنا مصروف رہا کہ سرحدی علاقہ، بلکہ کابل کا تمام صوبہ عرصہ دراز تک اس کی ذاتی توجہ سے محروم ہوگیا۔ شہنشاہ کی طویل غیر حاضری سے یہاں بے شمار مسائل پیدا ہوگئے۔ شاہی منصب دار اور اہل کار اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتنے لگے، قبائلی پہاڑی علاقوں سے نکل کر شاہراہِ کابل پر تجارتی قافلوں اور افواج کی نقل و حمل میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے۔ ایمل خان آفریدی، خوشحال خان خٹک اور بہاکو خان یوسف زئی نے سرحدی علاقے میں حکومت کے خلاف منافرت پھیلادی۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے قبائل اس بدامنی کی فضا سے فائدہ اٹھا کر سرکار پکھلی اور ہزارہ قارلق کے علاقے میں دست درازیاں کرنے لگے۔

یوسف زئیوں نے ۱۶۶۶-۶۷ء میں دریائے سندھ کو عبور کر کے پکھلی سرکار کے مشہور قلعہ چھاچھل پر حملہ کر کے اپنی جارحیت کا آغاز کر دیا۔ غورغشتی قوم میدان ہزارہ قارلق میں آگے بڑھ کر علاقہ مانکرائے پر قابض ہوگئے۔ سلطان محمود والی پکھلی سرحدی علاقے کی اسی بدامنی کے سلسلے میں اورنگ زیب عالمگیر سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے دہلی گیا ہوا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں یوسف زئی اور غورغشتی پکھلی اور ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھ آئے۔ چھاچھل کے قلعہ کے ترک فوجدار شمشیر خان کی رپورٹ پر اٹک، نیلاب اور علاقہ گکھڑ کے منصب دار حرکت میں آگئے۔ انہوں نے متحدہ طاقت سے یوسف زئیوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ والیٔ پکھلی سلطان محمود کا ایک بیٹا جدّنا سلطان فاضل خان اپنے دو بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر خان سمیت ترک فوج کا ایک دستہ ہمراہ لے کر انہی دنوں میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھا اور اس نے موضع سلطان پور میں کیمپ لگا کر شاہراہ کشمیر کے دونوں طرف مضبوط پہرہ لگا کر اسے محفوظ کر دیا۔ یہیں سے ملوک خان نے ترک فوج کے ساتھ مانکرائے پر حملہ کر کے اس علاقے سے غورغشتی قوم کو مار بھگایا۔ اس طرح ان ترک سرداروں کی جدّوجہد سے شاہراہِ کشمیر محفوظ ہوگئی اور پکھلی سرکار کی مغربی سرحد کا علاقہ بھی مانکرائے سے تربیلا تک محفوظ ہوگیا۔

گڑبڑ اور بدامنی کی اسی فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترینوں نے میدانِ ہزارہ قارلق میں گوجروں کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں گوجر ہی اس میدان کی سب سے زیادہ باوقار قوم تھے۔

جب سرحدی علاقے کے حالات زیادہ تشویشناک ہوئے اور مقامی امراء امن و امان قائم نہ کر سکے تو اورنگ زیب عالمگیر نے بذاتِ خود سرحدی مہمات کی نگرانی کا فیصلہ کیا؛ چنانچہ اورنگ زیب ۱۶۷۴-۷۵ء میں اسی سلسلے میں حسن ابدال تشریف فرما ہوا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کا بیان ہے کہ سب سے پہلے میدانِ ہزارہ قارلق کے ایک معتبر گوجر سردار دولت بیگ نے حسن ابدال پہنچ کر شہنشاہ کا استقبال کیا اور اس نے خوش ہو کر اسے مقدم کا لقب عنایت کیا۔ اس زمانے میں ترینوں کا معتبر سردار گدائی خان تھا جس نے سرائے گدائی کا موضع آباد کیا۔ ترینوں کی دیکھا دیکھی دلازاکوں اور ترکوں نے بھی گوجروں کی املاک پر دست درازی شروع کر دی؛ چنانچہ شہنشاہ کی آمد کو غنیمت جان کر گوجر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ان زیادتیوں کے خلاف ایک شکایت پیش کر دی۔ اتفاق سے اس وقت صالح محمد خان دلازاک بھی وہاں موجود تھا، اس نے جھٹ ثالثی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جسے نادانی سے گوجروں نے تسلیم کر لیا۔ میدانِ ہزارہ قارلق کی تقسیم کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ صالح محمد خان نے ثالث کی حیثیت سے اس میدان کے کل چوراسی دیہات کو اکیس اکیس کی چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح گوجر، ترک، دلازاک اور ترین اس میدان میں برابر کے حصہ دار بن گئے۔

پٹی ترینی کا مرکزی مقام درویش بن گیا۔ ترینی پٹی میں مندرجہ ذیل دیہات شامل کئے گئے، سرائے گدائی، درویش، چھوہر، تلوکر، ریجانہ، ملکیار، پانڈک، سکندر پور، عالم، میلم، پنیاں، دیدڑ، بھوٹڑی، گھیلا، بڑی کاہل، پہاڑو، موٹا، بھیرہ، کوٹھہ، پنڈ پرانی۔ تاریخ ہزارہ کا بیان ہے کہ مندرجہ بالا دیہات ترینوں نے خود ۱۶۶۰ء سے ۱۶۶۸ء کے درمیانی عرصے میں آباد کئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترین قوم کو عہدِ عالمگیری ہی میں اس میدان میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ یہ تقسیم اس میدان میں ترینوں کے عروج کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، اس کے بعد ان چاروں پٹیوں پر سالانہ لگان کی نئی شرح مقرر کی گئی جو قلعہ اٹک میں واجب الادا ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی حسن ابدال سے واپسی کے بعد چند سالوں تک معاملات اسی طرح چلتے رہے، لیکن سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی کی گمشدگی یا شہادت کے بعد پکھلی سرکار کے ترکوں کے مابین ایک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی کا تذکرہ گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے نتیجے

میں پکھلی سرکار بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی اور اس کا آخری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے قبائل نے پکھلی سرکار اور میدان ہزارہ قارلق کی طرف آگے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ کاغانی سیدوں کے مورثِ اعلیٰ اور سلطان محمود والی پکھلی کے داماد سید جلال بابا نے سواتی لشکر کے ساتھ ۱۷۱۳ء میں قلعہ گلی باغ پر قبضہ کر لیا۔ تنولی علاقہ مہابن سے نکل کر آگے بڑھے اور انہوں نے موجودہ تناول کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۱۹-۲۰ء کے لگ بھگ جدونوں کی اچھی خاصی تعداد علاقہ گندف سے آگے بڑھی اور انہوں نے یہاں پہلے سے موجود جدونوں کی مدد سے ترکوں سے دھتوڑ چھین لیا۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد اتمان زئی اور علی زئی قبائل بھی میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ اس زمانے میں سلطنتِ مغلیہ اورنگ زیب کی وفات کے روبہ زوال ہو چکی تھی اور پکھلی سرکار کے ترک خانہ جنگی کے بعد اپنی مرکزیت ختم کر بیٹھے تھے، اس لئے پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق میں بدامنی انتشار اور لوٹ کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ مختلف قبائلی سردار جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اس طرح حالات درانیوں کی پیش قدمی کے لئے انتہائی سازگار بن گئے۔

درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ ۱۷۲۹ء ہی سے شروع ہو چکا تھا، لیکن احمد شاہ ابدالی نے جب ۱۷۴۷ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت سے اس علاقے پر ان کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔ ۱۷۵۰-۵۲ء کے درمیانی عرصے میں احمد شاہ ابدالی نے ہزارہ قارلق، پکھلی سرکار اور کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اسی عرصہ میں پنجاب پر بھی درانیوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ درانیوں کو ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ شاہراہِ کشمیر اس علاقے میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ انہوں نے آئینی طور پر پکھلی سرکار کے علاقے کو کشمیر کے ساتھ منسلک کر دیا اور پرگنہ ہزارہ قارلق کو بدستور اٹک کے ساتھ شامل رکھا، مگر یہاں براہِ راست حکمرانی کرنے کی بجائے درانیوں نے مقامی اور بااثر خوانین ہی کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلانا مناسب سمجھا۔ ترکوں نے سلطان بے نام المعروف بے ناماں راجہ کی قیادت میں درانیوں کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کی جس کی پاداش میں درانیوں نے علاقہ سلطان پور اور مانکرائے پر حملہ کر دیا۔ ترکوں کو شکست ہوئی اور مگری کے مقام پر ان کا سردار سلطان بے نام شہید ہوا۔ ہزارہ کے اکثر قبائل نے درانیوں کی اطاعت ہی میں اپنی خیریت دیکھی۔

درانیوں نے جن مقامی خوانین کو اپنی حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے اس علاقے میں اپنا عامل منتخب کیا، ان میں نجیب اللہ خان ترین، زبردست خان المعروف صوبہ خان تنولی اور سعادت خان گڑھی حبیب اللہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کوٹ نجیب اللہ کا موضع اسی نجیب اللہ خان ترین کا آباد کیا ہوا ہے۔ نجیب اللہ خان ترین نے تھوڑے ہی عرصہ میں پٹی گوجری اور پٹی دلازاک کے بیشتر دیہات پر قبضہ کرلیا اور اس طرح میدان ہزارہ قارلق کا وہ سب سے زیادہ معتبر اور باوقار سردار بن گیا۔ نجیب اللہ خان ترین ۱۷۹۹ء میں فوت ہوا اور اس کی فوتیدگی کے بعد اس کی بیوہ مسماۃ بنی بیگم مقدم مشرف کو اپنا سربراہ بناکر کاروبار چلاتی رہی۔ مقدم مشرف کی سربراہی میں ترینوں نے جہاں ایک طرف طاہر خیلیوں اور اتمان زئیوں کی یلغار کو روکنے میں کامیابی حاصل کی وہاں درانیوں سے بھی انہوں نے کش مکش شروع کردی۔ ۱۸۰۳ء میں جب اٹک کے درانی گورنر نے چھچھ کے ایک قاضی صاحب کو لگان وصول کرنے کے لئے میدانِ ہزارہ قارلق کو روانہ کیا تو ترینوں نے مقدم مشرف ہی کی سربراہی لگان دینے کا اس سے وعدہ کردیا، لیکن رات کی تاریکی میں وہ سکندر پور کے موضع میں قاضی صاحب کی قیام گاہ کے اندر گھس گئے اور انہوں نے اسے قتل کردیا۔ قاضی صاحب کے ساتھی بمشکل اپنی جان بچاکر اٹک چلے گئے۔ اس زمانے میں محمد خان ترینوں کا سردار بن گیا تھا اور وہ اپنے معاملات بدستور مقدم مشرف ہی چلا رہا تھا، چونکہ درانیوں کی حکومت نااہل ہاتھوں میں تھی؛ لہذا ہزارہ قارلق کے تمام خوانین کے ساتھ ان کی کش مکش جاری رہی۔ درانیوں نے سمندر خان درانی کی سربراہی میں موضع سری کے مقام پر خوانین ہزارہ کے خلاف آخری لڑائی لڑی۔ اس لڑائی میں اگرچہ درانیوں کا پلہ بھاری رہا، لیکن نہ تو وہ علاقے میں امن وامان قائم رکھ سکے اور نہ ہی لوگوں نے انہیں لگان ادا کیا۔

۱۸۱۶ء ایک معاملات اسی طرح چلتے رہے۔ میدانِ ہزارہ قارلق کے خوانین کی باہمی چپقلش اور درانیوں کی نااہل قیادت بالآخر اس میدان میں سکھوں کی آمد کا سبب بنی۔ اس وقت پنجکلی سرکار اور میدان ہزارہ قارلق کا علاقہ بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔ عوام اپنے قبائلی سرداروں کے ظلم وستم سے بیزار تھے اور یہ میدان سکھوں کے غلبے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ۱۸۱۶ء میں سکھوں نے پنجکلی سرکار اور میدان ہزارہ قارلق پر قبضہ کرلیا۔ اس میدان کی تمام چیدہ چیدہ اقوام بغیر کسی مرکزی نظام یا کمان کے سکھوں سے برسرِ پیکار ہوگئیں۔ محمد خان ترین نے سکھوں کے خلاف سخت جدوجہد کی، لیکن جیسا کہ ان حالات میں متوقع ہوسکتا ہے، سکھوں نے اس علاقے کے مسلمانوں پر اپنے مظالم

کی انتہا کر دی۔ محمد خان ترین کو قید کر کے کلر کہار کے قلعے میں لے جایا گیا۔ قید ہی کی حالت میں ہزارہ کے اس مردِ مجاہد نے جامِ شہادت نوشیش کیا۔ ۱۸۱۶ء سے ۱۸۴۹ء تک یعنی سکھوں کی آمد سے انگریزوں کی آمد تک کے تفصیلی حالات اس کتاب کی دوسری جلد میں پیش کئے جائیں گے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ محمد خان ترین اور غلام خان ترین نے کن حالات میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف اپنی جدّوجہد جاری رکھی اور بالآخر شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کرتے ہوئے اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے

٭

درّانیوں کا غلبہ

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران کے بادشاہ نادر شاہ درّانی نے ۱۷۲۹ء سے ہندوستان کی شمالی سرحد میں پیش قدمی کا سلسلہ شروع کیا۔ نادر شاہ نسلاً قاچار ترک تھا۔ ۱۷۳۸ء میں محمد شاہ رنگیلا کے دورِ حکومت میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی کو لوٹ کیا۔ ہندوستان کے عیش پرست بادشاہ محمد شاہ رنگیلا نے روپیہ دے کر نادر شاہ کو واپس کرنے کی کوشش کی۔ دہلی سے واپسی پر نادر شاہ تختِ طاؤس، کوہِ نور کا ہیرا اور شاہی خزانہ لے کر واپس ہوا۔ ایک عہد نامہ کے ذریعے نادر شاہ نے دریائے سندھ تک کا علاقہ محمد شاہ رنگیلا سے حاصل کر لیا۔ نادر شاہ کی حکومت کا دارالحکومت دراصل اس کے گھوڑے کی زین ہی تھی۔ تمام دوسرے فاتحین کی طرح نادر شاہ کی افواج میں افغانوں کی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔ احمد شاہ ابدالی اس کی فوج کے باڈی گارڈ دستے کا افسر تھا۔ قزلباشوں کے ہاتھوں نادر شاہ درّانی کے قتل کے بعد ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی حکمران بنا۔ بادشاہ بننے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے "دُرِّ دوران" کا لقب اختیار کیا، اسی وجہ سے اس کا خاندان درّانی مشہور ہوا۔ رفتہ رفتہ درّانیوں کی تمام سپاہ اور ان کے سرکاری کارندے درّانی مشہور ہو گئے، لیکن نادر شاہ قاچاریہ درّانی نہیں، بلکہ تورانی تھا۔ رفتہ رفتہ تورانی کا لفظ درّانی مشہور ہو گیا تھا اور عوام نادر شاہ کو تورانی کی بجائے درّانی پکارنے لگے تھے۔

ہندوستان پر نادر شاہ درّانی کے حملے سے سلطنتِ مغلیہ کا وقار ختم ہو گیا تھا۔ صوبیدار خود مختار ہونے لگے، مرہٹے اور یورپی اقوام کی تجارتی کمپنیاں مختلف علاقوں پر قابض ہونے لگیں اور تمام ہندوستان میں مسلمان مرہٹوں، سکھوں اور یورپی اقوام کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے لگے۔ ان حالات میں

حضرت شاہ ولی اللہؒ سمیت ہندوستان کے سرکردہ مسلمان رہنماؤں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر فوج کشی کی دعوت دی؛ چنانچہ پانی پت کے تاریخی میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی مدد سے احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ۱۷۶۱ء میں شکستِ فاش دی۔ اس لڑائی میں نواب وزیر اودھ اور حافظ رحمت خان روہیلہ نے عمدہ خدمات سرانجام دیں۔ برِصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کی یہ آخری فتح تھی۔ اگر ظہیرالدین بابر کی طرح احمد شاہ ابدالی بھی ہندوستان میں ایک سلطنت کی داغ بیل ڈال دیتا تو آج اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی، لیکن بدقسمتی سے وہ واپس افغانستان لوٹ گیا اور ہندوستان میں کوئی ایسی طاقت باقی نہ رہی جو اندرونی بغاوتوں پر قابو پا سکتی یا یوروپی اقوام کی پیش قدمی میں سدِ راہ بن جاتی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں ایک طرف مرہٹوں کی طاقت کمزور ہوئی، وہاں دوسری طرف سلطنتِ مغلیہ کا زوال بھی یقینی ہوگیا اور اس طرح میدان یوروپی اقوام بالخصوص انگریزوں کے غلبے کے لئے صاف ہوگیا۔ زمانِ ابدالی نے رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر بنا کر سکھوں کے عروج کا سامان تیار کر دیا۔ زمانِ ابدالی کی یہ وہ سیاسی غلطی تھی جس کا خمیازہ تمام مسلمانوں کو بہت بُری طرح بھگتنا پڑا۔

احمد شاہ ابدالی کے برسرِاقتدار آنے کے بعد میدانِ ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار کے علاقے میں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ درانیوں کا اصل مقصد کشمیر پر قبضہ کرنا تھا، جہاں ابھی تک مغل گورنر یا ان گورنروں کے بعض دوسرے رشتہ دار حکمرانی کر رہے تھے، چونکہ شاہراہِ کشمیر ولایتِ پکھلی سے ہو کر گزرتی تھی، اس لئے اس ولایت کو قبضہ میں لینا درانیوں کے لئے ضروری تھا جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس وقت پکھلی سرکار اور میدانِ ہزارہ قارلق کا علاقہ ترکوں کے زوال کے بعد بیسیوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہاں کوئی ایسی طاقت باقی نہ رہی تھی جو کسی طاقت ور بیرونی فوج کے حملے کا مقابلہ کر سکتی۔ عوام اپنے اپنے خوانین کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ملک کی معاشی حالت ابتر تھی؛ لہٰذا ان حالات میں ہمارے اس وقت کے خوانین نے درانیوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کی وفاداری کا دم بھرنا شروع کر دیا۔ انتظامی لحاظ سے درانیوں نے پکھلی سرکار کو کشمیر سے منسلک کر دیا اور میدانِ ہزارہ قارلق کو اٹک کے شامل کر دیا۔

درانیوں کی پیش قدمی کے زمانے میں میدانِ ہزارہ قارلق کے ترکوں کا سربراہ سلطان بے نام تھا۔ سلطان بے نام کا اصل نام غالباً آزاد خان تھا، لیکن اس نے اپنا تخلص یا لقب سلطان بے نام

اختیار کر رکھا تھا، اس لئے وہ عوام میں "بے ناماں راجہ" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ ترکوں نے سلطان بے نام کی قیادت میں شاہراہِ کشمیر پر درانیوں کی پیش قدمی روکنے کی ناکام کوشش کی۔ درانی فوج نے سلطان پور (ووڈ) اور مانکرائے کی اطراف سے ترکوں پر حملہ کر دیا۔ ترکوں نے موضع مگری بالا کے مقام پر درانیوں سے مقابلہ کیا، لیکن لڑائی کے دوران میں ان کا سردار سلطان بے نام شہید ہو گیا۔ اور انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان بے نام کا مزار اب تک موضع مگری میں موجود ہے۔ درانیوں نے مانکرائے، پھر ہاڑی اور نڑ تویہ کے مقامات پر ترکوں کی گڑھیوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ اس وقت ترکوں کے قبضہ میں میدانِ ہزارہ قارلق کے چوالیس دیہات تھے، جن میں سے اکثر ان سے چھین لئے گئے۔

طاہر خیلیوں کے سربلند خان، تریوں کے نجیب اللہ خان، گکھڑوں کے راجہ جعفر خان، تنولیوں کے زبردست خان اور سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ نے چونکہ درانیوں کی اطاعت تسلیم کر لی تھی؛ لہٰذا ان تمام خوانین کو انہوں نے اپنی طرف سے ان کے متعلقہ علاقوں میں اپنا عامل مقرر کر دیا۔ سربلند خان طاہر خیلی اور زبردست خان تنولی نے درانی فوج میں شامل ہو کر پانی پت کی لڑائی میں حصہ بھی لیا تھا، اس لئے احمد شاہ ابدالی نے زبردست خان کو صوبہ خان کا لقب دے کر علاقہ تناول کا حاکم مقرر کر دیا اور اسی طرح سربلند خان طاہر خیلی کو غازی اور حضرو کے درمیانی علاقے میں کافی زمین عطا کر دی۔ درانیوں کے اقتدار کا زمانہ ۱۷۴۷ء سے ۱۸۱۶ء تک کا ہے۔ اس عرصے میں ان کے قابلِ ذکر حکمران یہ تھے۔ احمد شاہ از ۱۷۴۷-۷۳ء تیمور شاہ از ۷۳-۹۳ء ۱۷۷۳ء شاہ زمان از ۱۷۹۳-۱۸۰۰ء شاہ محمود ۱۸۰۰-۱۸۰۳ء، ۱۸۰۹-۱۸ء شاہ شجاع از ۳۹-۱۸۰۳ء۔

درانیوں کا زمانہ مجموعی طور پر بدنظمی، انتشار اور بدامنی کا زمانہ تھا۔ ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار کے تمام علاقوں میں عوام نہ صرف درانی سرداروں بلکہ خود اپنے خوانین کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ درانیوں نے اپنے ان پسندیدہ خوانین کو ان کے اندرونی معاملات میں اپنی من مانی کرنے کے لئے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اس غیر منظم اور بے اصول حکمرانی کا نتیجہ ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور غنڈہ گردی کی صورت میں نمودار ہوا۔ شاہراہوں پر سفر کرنا دشوار ہو گیا۔ اشیائے ضرورت کی نقل و حمل میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ قانون کی حکمرانی ختم ہو گئی اور لوگوں سے بیگار لینے کا طریقہ زور پکڑ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ولایتِ پکھلی میں بلکہ پنجاب اور کشمیر کے جس جس علاقے میں بھی درانی گئے

لوٹ مار، تشدد اور لاقانونیت ان کے ساتھ گئی۔ لوگ ترکوں کے عہد کے پُرسکون اور خوشحال زندگی کے ماحول کو ترسنے لگے۔ سلطنتِ مغلیہ کے تقریباً سہ صد سالہ عہد میں تجارت اور صنعتِ حرفت کو بے مثال فروغ حاصل ہوا تھا، کسی بیرونی حملہ آور کو اس ملک پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ تھی۔ اب خوش حال اور پُرامن زندگی بسر کرنے کے عادی عوام بدامنی اور لاقانونیت کے اس نئے ماحول کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ ملا احمد کشمیری نے درانیوں کے پُرفتن دور کے مظالم کو اشعار کی صورت میں قلمبند کیا۔ ان کے چند اشعار نمونہ کے طور پر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

شد نے نغمہ کوچۂ فریاد — حرفِ اُفغان چو در میاں آمد
شورِ افغاں چوں بشنوم بے قیل — یادم آید ز صورِ اسرافیل
بسکہ پُر شور کار افغان است — شورِ محشر دیار افغان است
ایں زماں خاصۂ گوشۂ کشمیر — شد ز افغان چو نے بہ نالا اسیر
خواست حق کیں زمینِ مینا رنگ — چوں دلِ نے شود ز افغاں تنگ
داشت دُور از تصرفِ چفتہ — بے سَرو از تصرفِ چفتہ
کرد بر دے مسلط افغاں را — باغِ جمشید داد دیواں را
بُود ایں گل زمین سُلیماں باغ — شد ز دیواں کنوں سراسر داغ

ترجمہ: جب افغانوں کی بات درمیان آتی ہے تو سنبری کا نغمہ کوچۂ فریاد بن جاتا ہے یعنی انسان کی رُوح فریادی بن جاتی ہے۔

و جب میں بن کے افغانوں کا شور سنتا ہوں، تو مجھے اس سے صورِ اسرافیل یاد آنے لگتی ہے۔

و افغانوں کے معاملات شورش سے پُر ہوتے ہیں اور اُن کا ملک شورِ محشر بپا کر رہا ہے۔

و خصوصاً اس زمانے میں کشمیر کا علاقہ افغانوں کی وجہ سے یوں ہو گیا ہے گویا کہ نے نالہ کی اسیر ہو گئی ہے

و خدا کو یہی منظور تھا کہ یہ زمین مینا رنگ سنبری کے دل کی مانند افغانوں سے تنگ کر دی جائے

و اس لئے خدا نے اس زمین کو چغتائی ترکوں کے قبضے سے نکال کر بے سرو بنا دیا اور پھر خدا نے اس زمین پر افغانوں کو مسلط کر دیا، گویا کہ اس نے باغ جمشید کو دیووں کے حوالے کر دیا۔

و یہ زمین باغ سلیمان کی مانند گل رنگ تھی اور اب اسے دیووں نے داغ داغ کر ڈالا ہے۔

مُلّا احمد کشمیری کے ان اشعار میں مبالغہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ انہوں نے درانیوں کے عہد کی صحیح عکاسی کی ہے۔ یوں تو ہر انقلاب کے ساتھ تباہی لازمی طور پر ہوا کرتی ہے، لیکن جو انقلاب صدیوں کے جمے ہوئے نظامِ زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دے، وہ اپنے اندر ہلاکت خیزی کا وہ طوفان رکھتا ہے جو عام انقلابات میں نہیں ہوا کرتا۔ کہاں وہ سلطنتِ مغلیہ جیسی بے نظیر سلطنت کا پُرامن اور خوشحال زمانہ اور کہاں یہ پس ماندہ علاقے سے اٹھے ہوئے درانیوں کا بے کیف اور پُرفتن دور شاعرِ وقت نے ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے چغتائی ترکوں اور درانیوں کے ادوار دیکھے تھے۔ ترکوں کے زوال کے بعد حالات ایسے بدلے کہ لوگوں کو چاروں طرف تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ نظر آتا تھا۔ کسی مرکزی نظامِ حکومت کی عدمِ موجودگی میں جتنی کچھ بُرائیاں پیدا ہونی ممکن تھیں، وہ سب پچھلی سرکار اور ہزارہ قارلق میں پیدا ہو گئی تھیں۔

ان حالات میں رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ ایک نئی قوت بن کر نمودار ہوئے۔ زمان ابدالی نے رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر بنا کر سکھوں کو خود ہی حکمرانی اور تشدد کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ درانیوں کی باہمی چپقلش، ان کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے پنجاب، کشمیر اور سرحد کا تمام علاقہ انتشار کا شکار تھا۔ درانی حاکم اور ان کے منتخب خوانین جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل کرتے ہوئے باہم مُشت و گریبان تھے۔ سکھوں نے اپنی افواج میں گورکھا سپاہی بھی بھرتی کر لئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سکھ افواج کی تربیت اور رہنمائی کے لئے فرانسیسی افسروں کو اپنا ملازم رکھ لیا اور اس طرح سکھ افواج جدید ترین اسلحہ سے لیس ہو کر منظم ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سکھ افواج کے مقابلہ کے لئے موجودہ مغربی پاکستان کے علاقے میں کوئی طاقت موجود نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں سکھ تمام پنجاب پر قابض ہو گئے۔ ہزارہ قارلق اور پچھلی سرکار میں حالات سکھوں کی پیش قدمی کے لئے بڑے سازگار تھے۔ ہزارہ قارلق کے وہ خوانین جو درانیوں کے عروج کے زمانے میں ان کے منظورِ نظر تھے۔ اب حالات کے بدلتے ہی درانیوں کے مخالف بن گئے۔ درانیوں کے لئے اس میدان سے سالانہ لگان وصول کرنا محال ہو گیا۔

۱۸۰۳ء میں اٹک کے درانی حاکم نے لگان وصول کرنے کے لئے جب چھچھ کے ایک قاضی صاحب کو میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف روانہ کیا تو موضع سکندر پور میں ترینوں نے رات کی تاریکی

میں اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد دوسرے خوانین بھی درانیوں سے باغی ہو گئے۔ خوانین ہزارہ قارلق کی اس بغاوت کو کچلنے کے لئے درانیوں نے سمندر خان درانی کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔ موضع سری میں ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں اگرچہ درانی فتح مند رہے، لیکن فتح کے باوجود وہ نہ تو علاقے میں امن قائم کر سکے اور نہ ہی انہیں لگان وصول ہوا۔ ۱۸۱۵-۱۶ء میں ترکی پٹی مانکرائے کے ترک سرداروں کے مابین خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ قبل ازیں ترک سلطان بے نام کی قیادت میں درانیوں سے مگری کے مقام پر جب متصادم ہوتے تھے۔ اسی وقت سے ان کی حالت ابتر ہونی شروع ہو گئی تھی ترکی پٹی مانکرائے کے عنوان کے تحت ان کی خانہ جنگی کے حالات قدرے تفصیل سے بیان کئے جا رہے ہیں۔ یہاں اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ ہاشم خان ترک نے ۱۸۱۶ء میں کمال خان ترک کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد ترکی پٹی کا تنہا مالک بن بیٹھا۔ محمد خان ترین کے چونکہ کمال خان کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے؛ لہذا اس نے ہاشم خان سے کمال خان کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم اٹھائی۔ محمد خان ترین نے کمال خان کے بیٹے فتح خان کو موضع پھر ہاڑی میں ایک گڑھی تعمیر کرنے میں مدد دی اور پھر دونوں نے مل کر ہاشم خان پر حملہ کر دیا۔ ہاشم خان شکست کھا کر اٹک کے قلعہ میں سردار حکما سنگھ کے پاس چلا گیا اور اسے اپنی مدد پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح سکھ فوج کو مکھن سنگھ کی سربراہی میں میدانِ ہزارہ قارلق میں دخل انداز ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کتاب کی دوسری جلد میں اس دور کے حالات تفصیل سے بیان کئے جائیں گے۔

سکھوں نے ۱۸۱۸ء میں ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار کے تمام علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر دیا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ نے ۱۸۲۳ء میں ہری پور کا شہر آباد کیا اور اس میں قلعہ ہرکشن گڑھ تعمیر کروایا۔ محمد خان ترین کو قید کر کے قلعہ کرکے قلعہ کلر کہار میں بند کر دیا جہاں وہ قید ہی کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ بوستان ترین، محمد خان پدر پائندہ خان، جلال خان دلازاک، شیر محمد خان مشوانی اور شیخا جدون کے سر توپ سے اڑا دیئے گئے ہاشم خان ترک اور فتح خان ترک مفرور ہو کر علاقہ غیر میں روپوش ہو گئے۔ ترینوں اور ترکوں کی اراضیات کو دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سکھ اہل ہزارہ پر اس قسم کے ظلم و ستم ڈھانے میں مصروف ہی تھے کہ ہندوستان کے مرکز سے عین اس نازک اور ذلت آمیز دور میں تحریکِ مجاہدین اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ نے اس تحریک کی علمی بنیادوں کو استوار کیا اور پھر اٹھارہ برس کی تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بعد

سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ مجاہدین کی جماعت کو لے کر پہلے قندھار روانہ ہوئے اور پھر افغانستان سے ہوتے ہوئے درۂ خیبر کی راہ سے سرحدی علاقے میں داخل ہوئے۔ اس تحریک کا نصب العین تحریکِ پاکستان سے مختلف نہ تھا۔ مجاہدین کی جماعت میں بنگالی، بہاری مسلمان اکثریت سے شامل تھے۔ تحریکِ مجاہدین کے رہنماؤں کو یہ خوش فہمی تھی کہ پٹھان جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور اس طرح ان کی عسکری قوت میں وہ اضافہ ہو جائے گا جس کے زور سے وہ سکھوں اور انگریزوں سے جنگِ آزادی لڑ سکیں گے، مگر جب وادیٔ پشاور میں انہوں نے اسلامی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تو لوگ انہیں اپنے رواج کے خلاف پا کر ان کے مخالف بن گئے۔ سُود خوری، دُختر فروشی اور علماء کے وظائف بند کر دینا اگرچہ شرعی لحاظ سے ضروری تھا، لیکن عوام کو ذہنی طور پر ان اصلاحات کو قبول کرنے پر آمادہ کئے بغیر اصلاحات کا چکر چلانا تحریک کے لئے مضر ثابت ہوا۔ ادھر تحریک کے مخالف علماء نے تحریک کے رہنماؤں کے خلاف "وہابی" ہونے کا بھی فتویٰ داغ دیا۔ ممکن ہے کہ اس تحریک کے رہنماؤں سے کچھ علمی غلطیاں یا لغزشیں سرزد ہوئی بھی ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی مخالفت کا فائدہ سکھوں اور انگریزوں ہی کو پہنچا۔ پٹھان تحریک کے بالمقابل اُٹھ کھڑے ہوئے اور تحریک کے رہنماؤں کو ان کے خلاف کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ "مکئی کوٹنے" کے منصوبے نے مجاہدین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ مولانا غلام رسول مہر نے تفصیل کے ساتھ وہ تمام واقعات بیان کر دیئے ہیں جو بالآخر سانحہ بالاکوٹ کا سبب بنے۔ ہزارہ میں نواب پائندہ خان تنولی کی مخالفت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کاغانیوں کی جاسوسی کا کردار تحریکِ مجاہدین پر آخری ضرب قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دور میں صرف یہی تحریکِ مجاہدین تھی جس کی منظم جماعت مسلمانوں کی آزادی اور غلبۂ دین کی کامیاب جدوجہد کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی مخالفت کر کے مسلمانوں نے خود اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی چلائی۔ مجاہدین ۱۸۳۳ء میں بالاکوٹ کے مقام پر جامِ شہادت نوش کر کے خدا کے حضور سرخرو ہوئے۔ اہلِ سرحد اور اہلِ ہزارہ نے سکھوں اور پھر انگریزوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ محسن کُش لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کیا ہونا تھا۔

حضرت میاں کنگال صاحبؒ

آپ کا اصل نام شہزادہ گل محمد تھا۔ آپ دہلی کے شاہی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی ولادت اور ابتدائی زندگی سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں گزری۔ شاہی گھرانے کے دوسرے افراد کی طرح آپ کی ابتدائی زندگی بھی امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے بسر ہوئی۔ مشہور روایت کے مطابق ایک بار آپ کا گزر میرزا مظہر جانِ جاناں کے کوچے سے ہوا اور آپ نے ان کی صحبت اختیار کرلی۔ یہ میرزا مظہر جانِ جاناں ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ آپ نے طریقِ امیری ترک کرکے طریقِ فقیری اختیار کرلیا۔ کہتے ہیں کہ آپ کا سلسلۂ سلوک و بیعت حضرت شیخ احمد سرہندی مجددِ الف ثانیؒ تک پہنچتا تھا۔ حضرت مجددِ الف ثانیؒ نقشبندی سلسلے کے بزرگ تھے۔ علماء کی اکثریت نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو ہزارویں صدی کا مجدد اور امام العصر تسلیم کیا ہے۔ یہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ہی کی جدّ و جہد کا نتیجہ تھا کہ شہنشاہِ اکبر کا دینِ الٰہی ختم ہوگیا، اور اصلی دینِ الٰہی پہلے کی طرح دوبارہ ہندوستان میں غالب ہوگیا۔ وحدۃ الوجود کے پُرپیچ فلسفے کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے آپ ہی نے وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا تھا اور اس طرح زبانِ تصوف پر ہمہ اوست کی بجائے ہمہ از وست کا کلمہ جاری ہوگیا تھا۔ اگرچہ سلسلۂ نقشبندیہ میں منازلِ سلوک کو اتباعِ سنت ہی کے طریقے سے طے کیا جاتا ہے، لیکن حضرت میاں کنگال صاحبؒ اپنی مخصوص باطنی صلاحیتوں کی وجہ سے اکثر غلبۂ حال اور جذب کی کیفیات میں مبتلا ہوجاتے تھے۔ انہی کیفیات کے زیرِ اثر آپ نے نہ صرف امیرانہ ٹھاٹھ کو ترک کیا، بلکہ آپ دہلی سے ہجرت کرکے ولایتِ پکھلی کی طرف روانہ ہوئے اور یہاں میاں کنگال صاحبؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ اگرچہ ترکوں کے زوال کا دور تھا؛ تاہم پکھلی سرکار کی معتدل آب و ہوا اور معاشرتی ماحول

اپنے اندر عجیب کشش رکھتا تھا۔ حضرت میاں کنگال صاحب چلتے چلتے مانگلی کے اہم شہر اور تجارتی مرکز تک آن پہنچے۔ آپ نے اپنی شہزادگی کو عوام سے چھپایا اور مانگلی کے شہر میں اسی مقام پر سکونت اختیار کرلی جہاں اب آپ کا مزار ہے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ تھی اور شاہراہِ کشمیر پر سے گزرنے والے مسافروں اور تجارتی قافلوں کا گزر اسی پُرفضا مقام سے ہوا کرتا تھا۔ آپ اپنی باطنی کیفیات کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کے لئے انتہائی ضبط سے کام لیا کرتے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کو کسی بندے کی کرامت یا اس کی کرامت کے ذریعے عوام کی اصلاح منظور ہوتی ہے تو انتہائی ضبط کے باوجود کچھ نہ کچھ فرق عادات احوال و واقعات ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں؛ چنانچہ کبھی کبھی آپ پر غلبۂ حال کا اثر ہو جاتا۔ صحو و سکر کے حالات ظہور پذیر ہو جاتے اور آپ کا تعلق باللہ کشوف و کرامات کے ذریعے ظاہر ہونے لگتا۔ ایسی ہی کیفیات سے گزرتے ہوئے آپ صاحبِ ارشاد بن گئے۔ آپ کی خانقاہ مرجعِ خاص و عام بن گئی۔ ظاہری فیض کے ساتھ ساتھ آپ کے باطنی فیض کا چشمہ بھی مانگلی کے اسی پُرفضا مقام سے جاری ہو گیا۔

آپ نے اپنی آنکھوں سے ترکوں کے زوال اور درانیوں کے عہد کے پُرفتن حالات کا مشاہدہ کیا۔ اسی زمانے میں والئ پکھلی سلطان محمود خورد کے خاندان کی ایک ترک عورت اپنے دو معصوم بچوں سمیت پکھلی خاص سے چل کر علاقہ دھنتوڑ کی طرف آ رہی تھی۔ جب یہ تباہ حال عورت آپ کی خانقاہ کے پاس پہنچی تو اُس نے کچھ دیر کے لئے وہاں قیام کیا۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی بجائے اس عورت نے گھاس پھوس کے کچھ پتے لئے اور ایک ہنڈیا پر چڑھا کر انہیں اپنے بھوکے بچوں کو کھلانے کے لئے اُبالنا شروع کر دیا۔ حضرت میاں کنگال صاحب یہ منظر دیکھ کر اس عورت کے قریب گئے۔ آپ کو اس کی پریشان حالی پر رحم آیا اور آپ اس کے بچوں کو کھانے کھلانے کے بعد اسے اپنے ہمراہ لے کر علاقہ دھنتوڑ کی طرف آگے چلے۔ چلتے چلتے آپ اس عورت کو دھنتوڑ سے بھی آگے موضع موہار کلاں میں لے گئے اور ایک خالی مکان میں جا کر آپ نے اسے وہیں سکونت پذیر ہونے کی ہدایت کی اور خود واپس مانگلی لوٹ گئے۔ موضع موہار کلاں دراصل گوجروں کا گاؤں تھا، مگر وہ حسبِ عادت اسے خالی کر کے بلند چوٹیوں کی طرف چلے گئے تھے۔ چند روز بعد اس ترک عورت کو اپنے ترک رشتہ دار مل گئے۔ وہ بھی پریشان حال تھے، اس لئے اس عورت کی دعوت پر وہ بھی اسی گاؤں میں آباد ہو گئے۔ آج اس عورت کی اولاد کثرت سے اس گاؤں میں آباد ہے۔

روایت ہے کہ ایک بار مانگلی کے کسی مقتدر آدمی نے آپ کی مجلس میں بیٹھ کر آپ سے گستاخانہ کلام کی جس پر آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "مانگلی تباہ خواہد شُد" یعنی مانگلی تباہ ہو جائے گی۔ اس کے تقریباً چھتیس برس بعد آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ سردار ہری سنگھ نلوہ نے ۱۱۹۸ھ میں حملہ آور ہو کر مانگلی کے شہر کو آگ لگا دی اور سارا شہر چند گھنٹوں میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ آگ کے دوران ہی میں لوٹ مچی اور اس طرح دس ہزار نفوس کی آبادی کا یہ خوبصورت شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ حضرت میاں کنگال صاحب ۱۷۸۲ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار اسی جگہ واقع ہے جہاں آپ کی خانقاہ اور مسجد تھی۔ آپ کے مزار کے علاوہ مانگلی کے قدیم شہر کے آثار اب باقی نہیں رہے۔ اہل ہزارہ میں آپ کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب بھی بیسیوں افراد ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور نہایت ابتر حالات میں بھی لوگوں نے آپ کے مزار کو محفوظ رکھا ہے۔

٭

مشہور شہر اور قلعے

گلی باغ:

گزشتہ اوراق میں تاریخی حوالہ جات کی روشنی میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۳۹۸-۹۹ء میں ہندوستان فتح کرنے کے بعد امیر تیمور نے قرلق ترکوں کی ایک ہزارہ منگ یعنی پلٹن کو ولایت پکھلی کی حفاظت کے لئے پکھلی خاص میں متعین کیا تھا اور میدان ہزارہ قارلق اسی ہزارہ منگ کو جاگیر کے طور پر

نقشہ گلی باغ،

عطا کر دیا تھا۔ موسم، آب و ہوا اور دفاعی نقطۂ نظر سے یہ علاقہ توران کی سرد آب و ہوا میں پلے ہوئے ترکوں کی آبادکاری کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ اس علاقے میں شنکیاری، بیدادی اور مانگلی جیسے قدیم قصبے موجود تھے۔ راجہ رسالو، منگل اور مان سنگھ جیسے راجے اس علاقے کے حکمران رہ چکے تھے؛ لہٰذا آمد و رفت اور رہائش کی جملہ سہولتیں میسر تھیں۔ ۱۴۹۰ء کے لگ بھگ جبکہ توران خانہ جنگی کا شکار تھا۔ ابوسعید سلطان کا ایک پوتا بابر میرزا ولایت پکھلی میں داخل ہوا اور یہاں پہلے سے موجود تیموری قلمرو کے ان افسروں نے اپنے اس شہزادے کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ بابر میرزا نے شہاب الدین کا لقب اختیار کیا اور ولایتِ پکھلی کا پہلا آزاد حکمران بنا۔ چونکہ شہاب الدین بابر توران کے دارالحکومت سمرقند جیسے شہر میں زندگی کا ایک حصہ بسر کر چکا تھا؛ لہٰذا اس نے اسی نمونے پر گلی باغ دارالریاست تعمیر کروایا۔

گلی باغ دراصل ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ یہ چھاؤنی موجودہ تحصیل مانسہرہ کے مشہور قصبہ بفہ سے بمشکل ایک میل کے فاصلہ پر ندی سرن اور کوہِ ٹنگلائی کے درمیان ایک ایسی بلند سطح پر تعمیر کی گئی، جہاں سے تمام پکھلی کا میدان بخوبی نظر آسکتا تھا۔ اس چھاؤنی کی پشت پر شمال کی جانب ایک پہاڑی سلسلہ تھا جو نہ صرف دفاعی ضرورت کو پورا کرتا تھا، بلکہ اس سے چھاؤنی کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ چھاؤنی کے سامنے سے ندی سرن بہتی تھی جس سے آگے میدانِ پکھلی شروع ہو جاتا ہے۔ مشرقی جانب موضع اچھڑیاں کے قریب سے ندی سرن سے ایک نہر کاٹ کر چھاؤنی میں پہنچائی گئی۔ یہ نہر ٹنگلائی کی پہاڑی کے دامن سے گزرتی ہوئی چھاؤنی کے عین وسط میں جا کر ایک وسیع تالاب میں گرتی تھی۔ پھر تالاب میں سے بل کھاتی ہوئی قلعہ فیروزہ میں داخل ہو جاتی۔ قلعہ کی خندق سے گزر کر بالآخر یہ نہر دوبارہ ندی سرن میں داخل ہو جاتی۔ اس نہر کے ان نالوں پر جندر بھی تعمیر کئے گئے، تالاب میں فوارے لگائے گئے۔ اس تالاب کے نشانات اور کچھ جندروں کے پتھر اب بھی موجود ہیں۔ یہ نہر گلی باغ کے مکینوں کی بہت سی ضروریات کو پورا کرتی تھی، وہ اس کے پانی کو آبپاشی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جہانگیر بادشاہ نے اسی جگہ کے مختلف پھلوں کا ذکر توزکِ جہانگیری میں کیا ہے۔ چھاؤنی کی خوبصورتی بڑی حد تک اسی نہر کے پانی کی وجہ سے تھی۔ جہانگیر کے بیان کے مطابق اس علاقے میں آڑو، خوبانی، امرود اور شفتالو کے پھل بکثرت پائے جاتے تھے۔ آج بھی ٹنگلائی کی پہاڑی کے دامن سے نکلنے والے میٹھے پانی کے چشمے اور قلعہ کے اردگرد پائے جانے والے ٹھنڈے پانی کے کنوئیں اس قدیم شہر اور چھاؤنی

کے علاقے کو ایک حسین سبزہ زار بنائے ہوتے ہیں۔

گلی باغ کے جنوب مغرب میں ہاتھی فوج کا کیمپ لگا کرتا تھا۔ اسی فوج کی نسبت سے اب اس مقام پر ہاتھی میرہ کا موضع آباد ہے۔ کشمیر جاتے ہوئے شاہی کیمپ اسی مقام پر لگایا جاتا تھا۔ گلی باغ کے مشرق میں تقریباً سات میل کے فاصلے پر بیدادی کا قدیم شہر آباد تھا۔ اس کے مغرب میں تقریباً سات میل کے فاصلے پر خاکی کا گاؤں تھا۔ خاکی سے ایک شاہراہ اوگی اور تناول کے علاقے کی طرف نکلتی تھی۔ گلی باغ کے مندرجہ بالا نقشے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس چھاؤنی کو مختلف شاہراہوں کے ذریعے کشمیر، تناول، دہمتوڑ، مانگلی وغیرہ جیسے اہم علاقوں سے ملا دیا گیا تھا۔

گلی باغ کا قلعہ فیروزہ ہندوستان کے اکثر قلعوں کے نمونے پر تیار کیا گیا۔ اس کی تعمیر میں وہی اینٹ، پتھر اور چونا استعمال کیا گیا جو اس دور کے قلعوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ قلعہ کے مقام سے تقریباً چھ میل غربی جانب موضع سکندرہ میں اینٹوں کے خاص بھٹے لگائے گئے۔ پورے چھ میل کے فاصلے پر آدمیوں کی ایک لمبی قطار کھڑی کی گئی اور اسی طرح تمام اینٹیں ہاتھوں ہاتھ سکندرہ سے قلعہ کے مقام تک پہنچا دی گئیں۔ قلعہ کا دیوانِ عام عدالت کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں بیٹھ کر سلاطینِ پکھلی بعض مقدمات کا فیصلہ بذاتِ خود کیا کرتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں دیوان راجہ بابا کو سلطان نے پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ اب یہاں دیوان راجہ بابا کا مزار موجود ہے۔ اسی مزار کے تقدس کی وجہ سے قلعے کا یہ حصہ تباہی سے بچ گیا۔ مزار کے قریب اب بھی اس بارہ دری کے کھنڈرات موجود ہیں جہاں سلاطینِ پکھلی آرام فرمایا کرتے تھے۔ بارہ دری کے اردگرد ایک وسیع صحن تھا اور صحن کے گرد خندق تھی جس میں نہر کا پانی بل کھاتا ہوا آگے ندن سرن میں داخل ہو جاتا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اکبر اور اور جہانگیر جیسے عظیم شہنشاہ سلاطینِ پکھلی کے ذاتی مہمان ہوا کرتے تھے۔ یہیں ان حکمرانوں کے درمیان تحفوں کے تبادلے ہوا کرتے اور سُر کے جام نوش کئے جاتے تھے۔ چونکہ توزکِ جہانگیری میں شہنشاہوں کی دعوتوں اور تحفوں کے تذکرے موجود ہیں؛ لہٰذا ان کی تاریخی حیثیت کسی صورت مشتبہ نہیں ہو سکتی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ روٹی اور چاول سے ایک بوزہ (شراب) تیار کیا کرتے تھے، جسے سُر کہا جاتا تھا۔ سُر کو مٹکوں میں ڈال کر ان کے مونہوں کو مضبوطی سے باندھ دیا جاتا تھا اور پھر اسے دو دو تین تین سالوں تک مسلسل گھروں میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہر مٹکے کے منہ سے پانی نتھار

لیتے تھے اور اسے آچھی کہا جاتا تھا۔ یہ جتنی پرانی ہوتی، اتنی ہی لذیذ ہوتی۔ سُرکے نشے میں اضافہ کرنے کے لئے اس میں بھنگ بھی ملا دی جاتی تھی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ سلطان حسین خان والیٔ پکھلی کا والد سلطان محمود (کلاں) سُرکے دو پیالے پی جاتا تھا۔ خود جہانگیر نے بھی سلطان حسین خان کے ساتھ اسی مقام پر سُرنوشی فرمائی۔ اس زمانے میں اہلِ پکھلی کا یہ ایک پسندیدہ مشروب تھا۔ قلعہ فیروزہ کے قریب ہی ایک عیدگاہ تعمیر کی گئی تھی جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ ٹنگلائی کی پہاڑی کے دامن سے متعدد چشمے اہلِ گلی باغ کو میٹھا پانی مہیا کرتے تھے۔ آٹھ دس گز کے فاصلے پر کنوؤں کا پانی نکل آتا تھا۔ اب بھی ان چشموں اور کنوؤں کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی وافر مقدار میں قدیم قصبے کے بیچوں بیچ بہہ رہا ہے۔

گلی باغ کی چھاونی کا رقبہ تقریباً ۳ × ½ ۴ میل تھا۔ اس کی مشرقی سمت میں اسپ سوار فوج رہتی تھی۔ ندی سرن سے آگے ہاتھی میرہ کے مقام پر ہاتھی فوج کا کیمپ تھا۔ اس چھاونی کی تعمیر و ترقی میں ہر سلطان نے مقدور بھر حصہ لیا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد یہ بارہ ہزار نفوس کی آبادی کا ایک دو منزلہ شہر بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پشاور اور سرینگر کے تمام درمیانی علاقے میں یہ واحد گنجان آباد اور خوبصورت ترین دو منزلہ شہر تھا۔ یہ وہی چھاونی تھی جس سے نکل کر ترک افواج کشمیر، تناول، ہزارہ قارلق کے علاقوں میں دادِ شجاعت دیتی رہیں۔ یہیں سے نکل کر سلطان شادمان خان نے وادیٔ پشاور، بلخ، بدخشاں اور قندھار تک کے دُور دراز علاقوں میں شاندار فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا۔

ولایتِ پکھلی کے اس دارالریاست کی خوبصورتی کا تصور اس کی جائے وقوع کو دیکھ کر ہی ذہن میں لایا جا سکتا ہے۔ وہ منظر کتنا دل کش اور حسین ہوتا ہوگا، جبکہ قلعہ گلی باغ کے وسیع صحن سے اکبر، اور جہانگیر کی شاہی سواری اور ان کے علمبردار، رایاتِ ہمایونی کو بلند کئے ہاتھی میرہ کے شاہی کیمپ سے گلی باغ کی سمت حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہوں گے۔ جب سرن اور کوہِ ٹنگلائی کی درمیانی شاہراہ پر دونوں طرف ترک چابک سوار اور چوب دار رنگ برنگی استقبالیہ وردیوں میں ملبوس شہنشاہ کے استقبال کے لئے دو طرفہ کھڑے ہوئے باادب باملاحظہ ہوشیار کی صدائیں بلند کرتے ہوں گے۔ وہ محفلیں کتنی باوقار اور پُرشکوہ ہوں گی جن میں آلِ تیموریک جا رونق افروز ہوتی ہوں گی، جبکہ شہنشاہ اور فرمانروائے پکھلی کے مابین تحفوں کے تبادلے ہو رہے ہوں گے اور نگاہوں کے سامنے شاہی کیمپ کے خیمے اور ان کے رنگ برنگ جھنڈے تختۂ گل بنے دکھائی دیتے ہوں گے۔

سترھویں صدی کے آخر میں جب ترکوں کے عروج کا ستارہ غروب ہونے لگا تو ان کے درمیان تباہ کن خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ بالخصوص سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ کی بغاوت کے زمانے میں گلی باغ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ ترک سلاطین زادوں کی درخواست پر اگرچہ شاہی فوج نے مبارز الدین خان گکھڑ کی کمان میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے سلطان مقرب خان کی بغاوت کو فرو کر دیا، مگر ان لڑائیوں میں ترکوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہا۔ مختلف سلاطین زادے چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قابض ہو کر عوام پر ظلم و تشدد کے ذریعے حکمرانی کرنے لگے۔ عوام ان کی زیادتیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا سوات سے چار ہزار افراد کا ایک لشکر تیار کر کے پکھلی پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت قلعہ گلی باغ میں سلطان محمود والی پکھلی کے صرف دو چھوٹے بیٹے مرید خان اور عاقل خان ہی موجود تھے۔ سید جلال بابا کا پرانا ساتھی مراد خان ان کے معتمد خاص کے طور پر معاملات چلا رہا تھا؛ لہٰذا سید جلال بابا نے بغیر کسی مزاحمت کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور دونوں سلاطین زادے خواتین حرم کو ہمراہ لے کر مراد خان کے مشورے کے مطابق قلعہ سے نکل گئے۔ جب قلعہ پر سید جلال بابا کا قبضہ ہو گیا تو اہلِ گلی باغ نے سواتی لشکر کا مقابلہ شروع کیا، مگر انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ لڑائی کے دوران میں گلی باغ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس کی املاک کو لوٹ لیا گیا اور تمام شہر تباہ و برباد ہو گیا۔

آج بھی قلعہ گلی باغ کے عین سامنے ترکوں کا پرانا قبرستان موجود ہے۔ اس کے مقبرے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس میں گلی باغ اور اس کے ان مقبروں کے بارے میں آج سے ایک سو برس قبل یہ الفاظ لکھے گئے:

"[1] یہ جگہ (گلی باغ) ترکوں کی دارالریاست تھی، اسی جگہ پر جلال الدین اکبر بادشاہ و جہانگیر بادشاہ ان کے مہمان ہوتے تھے جس کا حال توزکِ جہانگیری میں درج ہے اور خاص ترکوں کے مقبرے تھے اور وہ اب خراب اور ویران ہو گئے ہیں؛ البتہ زیارت دیوان راجہ فقیر محمد کی جو ترکوں کے وقت تھا، اب تک موجود ہے اور متبرک سمجھی جاتی ہے۔"

میں نے گلی باغ کی سیر و سیاحت کے دوران میں ان مقبروں میں سلاطینِ پکھلی کی قبروں کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش کی، مگر کسی کا نشان نہ پایا، بہرحال اتنا سبھی جانتے تھے کہ ترکوں کے اس گلستان کے

---

[1] تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس صفحہ ۳۹۲

نامور مکین شہاب الدین بابر، فقیر الدین دریا خان غیاث الدین عبداللہ خان، سلطان محمود کلاں، نصیر الدین حسین خان اور سلطان شادمان خان جیسے بہادر اور نامور سلاطینِ پکھلی یہیں دفن ہیں۔ دیوان راجہ بابا کے مزار کے پاس ہی سنگ مرمر کے ایک ہی بڑے ٹکڑے سے ایک خوبصورت قبر تیار کروا کر سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی نے اپنے لئے رکھی ہوئی تھی، لیکن اسے اس قبر میں دفن ہونا نصیب نہ ہوا، کیونکہ وہ یہاں سے عالمگیر بادشاہ کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوا تھا اور پھر وہاں سے واپسی پر سرحدی علاقے میں بغاوتوں کو فرو کرتے ہوئے شہید ہوا۔ آج دیوان راجہ بابا کے گدی نشینوں کے علاوہ گلی باغ میں ترکوں کا کوئی خاندان نہیں۔

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (القرآن)

ترجمہ: وہ کتنے ہی باغات اور چشمے اور ہری بھری کھیتیاں چھوڑ گئے اور اس طرح ہم نے ان کی بجائے دوسری قوم کو ان تمام چیزوں کا وارث بنا دیا۔

بیدادی:

یہ قصبہ گلی باغ کی چھاؤنی سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ صدیوں تک یہ خرید و فروخت کی سب سے بڑی منڈی بنا رہا۔ مشہور روایت ہے کہ ہندو دور میں ایک جٹا شاہ نامی ہندو نے اوّل اوّل اس قصبے کو آباد کیا تھا۔ یہ ہندو راجہ بڑا ظالم تھا، اس لئے اس کے مظالم کی وجہ سے لوگوں نے اس کے دارالحکومت کو بیداد نگری مشہور ہو گیا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ ویس کا بیان ہے کہ ہندو دور میں بیدادی اس علاقے کا گنجان آباد شہر تھا۔ بیدادی سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر شنکیاری کا قصبہ تھا جس میں راجہ رسالو سکونت پذیر تھا۔ راجہ رسالو آج سے تقریباً سترہ سو برس سے پہلے ولایت حکمران تھا۔ اسی کے نام سے ایبٹ آباد کے قریب ایک بلند چوٹی پر ایک غار بھی موجود ہے جسے لوگ "راجہ رسالو دی کلاں" یعنی راجہ رسالو کی غار پکارتے تھے۔ ہزارہ کے مختلف مقامات پر راجہ رسالو کے نام کے پتھر پائے جاتے ہیں۔ اس کی بیوی رانی کوکلاں اور اس کے پہرے دار کڑلو یا کلڑ کے رومان کی داستان اب بھی ہزارہ کے عوام میں زیر بحث رہتی ہے۔

۱۳۹۹ء میں امیر تیمور کی متعین کردہ ہزارہ منگ کے ترک افسروں نے اوّل اوّل اسی شہر کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا، بعد میں گلی باغ کی تعمیر کے بعد اگرچہ اس کی اہمیت کم ہوگئی؛ تاہم تسخیر گلی باغ کے زمانے تک یہ ایک گنجان آباد شہر تھا۔ اس میں ترکوں کی عدالتیں اور سرکاری دفاتر موجود تھے۔ جب ۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا کے سواتی لشکر نے گلی باغ کی چھاؤنی پر قبضہ کرلیا، تو اس کے فوراً بعد سواتیوں کی دوسری یلغار بیدادی پر ہوئی۔ جو ترک اس میں موجود تھے، وہ دور دراز کے علاقوں میں منتشر ہوگئے۔ شہر میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ اہل شہر نے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کی، عام لوٹ کے بعد شہر کو تباہ و برباد کردیا گیا۔ جب حالات معمول پر آئے تو ترکوں کے دو افراد مسمیان عیسیٰ خان اور غازی خان نے اس اُجڑے شہر کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی، مگر انہیں زیادہ دیر تک یہاں رہنا نصیب نہ ہوا، کیونکہ جب پنجغول اور پنج میرال سواتیوں نے باہمی دیشی طریقے کے مطابق دیہات تقسیم کئے تو انہوں نے ان دونوں ترکوں کو اس جگہ سے نکال دیا۔ موجودہ زمانے میں اگرچہ اسی مقام پر بیدادی نام کا ایک موضع موجود ہے، لیکن اس کی مرکزیت عرصۂ دراز سے ختم ہوچکی ہے اس کا پڑوسی قصبہ شنکیاری اس سے زیادہ گنجان آباد ہے۔

چھانجل یا چھاچھل:

بعض کتابوں میں چھانچل کے گاؤں کا نام چینجیل بھی لکھا گیا ہے۔ یہ گاؤں دراصل اس قلعے کی وجہ سے مشہور تھا جو ترکوں نے دریائے سندھ کے کنارے کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ تحصیل بٹگرام کے علاقے میں دریائے سندھ سے چند میل کے فاصلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ ولایت پکھلی کی آخری چوکی کا کام دیتا تھا۔ دریائے سندھ کی دوسری جانب سواتی، تنولی اور یوسف زئی قبائل آباد تھے۔ علاقہ یوسف زئی سے پکھلی اور کشمیر جانے والے مسافر اسی راستے سے گزرتے تھے۔ تقریباً تین سو برس تک ترک اسی قلعہ سے اپنی سرحد کی پاسبانی کرتے رہے۔ ۱۶۶۶-۶۷ء میں اسی قلعہ کا آخری ترک فوجدار شمشیر خان تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ والیٔ پکھلی سلطان محمود اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یوسف زئیوں نے پانچ ہزار کی تعداد میں دریائے سندھ کو عبور کرکے اس قلعہ پر حملہ کردیا تھا۔ یہ ایک اچانک حملہ تھا اور شمشیر خان کو پکھلی خاص سے کوئی مدد

نہ مل سکی، اس لئے یوسف زئیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ شمشیر خان نے اس واقعہ کی اطلاع گلی باغ اور اٹک بھجوائی جس کے نتیجے میں شاہی افواج حرکت میں آگئیں اور یوسف زئیوں کو واپس لوٹنا پڑا۔ اس قلعہ کے قریب اب بھی ایک بڑا پتھر پڑا ہوا ہے جسے لوگ ہندکو زبان میں شمشیر گٹ یعنی شمشیر خان کا پتھر پکارتے ہیں۔ جب سواتی اور تنولی باشندے پکھلی خاص اور تناول کے اہم علاقوں پر قابض ہو گئے تو اس کے بعد چھالنجل کی اہمیت ختم ہو گئی۔

دربند:

شہاب الدین بابر والیٔ ولایتِ پکھلی نے اپنے ابتدائی دور میں چند نئے قصبے اور قلعے تعمیر کروائے ان میں سے ایک دربند تھا۔ توران کے دریائے وخش کے قریب صوبہ قوازیان تھا، اس صوبے کے دارالحکومت راشٹ سے دو دن کی مسافت کے فاصلے پر دربند کا قصبہ سڑک کے کنارے آباد تھا۔ اسی دربند کی یاد تازہ رکھنے کے لئے دریائے سندھ کے کنارے دربند کا قصبہ اور قلعہ تعمیر کیا گیا۔ دربند کا قلعہ موجودہ قصبہ کی پچھلی سمت میں پہاڑی کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعہ کا مقصد بھی چھالنجل کے قلعے کی طرح دریائے سندھ کے کنارے کی حفاظت کرنا تھا۔ تنولی قوم کے چار ہزار افراد اسی مقام سے ۱۷۷۲ء کے قریب مولوی ابراہیم لودھی کی سرکردگی میں دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ تناول میں آگے بڑھ آئے تھے؛ لہٰذا شہاب الدین بابر نے اپنی حکمرانی کے آغاز ہی میں دربند کا قصبہ آباد کرنے اور اس میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کو ضروری خیال کیا۔ مہابن کے علاقے کے لوگ عموماً اسی راستے سے ولایتِ پکھلی کے علاقے کے ساتھ آمد و رفت کرتے تھے۔ دربند کے قلعہ کی تعمیر کے بعد یہ راستہ محفوظ ہو گیا اور اس کے بعد تقریباً دو سو برس تک اس راستے سے کسی قبیلے کو ولایتِ پکھلی کی حدود میں پیش قدمی کی جرأت نہ ہو سکی، مگر ترکوں کی خانہ جنگی کے بعد جب سید جلال بابا نے ۱۷۱۳ء میں گلی باغ پر سواتی لشکر کی مدد سے قبضہ کیا تو اسی زمانے میں علاقہ مہابن سے تنولیوں کی کثیر تعداد دریائے سندھ کو عبور کر کے دربند کے قصبے اور قلعے پر قابض ہو گئی؛ چونکہ ترک خانہ جنگی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی سرحد کا دفاع نہ کر سکے اور تنولی مزید پیش قدمی کرتے ہوئے پکھلی خاص کے علاقے کی طرف آگے بڑھ گئے۔ قلعہ دربند کی اسی اہمیت کی وجہ سے نواب پائندہ خان تنولی اور سکھوں میں بھی ایک عرصہ

تک کشمکش ہوتی رہی۔ انگریزوں کے عہد تک دربند سوات اور باجوڑ تک علاقوں کے ساتھ تجارت کے لئے ایک اہم منڈی کا کام دیتا تھا۔

شیروان :

درحقیقت شیروان کا قصبہ بخارا کے علاقے میں بام کٹھ کے قریب واقع تھا۔ علاوہ ازیں توران کے علاقے میں شیر کٹھ نام کا ایک موضع بھی موجود تھا جو نصیف کے قریب واقع تھا۔ اسی شیروان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ترکوں نے شیروان نام کا ایک قصبہ علاقہ تناول میں آباد کیا۔ شیروان میں دوسرے اہم قصبوں کی طرح ایک قلعہ بھی تعمیر کیا گیا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کا بیان ہے (صفحہ ۳۸۳) کہ ترکوں کے عہد میں ایک شیروان نامی ترک نے یہ قصبہ آباد کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکوں میں شیروان نام کے افراد پائے جاتے تھے، لیکن جیسا کہ ترکوں کے عہد کے دوسرے قصبوں کے ناموں سے معلوم ہو رہا ہے۔ ترکوں نے یہ قصبہ بھی اپنے ملک توران کے قصبہ شیروان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے تعمیر کیا تھا۔ یہ قصبہ علاقہ تناول کا مرکزی مقام تھا اور اس کا حاکم عموماً والئ پکھلی کے بھائیوں میں سے کوئی ایک سلطان زادہ ہوا کرتا تھا۔ ترکوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں اس کا حاکم والئ پکھلی سلطان محمود خورد کا بھائی سلطان قیاس الدین تھا۔ شیروان کے قصبے کو دربند، دمتوڑ اور مانگل کے اہم مقامات سے ملا دیا گیا تھا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کے دورِ زوال میں تنولیوں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے پیش قدمی شروع کی اور ترکوں سے شیروان سمیت تمام تناول کا علاقہ چھین لیا۔ سلطان قیاس الدین کی وفات کے بعد اُس کی اولاد نے تنولیوں سے کشمکش جاری رکھی، لیکن ترکوں کے پاس بمشکل موضع بجالی اور اس کے گردونواح کے تقریباً آٹھ دیہات باقی بچے۔ اب بھی سلطان قیاس الدین کی اولاد ان مواضعات میں آباد ہے۔ سکھوں کے عہد تک شیروان کو اس علاقے میں بڑی اہمیت حاصل رہی، لیکن جب سے کیپٹن ایبٹ نے ایبٹ آباد کا قصبہ آباد کیا۔ شیروان کی اہمیت کم ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ شیروان کے قلعے کے آثار مٹ گئے؛ تاہم موضع شیروان تا حال موجود ہے۔ اور اردگرد کے بیسیوں دیہات میں ابھی تک اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مانگلی:

مانگلی ہندو دور کا ایک قدیم شہر تھا۔ بعض کتابوں میں اس کا نام مانکلی بھی لکھا گیا ہے سنسکرت زبان میں منگل کے معنی پُر فضا اور خوش نظر مقام کے ہیں۔ مانگلی کے محل وقوع کو مدِ نظر رکھ کر دیکھا جائے تو واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ بڑی خوبصورت ہوتی ہوگی۔ یہ قصبہ شاہراہِ کشمیر پر اسی مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں اب میاں کنگال صاحب کا مزار ہے۔ شاہراہِ کشمیر پر مانگلی ہی سب سے بڑا قصبہ اور تجارتی مرکز تھا۔ مشہور روایت کے مطابق اس شہر کو آباد کرنے والا راجہ رسالو کا بیٹا منگل تھا جو کہ رانی کوکلاں کے بطن سے تھا۔ راجہ رسالو ہزارہ قدیم کا مشہور راجہ تھا اور اس کا زمانہ دوسری عیسوی کا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ قصبہ اسی دور کا ہے۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ ساتویں صدی میں ہندوستان وارد ہوا، وہ لکھتا ہے کہ مانگلی کا شہر اس علاقے کا دارالحکومت تھا۔

۱۳۹۹ء میں جب امیر تیمور نے ترکوں کی ایک ہزارہ منگ کو اس ملک کی حفاظت کے لئے یہاں متعین کیا تو اس ہزارہ منگ کے افسروں نے مانگلی کی بجائے پکھلی خاص میں سکونت پذیر ہونا زیادہ مفید خیال کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دفاعی نقطۂ نظر سے مانگلی کی نسبت وہ علاقہ زیادہ بہتر تھا۔ شہاب الدین بابر نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مانگلی کی بجائے گلی باغ کا قلعہ اور چھاؤنی تعمیر کر کے اسی کو اپنا دارالحکومت بنانا موزوں سمجھا؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترکوں کے عہد میں کشمیر کی طرف سے جتنے بھی حملے ہوئے، اُن کا رُخ سیدھا مانکلی ہی کی طرف تھا۔ میرزا حیدر ترک اور غازی چک کے حملوں سے مانگلی کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن گلی باغ ان حملوں کی زد سے محفوظ رہا۔ اسی طرح اکبری فوج نے ولایتِ پکھلی پر حسن بیگ بدخشی شیخ عمری کی سرکردگی میں دو بار حملہ کیا اور شدید لڑائیوں کے بعد مانگلی پر قبضہ کیا، لیکن گلی باغ پر اکبری فوج قبضہ نہ کر سکی۔

مانگلی کے شہر کی حفاظت کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ اس کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کی گئی جس کے سات دروازے تھے۔ ترکوں کے عہد میں ان دروازوں کے نام ترک سرداروں کے نام پر تجویز کئے گئے تھے۔ موزوں مقامات پر شہر کے دفاع کے لئے تین بُرج تعمیر کئے گئے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ سے الحاق کے بعد بیرونی حملوں کا خطرہ ٹل چکا تھا، لیکن اس کے باوجود سلطان حسین خان

اور سلطان شادمان خان والیانِ پکھلی نے مانگلی کے دفاع اور اس کی ترقی کے لئے عمدہ انتظامات کر رکھے تھے۔ مانگلی کے شہر میں ایک شاہی ڈاک چوکی بھی قائم کی گئی تھی۔ ترکوں کے آخری عہد تک مانگلی دس ہزار نفوس کی آبادی کا ایک گنجان آباد شہر بن چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ راولپنڈی ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ اس شہر میں ہر شعبہ اور ہر فن کے افراد موجود تھے۔ اس کے خوش منظر ماحول اور معتدل آب و ہوا میں شاہ و گدا سبھی کی کشمکش کا سامان موجود تھا۔ کشمیر کی طرح مانگلی بھی علم و معرفت کے متلاشیوں کا مرکز بن چکی تھی۔

نقشہ مانگلی

کشمیر جاتے ہوئے شہنشاہ مانگلی کے پُر فضا مقام میں شاہی کیمپ لگایا کرتے تھے۔ شہنشاہ کے ہمراہ تقریباً پانچ سو ہاتھی، بقدرِ ضرورت اونٹوں کی اچھی خاصی تعداد، اسپ سوار فوج، پیادہ سپاہ بمعہ ہلکا توپ خانہ، احدی، چوبدار، تیغ زن، توپچی، بندوقچی، نقارچی اور علمبردار ہوا کرتے تھے۔ ٹٹو، یکے اور بگھیاں بھی شاہی سواری کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ شائع وقائع نویس، بخشی، خانِ سامان، وزراء، دیوان اور متعدد دیگر شاہی منصب دار شہنشاہ کے ہمسفر ہوا کرتے تھے۔ شاہی کیمپ ہمیشہ کھلی فضا میں اس ترکیب سے لگایا جاتا کہ قدرت کی گود، فضا کی زندگی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ دیوانِ عام، دیوان خاص

اور شاہی محل سرا کے نمونے پر خیمے نصب کر دیئے جاتے۔ افسروں کی اپنی اپنی قیام گاہ علیحدہ ہوا کرتی تھی۔ سپاہیوں اور سول ملازمین کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بازار لگایا جاتا۔ شہنشاہ روزانہ کچہری لگاتے مقدمات کے فیصلے کرتے، عوام کی شکایات سنتے، ان کے مقامی مسائل حل کرتے اور ضرورت کے مطابق فرامین جاری کرتے تھے۔ شکار سیر و تفریح کا لازمی جزو ہوا کرتا تھا۔ مانگلی کے مقام پر اسی طرز کا بڑا پڑاؤ لگایا جاتا تھا۔ والیانِ پکھلی اسی مقام پر حاضر ہو کر شہنشاہ کا استقبال کیا کرتے تھے اور پھر انہیں اپنے ہمراہ لے کر پکھلی خاص اور گلی باغ کو لے جایا کرتے تھے۔ ہاتھی میرہ کا پڑاؤ آخری پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ اس سے آگے ہاتھی کا سفر ختم ہو جایا کرتا تھا؛ البتہ ٹانگے، یکے، بگھیاں، گھوڑا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں، سرینگر تک جایا کرتی تھیں۔ شاہی پڑاؤ کے زمانے میں مانگلی اور گلی باغ کی رونق دوبالا ہو جایا کرتی تھی۔ ضرورت کے مطابق شاہی کیمپ کے ملازموں اور جانوروں میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔

مانگلی کی تعمیر و ترقی کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ شاہراہِ کشمیر پر یہ وہ قدیم قصبہ تھا جو ترکوں کے پُرامن دور میں ایک بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔

۲۔ یہ قصبہ ولایتِ پکھلی کے تقریباً وسط میں واقع تھا اور اسے ہر طرف سے مختلف شاہراہوں کے ذریعے کوڑمنگ، گلی باغ، شیروان، چھانجل، دمتوڑ اور مانکرائے سے ملا دیا گیا تھا۔ یہ شاہراہیں اتنی چوڑی تھیں کہ ان پر سے تجارتی قافلے اور افواج آسانی سے نقل و حرکت کر سکتی تھیں۔

۳۔ مانگلی کے گرد فصیل بنانے اور اس میں حفاظتی برج تعمیر کرنے کے علاوہ ترکوں نے اس کے شمال میں گلی باغ اور جنوب مشرق میں دمتوڑ کے مقامات پر مضبوط چھاؤنیاں تعمیر کر رکھی تھیں۔ خطرے کی صورت میں ان ہر دو چھاؤنیاں میں سے آسانی کے ساتھ کمک مل سکتی تھی۔

۴۔ مانگلی کا شہر ایک ایسے پُرفضا مقام پر واقع تھا جو نہ تو کشمیر کی طرح بہت سرد تھا اور نہ ہی پنجاب کی طرح گرم تھا۔ اس کی معتدل آب و ہوا میں سارا سال کام کرنا ممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس شہر میں چاروں اطراف کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے۔

دہلی سے شاہی خاندان سے نسبی تعلق رکھنے والے ایک مشہور بزرگ شہزادہ گل محمد المعروف میاں کنگال صاحب نے اپنی عمر کا آخری حصہ مانگلی ہی میں درس و تدریس اور بیعت و ارشاد کے مشاغل میں گزارا۔ آپ ۱۱۹۸ھ بمطابق ۱۷۸۴ء بتاریخ ۱۹ دسمبر میں فوت ہوئے۔ آپ نے درانیوں کا عہد اپنی

آنکھوں سے دیکھا تھا، ان کا مقبرہ اب بھی مانسہرہ روڈ کے کنارے مانگلی کے اسی مقام پر واقع ہے، جہاں آپ کی تپسیا گاہ اور مسجد تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی فوتیدگی سے قبل مانگلی کے ایک مقتدر آدمی کی گستاخانہ کلام سننے پر آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "مانگلی تباہ خواہد شد" یعنی مانگلی تباہ ہو جائے گی۔ آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ درانیوں کے عہد کی بے کیف زندگی پہلے ہی سے عوام کے لئے ایک بوجھ بنی ہوئی تھی اور قبائلی سردار اپنے علاقے میں من مانیاں کر رہے تھے، مگر ۱۸۲۱ء کا سال مانگلی کے حق میں اس کی تاریخ کا منحوس ترین سال نکلا۔ اس سال سکھوں کا مشہور سردار ہری سنگھ نلوہ جب کشمیر سے سفر کرتے ہوئے مانگلی پہنچا تو کئی قبائلی سرداروں نے مل کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن ان کی غیر منظم بھیڑ سکھوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکی۔ سکھ فوج نے کئی مقامات سے شہر پناہ کو توڑ پھوڑ دیا اور شہر کے اندر گھس کر آگ لگا دی۔ اس زمانے میں گھروں اور بازاروں میں عمارتی لکڑی کا استعمال بہت زیادہ ہوا کرتا تھا، اس لئے آگ پر قابو پانا بہت دشوار بن جاتا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر مانگلی کا خوبصورت شہر جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس کے شہری شہر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ مانگلی کی آخری تباہی تھی۔

کوڑمنگ:

ترکوں کے عہد میں آزاد کشمیر کا موجودہ دارالحکومت مظفر آباد کا قصبہ آباد نہیں ہوا تھا۔ ترکوں نے دریائے جہلم کے قریب اسی علاقے میں کوڑمنگ کا فوجی مرکز تعمیر کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں یہ علاقہ ولایت پکھلی اور پھر پکھلی سرکار میں شامل تھا اور اس کے حاکم گلی باغ ہی سے مقرر کئے جاتے تھے۔ ابوالفضل بھولیاس کی گھاٹی کو کشمیر کی آخری سرحد بیان کرتا ہے۔ اکبر نامہ، آئین اکبری، سیر المتاخرین اور توزک جہانگیری جیسی تمام معتبر کتب تاریخ میں دریائے جہلم کو ولایت پکھلی اور پکھلی سرکار کا دریا شمار کیا گیا ہے۔ اس علاقے کے باشندوں کی زبان بھی ابھی تک ہندکو ہی ہے کشمیری نہیں، چونکہ کشمیر کی طرف سے اسی راستے ولایت پکھلی پر بیرونی حملہ آوروں کا اندیشہ رہتا تھا، اس لئے ترکوں نے کوڑمنگ کے مقام پر اس علاقے کا انتظامی مرکز اور فوجی چھاؤنی تعمیر کرنا ضروری سمجھا۔ کوڑمنگ شاہراہ کشمیر کے قریب واقع تھا اور اسے ایک سڑک کے ذریعے گلیات کے راستے دھمتوڑ سے ملا دیا گیا تھا، یہیں سے

ایک اور راستہ پنجاب کی طرف نکل جاتا تھا، اس طرح کوڑ منگ علاقہ گکھڑ، کشمیر اور پکھلی کو ملانے والے راستوں کا مقام اتصال بن گیا تھا۔

منگ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فوجی دستہ یا پلٹن کے ہیں۔ مختلف حالات کے تحت ترکوں نے کئی اہم مقامات پر اپنی شخصیتوں یا ان مقامات کے ناموں کی نسبت سے فوجی مرکز قائم کر رکھے تھے۔ ککنگ، چوٹ منگ، عزیز منگ، لدڑ منگ، بھوگڑ منگ، سنم الہی منگ، بال منگ وغیرہ تمام ان فوجی مرکزوں کے فوجی دستے متعین تھے۔ اہم ناکوں پر گڑھیاں اور برج بھی تعمیر کئے گئے تھے جو پولیس تھانوں کا کام دیتے تھے۔

کوڑ منگ کی فوجی چھاؤنی اسلحہ سازی اور لوہے کا دوسرا سامان تیار کرنے کے لئے مشہور تھی۔ ترکوں کے زوال کے زمانے میں اسی مقام کے لوہار گھوڑی اور دوسرے مقامات میں منتقل ہو گئے اور کئی نسلوں تک وہ اپنے فن میں مشہور رہے۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس مطبوعہ ۱۸۷۲ء میں بمبہ قوم کے بزرگوں کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوڑ منگ کا آخری ترک حاکم مسمی کمال خان تھا جسے بمبہ قوم کے سلطان قاسم نے قتل کر کے اس علاقہ کا اقتدار حاصل کیا، چونکہ اس وقت گلی باغ پر سید جلال بابا کے سواتی لشکر نے قبضہ کر لیا تھا؛ لہذا وہاں سے اس علاقہ کے ترکوں کو کوئی مدد نہ مل سکی۔ رعایا ان کے ظلم وستم سے تنگ تھی؛ لہذا سب نے مل کر سلطان قاسم کی رہنمائی میں ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چونکہ بمبہ قوم عرصہ دراز سے اس علاقے کی مشہور قوم چلی آ رہی تھی اور سلطان قاسم کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ کمال خان ترک کا دوہتا ہے، اس لئے اسی قوم کے افراد کو ترکوں کے بعد اس علاقہ میں بالادستی حاصل ہوئی۔ مظفر آباد کا قصبہ اسی بمبہ قوم کے ایک بزرگ کا آباد کیا ہوا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں بمبہ قوم کشمیر اور گلیات کے درمیانی علاقے کی سب سے زیادہ باوقار قوم بن گئی۔ بمبہ قوم کے عروج کے زمانے میں کوڑ منگ کی چھاؤنی برباد ہو گئی اور رفتہ رفتہ مظفر آباد کے قصبے کو اس علاقے میں مرکزیت حاصل ہو گئی۔

دھمتوڑ:

یہ ہندوؤں کے زمانے کا ایک قدیم قصبہ تھا۔ قدیم زمانے میں اس کا نام دھم توڑ تھا جو مرو

زمانہ کے ساتھ ساتھ دھمدھوڑ، دمتوڑ اور دہمتوڑ پکارا جاتا رہا۔ ترک اپنے مخصوص لب ولہجہ میں اسے دھنتوریا دمتور پکارتے تھے۔ اکبرنامہ اور آئین اکبری جیسی کتب تاریخ میں اس کا نام دمتور یا دھنتور ہی لکھا گیا ہے۔ اس کے ترک حاکموں کے ناموں کے ساتھ دھنتوری کے لفظ کا اضافہ کر دیا جاتا تھا، مثلاً شاہرخ دھنتوری اور بہادر خان دھنتوری۔ سلطان شہاب الدین بابر نے دہمتوڑ کے قصبے کو گلی باغ کے بعد دوسرے درجے کی چھاؤنی بنا دیا تھا۔ دہمتوڑ میں اس کے موجودہ تالاب کے قریب ہی ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ ولایت پکھلی کے دوسرے قلعوں کی مانند تھا۔ دہمتوڑ کو سڑکوں کے ذریعے کشمیر، پکھلی خاص، تناول اور ہزارہ قارلق کے علاقوں سے ملا دیا گیا۔ اس میں سے ایک سڑک حویلیاں کے علاقے سے گزر کر میدانِ ہزارہ قارلق میں داخل ہوتی تھی اور اس طرف سے شاہراہِ کشمیر سے مل جاتی تھی۔ دوسری سڑک گلیات کے راستے سے ہو کر کوڑمنگ (علاقہ مظفرآباد) کو چلی جاتی اور اس طرف سے شاہراہِ کشمیر سے مل جاتی تھی۔ کشمیر جانے کا یہ سب سے زیادہ مختصر راستہ تھا۔ تیسری سڑک علاقہ سلہڈ سے ہوتی ہوئی نوشہرہ کے قریب شاہراہِ کشمیر سے مل جاتی تھی۔ چوتھی سڑک میدان رش سے گزر کر شیروان کی طرف نکل جاتی اور پانچویں سڑک میدانِ رش سے گزر کر مانگلی اور پھر وہاں سے سیدھی گلی باغ کو نکل جاتی تھی۔ اس طرح دہمتوڑ کو مختلف سڑکوں کے ذریعے ولایت پکھلی کے تمام علاقوں سے ملا دیا گیا تھا۔

دہمتوڑ کے قصبے سے کچھ آگے ندی دوڑ کے کنارے پر سلاطین دہمتوڑ نے اپنے لئے ایک سیرگاہ ندی دوڑ اور اس کے مشرقی کنارے کی پہاڑی کے دامن میں بنائی گئی تھی۔ اب بھی اسی نام کا ایک موضع اسی مقام کے قریب واقع ہے۔ دہمتوڑ کے جنوب مغرب میں بانڈہ بازواران بسایا گیا۔ اس زمانے میں شکار راجاؤں اور والیوں کا محبوب مشغلہ تھا، اس لئے یہ مقام بازاروں کا مرکزی مقام بن گیا۔ دہمتوڑ کے شمالی جانب ایک تکیہ گاہ بنائی گئی۔ اب تک اس مقام کا نام تکیہ ہی مشہور ہے اور یہاں سکاؤٹوں کے گرمائی کیمپ لگتے ہیں۔ یہ تکیہ نالہ درکن کے کنارے پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ شاہی مہمان اسی تکیہ کے مقام پر فروکش ہوا کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ کے مشہور درباری حکیم ابوالفتح کا انتقال یہیں ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ ملکہ نورجہاں نے اپنے ہاتھ سے یہاں چنار کا ایک درخت لگایا تھا جو عرصہ دراز تک اسی کے نام سے مشہور رہا۔

تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے کہ دہمتوڑ کنول کے پھولوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ تکیہ کے قریب ہی شاہی مقبرے ہیں۔ لوگ ابھی تک انہیں مقبرے ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان مقبروں میں سلاطین دہمتوڑ دفن

ہیں۔ ترکوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں لڑائی کا بڑا میدان یہی مقبروں کا علاقہ تھا۔ ان مقبروں میں سلطان شاہرخ، سلطان بہادر خان، سلطان یاور خان، سلطان عالم خان، سلطان مقرب خان، سلطان رسالت خان اور سلطان لشکری جیسے بہادر ترک سردار دفن ہیں لیکن آج ان کی قبروں کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ اہلِ دمتوڑ آج ان کے ناموں تک سے ناواقف ہو چکے ہیں۔

سلطان غیاث الدین عبداللہ خان کے عہد تک دمتوڑ اور اس کا تمام ملحقہ علاقہ گلی باغ کے صدر مقام ہی کے ماتحت تھا اور اس کے حاکم وہیں سے متعین کئے جاتے تھے۔ حاکم دمتوڑ والی پکھلی کے بھائیوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا، لیکن سلطان محمود (کلاں) کے زمانے میں جبکہ ولایتِ پکھلی غازی چک کے حملہ کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی۔ دمتوڑ ایک ذیلی ریاست کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس وقت تک پکھلی کے خاندانِ سلاطین کی اولاد کافی پھیل چکی تھی اور ان کی تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا، اس لئے وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے۔ پہلے اور بڑے گروہ کا نام پکھلی وال اور دوسرے گروہ کا نام دمتوڑی مشہور ہو گیا۔ یہ صورتِ حال سلطان حسین خان کے عہد تک قائم رہی۔ سلطان حسین خان ابن سلطان محمود (کلاں) والی پکھلی تھا اور بہادر خان ابن شاہرخ والی دمتوڑ تھا۔ اکبر بادشاہ نے پکھلی سرکار کی تشکیل کے بعد سلطان حسین خان کو پانصدی اور بہادر خان ابن شاہرخ کو سہ صدی کے مناصب عطا کر دیئے تھے۔ جہانگیر کے عہد تک یہی صورتِ حال قائم رہی اور ترک ان دو گروہوں میں بٹے رہے؛ چونکہ مندرجہ بالا والیان پکھلی و دمتوڑ کے نام اسی حیثیت سے اکبر نامہ، آئینِ اکبری، اور توزکِ جہانگیری میں موجود ہیں؛ لہذا ان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اکبر نامہ کا بیان ہے کہ شہنشاہ اکبر نے سفرِ کشمیر کے دوران میں بہادر خان کے ہاں دمتوڑ میں قیام فرمایا تھا۔

سلطان حسین خان کی وفات کے بعد جب اس کا بڑا بیٹا سلطان شادمان خان اس کا جانشین بنا، تو حالات میں ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ یہ شاہجہان بادشاہ کا عہدِ حکومت تھا۔ شاہجہان نے بلخ بدخشان بلکہ سمرقند تک ملک توران کا علاقہ فتح کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے تین عظیم فوجی مہمات روانہ کیں سلطان شادمان خان کو بھی ان مہمات میں دادِ شجاعت دینے کا موقع ملا۔ گزشتہ اوراق میں سلطان شادمان خان کے بلخ و بدخشاں کے علاقوں میں قابلِ فخر فوجی کارنامے سرانجام دینے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی اعلیٰ کارناموں کی بدولت شاہجہان نے سلطان شادمان خان کو ہزاری منصب داروں کے بلند منصب پر سرفراز کر دیا

تھا۔ اس زمانے میں ہزاری منصب داروں کو بجا طور پر سلطنت کے ستون قرار دیا جاتا تھا۔ سلطان شادمان خان کے یہ بلند مرتبہ حاصل کرنے کے بعد دھمتوڑ کی ذیلی ریاست بھی اسی کی جاگیر قرار دے دی گئی اور اس طرح پکھلی سرکار ایک بار پھر ایک متحدہ ریاست بن گئی۔

سلطان شادمان خان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود خورد نے اپنے ایک بھائی سلطان مقرب خان کو حاکم دھمتوڑ متعین کیا۔ سلطان مقرب خان بڑا سخت گیر انسان تھا، اسے پہلے ہی سے سلطان محمود کے معتمدین کے خلاف شکایات تھیں۔ جب کافی عرصہ تک سرحدی علاقے سے سلطان محمود کے بیٹوں اور بھائیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی۔ سلطان محمود کے معتمد اس کشمکش کو مسلسل ہوا دیتے رہے اور بالآخر سترھویں صدی کے آخری حصے میں ترکوں کے درمیان کھلم کھلا تصادم شروع ہوگیا۔ تمام پکھلی سرکار اور ہزارہ قارلق کے علاقے میں ترک سرداروں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس خانہ جنگی میں سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ کا پلہ بھاری رہا اور وہ دھمتوڑ سے آگے بڑھ کر پکھلی خاص کے میدان پر بھی قابض ہوگیا۔ جب دوسرے سلاطین زادوں کو احساس ہوا کہ وہ سلطان مقرب خان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو انہوں نے اس کی چیرہ دستیوں کے خلاف اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں ایک شکایت روانہ کر دی۔ عالمگیر نے مبارز الدین خان گکھڑ کی سرکردگی میں ایک شاہی فوج کو سلطان مقرب خان کے خلاف کارروائی کے لئے پکھلی سرکار کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ سلطان مقرب خان کے مخالفین کی مدد اور تعاون سے اسے شکست دے دی۔ لڑائی کے دوران میں دھمتوڑ کے قلعہ اور چھاؤنی کو زبردست نقصان پہنچا۔

مبارز الدین خان کی اس فوجی مہم کا ذکر تاریخ گکھڑاں میں موجود ہے۔ وہ اس کارروائی کے بعد کابل کے علاقے میں متعین کر دیا گیا۔ اگرچہ مبارز الدین خان یہاں سے شاہی فرمان کی تعمیل کر کے واپس لوٹ گیا، لیکن اس کے بعد اس علاقہ میں گکھڑوں کے اثرات زیادہ ہوگئے۔ کچھ عرصہ تک سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان دھمتوڑ کے دو حصوں پر قابض رہے: لورہ اور ناڑہ کے علاقے پر گکھڑوں کو بالادستی حاصل ہوگئی۔ اس طرح دھمتوڑ کی پرانی عظمت باقی نہ رہی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان کی اولاد کے درمیان بھی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سلطان لشکری کا خاندان دھمتوڑ کے قریب دیتار (ناتار) کے مقام پر سکونت پذیر تھا اور سلطان رسالت خان کا خاندان دھمتوڑ کے قصبے

اور قلعے پر قابض تھا۔ سلطان رسالت خان کا پوتا سلطان اکبر خان دھمتوڑ کا آخری ترک حاکم تھا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس کا بیان ہے کہ دھمتوڑ کا تالاب آخری سلطان ہی نے تعمیر کروایا تھا۔ وہ ایک عیش پرست حاکم تھا، اور مشہور روایت کے مطابق وہ اس تالاب میں عورتوں سمیت نہایا کرتا تھا (صفحہ ۲۹۲ تاریخ ہزارہ ویس) مشہور روایت ہے کہ جدون قوم کا ایک فرد رات کی تاریکی میں ایک روز ترکوں کے مندرجہ بالا دونوں گروہوں کے درمیانی مقام پر کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنی بندوق سے دونوں اطراف میں فائر کر دیئے۔ ترکوں کو ایک دوسرے پر شبہ پیدا ہوا اور وہ رات کی تاریکی ہی میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے۔ ساری رات وہ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے رہے اور صبح ہونے تک وہ اپنے بہترین آدمیوں کا صفایا کر چکے تھے۔ صبحدم جدونوں کا ایک گروہ نمودار ہوا اور اس نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے دھمتوڑ کے قصبے پر قبضہ کر لیا۔ دھمتوڑ پر جدونوں کا قبضہ ۱۷۲۰ء میں ہوا اس وقت ان کا بڑا آدمی نصیر خان پیروخیل تھا۔ جدونوں نے دھمتوڑ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے ملحقہ دیہات پر بھی قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں ڈھونڈ اور کرڑال قبائل بھی اپنے گکھڑ حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور شدید جدوجہد کے بعد انہوں نے گکھڑوں سے آزادی حاصل کر لی۔ اب مقابلہ کرڑالوں، جدونوں اور تنولیوں کے درمیان شروع ہوگیا۔ ترکوں کی بڑی تعداد دھمتوڑ سے نکل کر کشمیر کو چلی گئی، لیکن ان میں سے کچھ موضع موہار کلاں، بانڈہ پھگواڑیاں اور علاقہ رش کے بعض دیہات میں بھی سکونت پذیر ہو گئے، جہاں اب تک ان کی اولادیں موجود ہیں، لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۷۳۹ء میں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۱۷۵۰ء تک انہوں نے تمام ولایت پکھلی بلکہ کشمیر تک کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ درانیوں کو اس علاقے میں صرف شاہراہ کشمیر ہی سے دلچسپی تھی۔ ان کے بعد جب سکھوں اور انگریزوں کے ادوار آئے تو انہوں نے دھمتوڑ کی اہمیت کم کرنے کے لئے نواں شہر اور ایبٹ آباد کے قصبے آباد کئے، اس طرح دھمتوڑ کی وہ پرانی عظمت باقی نہ رہی۔

مانکرائے:

میدانِ ہزارہ قارلق کا یہ قدیم ترین قصبہ ہے۔ کہتے ہیں کہ بدھ دور میں کسی مانکرائے یا مانک راؤ نامی شخص نے اسے آباد کیا تھا۔ اس زمانے میں رائے یا راؤ چھوٹے راجہ کو پکارا جاتا تھا۔ اس قصبہ کی

پشت پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے، سامنے مغربی جانب ندی دوڑ بہہ رہی ہے۔ ندی کے دوسرے کنارے سے آگے میدان ہزارہ قارلق کا وسیع میدان ہے۔ موجودہ گاؤں کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑی ہے، جسے لوگ "مانکے دی ڈھیری" یعنی مانک رائے کی پہاڑی کے نام سے پکارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑی پر مانکرائے نے اپنا قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ قلعہ کی پچھلی سمت میں مانکرائے کا پرانا قصبہ آباد تھا۔ بعض لوگوں کو اس پہاڑی کے دامن سے قدیم سکے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ترکوں کے عہد میں ندی دوڑ ایک حقیر سے نالے کی شکل میں بہہ رہی تھی۔ قدیم زمانے میں شاہراہِ کشمیر مانکرائے کے پاس ہی سے گزرتی تھی۔ اس قصبہ میں مسافروں کو ٹھہرانے کے لئے چند سرائیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ اس مقام کو اب بھی "سرائیاں والا ڈوگہ" یعنی سراتے والا کھیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بدھ دور میں مانکرائے میدانِ ہزارہ قارلق کا مرکزی مقام اور دارالحکومت تھا۔

صورتِ دیہی موضع مانکرائے میں لکھا ہے کہ سلطان محمد غوری کے عہد میں میدانِ ہزارہ قارلق کے علاقے میں سربن سنگھ اور نتھا سنگھ نامی دو راجے حکمرانی کر رہے تھے۔ جب غوری فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے میدانِ ہزارہ قارلق سے گزر کر راولپنڈی کے علاقے کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی، تو سربن سنگھ نے مارگلہ کے مقام پر پہنچ کر غوری فوج کا مقابلہ کیا، لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ لڑائی کے دوران میں مارا گیا۔ اس کے بعد غوری فوج کے ایک حصے نے سلطان محمد غوری کے بیٹے اصالت خان (سلطان محمد غوری کا کوئی بیٹا نہ تھا، مگر وہ اپنے ترک غلاموں کو بیٹے کہہ کر پکارتا تھا) کی سرکردگی میں میدانِ ہزارہ قارلق سے آگے بڑھ کر دھموڑ اور پکھلی خاص کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ اس علاقے میں مان سنگھ نے غوری فوج کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی، اس طرح پہلی بار غوری ترکوں کو اس ملک میں غلبہ حاصل ہوا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد ترکوں نے موضع مانکرائے سے ان چار ہندو بھائیوں کو یہاں سے نکال دیا، جو اس موضع میں آباد تھے۔ صورتِ دیہی موضع مانکرائے میں ان ہندوؤں میں سے ایک کا نام مٹھا رام اور دوسرے کا نام مرہند رام لکھا ہوا ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ان کے دوسرے بھائیوں کا نام معلوم نہیں۔

سلطان محمد غوری کی شہادت کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کے ترک غلاموں کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ یہ ترک خاندان تاریخ میں خاندانِ غلامان کے نام سے مشہور ہوا اور ان کا اوّلین حکمران

سلطان قطب الدین ایبک تھا جس نے پہلی بار دہلی میں ابتدائی ترکی سلطنتِ دہلی کی بنیاد رکھی۔ اس سلطنتِ دہلی کے زمانے میں ہزارہ قارلق اسی سلطنت کا ایک حصہ بنا رہا، لیکن اس زمانے میں ترک مانکرائے میں آباد نہیں ہوتے تھے۔ قرلق ترکوں کی آبادکاری کے عنوان کے تحت گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہزارہ قارلق میں ترکوں کی آبادکاری پہلی بار ۱۳۹۹ء میں تیموری حملے کے بعد ہوئی۔ امیر تیمور نے میدانِ ہزارہ قارلق اپنی اس ہزارہ منگ کو جاگیر کے طور پر عطا کر دیا تھا جسے اس نے علاقہ پکھلی میں اس ملک کی حفاظت کے لئے متعین کیا تھا۔ اس وقت سے یہ میدان تیموریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سلطان شہاب الدین بابر اور سلطان فقیر الدین دریا خان کے زمانے تک یہ میدان ولایتِ پکھلی کا ہی حصہ بنا رہا، لیکن ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۱ء میں جب بھیرہ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا، تو اس وقت اس نے اسے ہمایوں کی جاگیر میں دے دیا، مگر ہمایوں کے فرار کے زمانے میں یہ میدان دوبارہ سلطان غیاث الدین عبداللہ خان والی پکھلی کے قبضے میں چلا گیا۔ اکبر بادشاہ کے عہد تک یہی صورتِ حال قائم رہی۔ جب کشمیر کی فتح کے بعد والی پکھلی سلطان محمود (کلاں) نے اپنی ریاست کا الحاق سلطنتِ مغلیہ سے کر دیا، اس وقت سے میدانِ ہزارہ قارلق کو اکبر بادشاہ نے ایک پرگنہ کا درجہ دے کر اٹک کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس زمانے میں گوجر، دلازاک، کھٹڑ اور آوان اقوام کے افراد اس علاقے میں آباد تھے۔ گوجر سب سے زیادہ باوقار قوم تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی عہد تک یہ علاقہ پرامن رہا اور لوگ خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن ۱۶۶۰ء سے ۱۶۷۴ء کے درمیانی عرصے میں تمام سرحدی علاقہ بدامنی اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ بہاکو خان یوسف زئی، خوشحال خان خٹک اور ایمل خان آفریدی نے سلطنت کے خلاف تمام پٹھان قبائل کو ابھارنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر چونکہ دکن اور وسطی ہند کے بعض علاقوں میں مرہٹوں اور راجپوتوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا، اس لئے سرحدی علاقے کے مسائل کی طرف وہ اپنی ذاتی توجہ مبذول نہ کر سکا جس کے نتیجے میں یہاں ہر طرف شورش اور ہنگامے کھڑے ہو گئے۔ اسی انتشار کے زمانے میں ترینوں نے حضرو کے علاقے سے یہاں آ کر میدانِ ہزارہ قارلق میں چند اوگاؤں آباد کر لئے اور غورغشتی قوم نے علاقہ مانکرائے پر قبضہ کر لیا۔ صورتِ دیہی مانکرائے پر قبضہ کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔ غورغشتیوں اور دیگر قبائل کی پیش قدمی سے نہ صرف میدانِ ہزارہ قارلق بلکہ پکھلی

سرکار کی شمال مغربی سرحد کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس وقت والیٔ پکھلی سلطان محمود اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوچکا تھا، اس لئے سلطان محمود کا ایک بیٹا سلطان فاضل خان اپنے دو بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر خان سمیت پکھلی خاص سے میدان ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھا اور اس نے موضع سلطان پور میں کیمپ لگاکر شاہراہِ کشمیر کے دونوں اطراف پر زبردست پہرہ لگادیا۔ یہیں سے ملوک خان نے ایک ترک فوج کو ہمراہ لے کر موضع علی خان کے راستے سے مانکرائے پر حملہ کردیا اور زبردست لڑائی کے بعد اس نے قصبے پر قبضہ کرلیا۔ غور غشتیوں کو ندی دوڑ کے تمام مشرقی علاقے سے باہر نکال دیا گیا۔ اس لڑائی میں مانکرائے کا قدیم قصبہ تباہ و برباد ہوگیا اور ترکوں نے اسی نام سے ایک نیا مانکرائے آباد کیا، جو اب تک آباد چلا آرہا ہے۔

۱۶۷۲ء میں اورنگ زیب عالمگیر بذاتِ خود حسن ابدال تشریف فرما ہوئے اور گوجروں کی شکایت پر از سرِ نو میدان ہزارہ قارلق کی تقسیم عمل میں آئی جس کی رو سے اکیس مواضعات ترکی پٹی مانکرائے میں شامل کئے گئے؛ چونکہ سلطان فاضل خان سلطان پور سے رجوعیہ تک کے علاقے پر قابض تھا، اس لئے وہ مواضعات بھی ترکوں ہی کے پاس رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد ولایت پکھلی میں ترکوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کی وجہ سے سلطان فاضل خان، ملوک خان اور شمشیر خان کا تعلق پکھلی سرکار سے ٹوٹ گیا اور یہ حضرات مستقل طور پر یہیں آباد ہوگئے۔ ان حضرات کی اولاد کے حالات ترکی پٹی مانکرائے کے عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں بیان کئے جارہے ہیں۔

مانکرائے کے علاقے پر قابض ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکوں کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی، اس لئے وہ مانکرائے کو اتنا خوبصورت اور دل کش نہ بنا سکے، جتنا کہ قبل ازیں انہوں نے کوڑمنگ، گل باغ، مانگلی اور دمہتوڑ کو خوبصورت اور دل کش بنا دیا تھا۔ اگر ہم ترکوں کے عہد کے مندرجہ بالا تمام قصبوں کو اور ان میں تعمیر کردہ قلعوں کے محلِ وقوع پر ایک نظر ڈالیں، تو ان کی تعمیر میں ایک ہی ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک پہاڑی سلسلہ، ہر ایک کے سامنے ایک ندی نالہ، ہر ایک کے سامنے ایک وسیع میدان اور ہر ایک کے محلِ وقوع کی بلند سطح میں ایک عجیب یکسانیت نظر آتی ہے۔ کوڑمنگ کے سامنے دریائے جہلم اور مظفر آباد کا میدان تھا۔ گل باغ کے سامنے ندی سرن اور میدان پکھلی تھا۔ دمہتوڑ کے قریب میدانِ رشن اور ندی دوڑ موجود تھی۔ مانگلی کے ایک طرف کٹھا مانگلی

اور دوسری طرف میدانِ پچھلی تھا۔ مانکرائے کی پشت پر وہی سلسلہ، سامنے ندی دوڑ اور پھر میدان ہزارہ قارلق موجود تھا۔ بلند سطح، پہاڑ، ندی اور میدان اپنی اپنی خصوصیات کی بنا پر ان قصبوں کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔

قاغان:

وادیٔ کاغان اور کاغان کا موضع بھی ترکوں کے عہد کی یادگار ہے۔ ایرانی القابات اختیار کرنے سے قبل ترک اپنے بڑے خان کو قاغان کے لقب سے پکارتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں قرلق ترکوں کے تین قاغان موجود تھے جن میں سے ایک کو قاغان ترگیش اور دوسرے کو قاغان قیرغیز پکارا جاتا تھا۔ چنگیز خان نے بھی منگولیا میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے لئے قاغان ہی کا لقب منتخب کیا تھا۔ تیموریوں میں سب سے اوّل ظہیر الدین بابر نے کابل کا حکمران بننے کے بعد اپنے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ رفتہ رفتہ لفظ قاغان کو کاغان کے طور پر لکھا جانے لگا۔ امیر تیمور کی وفات کے کچھ عرصہ بعد توران میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو ولایتِ پچھلی کے ترک افسر اپنے مرکز سے کٹ گئے۔ ابو سعید سلطان اور الغ بیگ میرزا کابلی کے عہد تک ولایتِ پچھلی کابل کے علاقے سے جدا ہو چکی تھی۔ ان حالات میں ولایت پچھلی کے ترکوں نے کسی امیر یا بادشاہ کی بجائے اپنے قاغان کی ماتحتی ہی میں اس ملک کا نظم و نسق چلانا شروع کر دیا۔ وادیٔ قاغان قرلقوں کے آبائی برفستانی وطن کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ شاید آب و ہوا، طبعی ماحول کی اسی مناسبت کی وجہ سے اس وادی کا نام وادیٔ قاغان رکھا گیا اور اسی نام سے قاغان کا موضع بھی آباد کیا گیا جو اس زمانے میں ترک قاغان کا بہترین گرمائی مسکن ثابت ہو سکتا تھا۔ سکھوں کے زمانے میں قاغان کی اہمیت ختم ہو گئی، لیکن انگریزوں نے وادیٔ قاغان کو اس کے حسن و لطافت اور اس کے عجیب و غریب قدرتی مناظر کی وجہ سے تھوڑی بہت اہمیت دی اور اب اس کی کشش سے دنیا بھر کے سیاح اور ٹورسٹ اس کی طرف کھچے چلے آتے ہیں اور گرمیوں میں اس کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔

لورہ بھی ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی جنگل کے ہیں۔ اس زمانے میں اس علاقے میں جنگل کثرت سے پائے جاتے تھے، اس لئے اس کا نام لورہ ہی تجویز کیا گیا۔ رفتہ رفتہ لورہ ڈھونڈ

قوم کا مرکزی مقام بن گیا۔ پنج کٹھ بھی دراصل توران کے علاقے کا ایک مقام تھا۔ یہ مقام توران کے دارالحکومت سمرقند سے نو فرسخ کے فاصلے پر ندی مسیخا (جدید Matck) کے قریب تھا۔ ترکوں نے یہاں اسی مقام کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ندی ہرو کے کنارے کے علاقے کا نام پنج کٹھ تجویز کیا جسے اب لوگ پنج کٹھا کے نام سے پکارتے ہیں۔ توران میں پنج کٹھ کا علاقہ اوغوزی قرلقوں کے مرکزی مقامات میں سے تھا۔ توران کے قدیم جغرافیہ کے مطالعہ سے مندرجہ بالا شہروں، قصبوں اور علاقوں کے ناموں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ توران کے مندرجہ بالا مقامات پر امیر تیمور کے دور سے بہت پہلے سے اوغوزی قرلق قوم کے ترک آباد چلے آرہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہزارہ قارلق اور بکچلی میں امیر تیمور کی متعین کردہ ہزارہ منگ کے افسروں نے یہاں جو بھی نیا موضع یا قصبہ آباد کیا۔ اس کے نام سے ان کے قدیم وطن کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

⁂

مشہور شاہراہیں

ولایتِ پکھلی کا سارا علاقہ آریائی دور ہی سے مہذب رہا ہے۔ یونانی مورخ میگاسھنیز اور چینی سیاح ہیون سانگ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور بدھ ادوار میں یہاں ایسی شاہراہیں موجود تھیں۔ جن کی چوڑائی ۶۴ فٹ تک بھی تھی اور ہر ½ کوس پر سرائیں موجود تھیں۔ یہ شاہراہیں ایرانی طرز کی تھیں۔ موزوں مقامات پر پولیس کے تھانے موجود تھے۔ عام طور پر شاہراہوں کی حفاظت مقامی بااثر باشندوں ہی کے سپرد ہوا کرتی تھی۔ ولایتِ پکھلی کے مغرب میں سلطنتِ ٹیکسلا کا علاقہ اور ٹیکسلا شہر موجود تھا۔ یہ شہر صدیوں تک ہندی اور ایرانی تہذیب کا مرکز بنا رہا۔ اس ولایت کے شمال مشرق میں کشمیر کی حسین وادی تھی جس سے اس ولایت کے قریبی سیاسی اور معاشرتی تعلقات موجود تھے۔ ٹیکسلا اور کشمیر کا درمیانی راستہ اسی ولایت سے گزرتا تھا، اس لئے ہندو اور بدھ دور میں بھی اس کی تعمیر اور حفاظت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔

اس ولایت کی سب سے بڑی اور اہم سڑک شاہراہِ کشمیر ہی تھی۔ امیر تیمور نے درحقیقت اسی اہم شاہراہ کے اس علاقے پر مستقل قبضہ کرنے کے لئے ترکوں کی ہزارہ منگ کو یہاں متعین کیا تھا۔ یہ شاہراہ اتنی چوڑی اور مضبوط تھی کہ حسن ابدال سے ہاتھی سیرہ (پکھلی) تک اس پر سے شاہی سواری، ہاتھی فوج، اسپ سوار فوج، یکے، ٹانگے، بگھیاں اور بیل گاڑیاں اور توپ خانہ آسانی سے گزر سکتے تھے۔ عوام اسے "بادشاہی راہ" کے نام سے پکارتے تھے۔ ندی نالوں اور دریاؤں پر لکڑی کے پُل تعمیر کئے جاتے تھے۔ چونکہ دیار کی لکڑی اس علاقے میں بکثرت دستیاب ہوتی تھی، لہذا پلوں کی تعمیر کچھ مشکل کام نہ تھا۔ تین سے چار کوس کے فاصلے پر سرائیں قائم تھیں۔ انہی

سراؤں میں ڈاک چوکی، خفیہ پولیس اور تھانے قائم کئے جاتے تھے۔ ڈاک کی ترسیل پیادہ ڈاکیوں اور اسپ سوار ڈاکیوں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ ڈاک پہنچانے کے لئے ہر سرائے میں تازہ دم گھوڑے تیار رہا کرتے تھے۔ شاہراہ کشمیر حسن ابدال سے آگے سلطان پور (ہرو) سنجے، مانکرائے، نوشہرہ (نزد حویلیاں) سلہڈ، مانگلی، ہاتھی میرا (پکھلی) عطر شیشہ اور کوڑمنگ کے مقامات پر شاہی پڑاؤ لگانے کے انتظامات کئے جاتے تھے۔ اس شاہراہ کی حفاظت کے لئے مانکرائے، دھمتوڑ، مانگلی، گلی باغ اور کوڑمنگ میں فوج متعین رہتی تھی۔ یہ شاہراہ اس ملک کو پنجاب، کابل اور کشمیر کے اہم علاقوں سے ملاتی تھی۔ ولایت پکھلی کے اہم قصبے اسی شاہراہ کے قریب واقع تھے۔ اسی شاہراہ سے چند چھوٹی شاہراہیں پکھلی سرکار کے مختلف علاقوں کو چلی جاتی تھیں۔ ایک شاخ عطر شیشہ سے ہوتی ہوئی بیدادی اور گلی باغ کو مڑ جاتی تھی۔ دوسری شاخ اگرور کے علاقے سے گزرتی ہوئی دو مزید شاخوں میں تقسیم ہو کر قلعہ چھانجل اور دربند کو چلی جاتی تھی۔ ایک اور شاخ جلو، پھوہار اور بیڑ کے راستے سے میدان ہزارہ قارلق میں داخل ہو جاتی تھی۔ کوڑمنگ کے مقام سے ایک شاخ گلیات میں سے ہوتی ہوئی دھمتوڑ پہنچ جاتی اور پھر وہاں سے تین مزید شاہراہیں حویلیاں، سلہڈ، شیروان اور مانگلی کے علاقوں کو نکل جاتی تھیں۔ کشمیر کا مختصر راستہ یہی دھمتوڑ گلیات کا راستہ تھا۔ اس راستے کی حفاظت کے لئے عزیز منگ، چوٹ منگ اور لکمنگ جیسے مقامات پر فوجی دستے متعین رہتے تھے۔ دریائے سندھ کو دربند، تربیلا اور چھانجل کے علاقوں سے کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔ مہابن، سوات، دیر، بنیر اور افغانستان تک کے علاقوں تک لوگ دربند، تربیلا اور چھانجل کے راستوں سے ہو کر آمد و رفت کیا کرتے تھے۔ ان شاہراہوں کے علاوہ وہ متعدد پہاڑی راستے بھی موجود تھے جو اب تک اہم مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ترکوں کے عہد میں شاہراہوں کی حفاظت کا اتنا معقول انتظام موجود تھا کہ تین سو سال کے عرصے میں یہاں بغاوت، ڈاکہ زنی، اور لوٹ مار کی وارداتیں نہیں ہوئیں۔ اس پُرامن ماحول ہی کی وجہ سے پکھلی سرکار میں گلی باغ، مانگلی اور دھمتوڑ جیسے عظیم اور شاندار قصبے تعمیر ہوئے۔ ولایت پکھلی کی شاہراہوں سے ہندو اور بدھ دور میں راجہ رسالو، راجہ ابھی ساریز، مہاراجہ اشوک، مہاراجہ کنشک، مہاراجہ جے پال جیسے نامور ہندو اور بدھ حکمران گزرے ہیں، ان پر سے غزنوی اور غوری ترکوں کی افواج قاہرہ بھی گزریں، ان پر اکبر اور جہانگیر جیسے عظیم تیموری حکمرانوں نے بھی سفر کیا۔ ہیون سانگ جیسا عظیم چینی سیاح بھی اسی شاہراہ پر سے گزرا۔

انہی عظیم لوگوں کے سفرناموں کی وجہ سے آج ہم اس ولایت کی تاریخ کے ماخذ تلاش کرنے میں

کامیاب ہوتے ہیں۔ ہماری اس شاہراہِ کشمیر کے مقابلے میں شاہراہِ کابل بھی تھی، لیکن وہ عموماً پُرخطر رہی۔ پختون باشندے اکثر اپنے پہاڑی علاقوں سے نیچے اتر کر تجارتی قافلوں بلکہ بعض اوقات شاہی افواج تک کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پشاور کے قدیم شہر کے سوا شاہراہِ کابل پر کوئی بڑا قصبہ یا شہر تعمیر نہ کیا جا سکا اور اسی بنا پر پختون باشندے زابلستان اور پنجاب کے لوگوں کے مقابلے میں علمی اور اقتصادی طور پر پسماندہ رہے۔

⁂

صنعت و حرفت

بنیادی طور پر ولایت پکھلی ایک زراعتی ملک تھا جیسا کہ آئین اکبری میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ ملک تین دریاؤں یعنی جہلم، سندھ اور کشن گنگا سے سیراب ہوتا تھا۔ اس کے دریاؤں اور ندیوں سے لوگ پانی کی نہریں، کھٹے اور نالیاں نکال کر اپنے فصل اگاتے تھے۔ پکھلی خاص کا میدان چاول کی پیداوار کے لئے بہت مشہور تھا۔ جہانگیر کے بیان کے مطابق اس میدان میں لوگ امرود، شفتالو، خوبانی اور آڑو جیسے پھل لگاتے تھے۔ میدان رش اور اگرور کی مکئی اور میدانِ ہزارہ قارلق کی گندم کی فصل مشہور تھی۔ علاوہ ازیں جو، باجرہ اور دالیں بھی بکثرت پیدا ہوتی تھیں۔ اس ملک کے پہاڑوں پر بیش قیمت جنگلات موجود تھے۔ جن میں چیڑھ، دیار، بیاڑ اور رکھو وغیرہ جیسے درخت کثیر تعداد میں موجود تھے۔ لوگ ان درختوں کی لکڑی کو عمارتی اشیاء اور فرنیچر سازی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پلوں کی تعمیر میں بھی لکڑی استعمال کی جاتی تھی۔ جہاں جہاں پانی میسر تھا، لوگ وہاں سبزیاں اور پھل کثرت سے اُگاتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں گوجر لوگ بھیڑیں اور بکریاں پالتے تھے۔ ہر گاؤں میں گھوڑا، بھینس اور گائے پائی جاتی تھی۔ ولایتِ پکھلی کے اس زراعتی ماحول میں مندرجہ ذیل صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا۔

کمبل سازی:

پہاڑی جنگلات کے علاقوں میں لوگ کثرت سے بھیڑ بکریاں پالتے تھے، جن سے وافر مقدار میں اون حاصل کی جاتی تھی۔ اس اون سے بہترین کمبل تیار کئے جاتے تھے۔ ان کمبلوں کی مانگ ہر طرف تھی؛ لہذا یہ لوگوں کی آمدنی کا معقول ذریعہ تھا۔ مضبوطی اور پائیداری میں اب بھی ہزارہ کے کمبل لاجواب ہیں۔

سُربازی:

آج ہزارہ کے لوگ، اپنے پیشروں کے اس مشروب سے آگاہ نہیں، لیکن توزکِ جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سُر ترکوں کے عہد کا ایک محبوب مشروب تھا۔ یہ مشروب شراب کا نعم البدل تھی اور اسے چاول اور گندم سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے خمیر کو کئی کئی برس تک مٹکوں میں بند کر دیا جاتا اور یہ جتنی پُرانی ہوتی اتنی ہی لذیذ ہوتی۔ جہانگیر اس مشروب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سُر اس علاقے کے لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔

جندرا اور پیکو بیلنا:

چونکہ اس ملک میں پانی وافر مقدار میں موجود تھا، اس لئے لوگوں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانی کے کٹھوں پر جندرا تعمیر کر رکھے تھے۔ موجودہ مشینی دور میں بھی ہزارہ کے لوگ جندرا کے پیسے ہوئے آٹے کو مشینی آٹے پر ترجیح دیتے ہیں۔ چاول تیار کرنے کے لئے پیکو کے بیلنے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ چاول کی فصل کے موقع پر پکھلی کے میدان میں ہر طرف پیکو چلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ لوگ دُور دُور سے آکر اس میدان کے چاول کو بیل گاڑی، گدھوں اور بیلوں پر لاد کر لے جاتے تھے۔ چاول بھی اہل پکھلی کی آمدنی کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔

لُنگی سازی:

میدان ہزارہ قارلق کے جولاہے لنگی سازی کے لئے بہت مشہور تھے۔ تقریباً ہر گاؤں میں جولاہوں کا ایک آدھ گھرانہ موجود تھا۔ ہر دلہن کو بڑے شوق کے ساتھ جہیز میں ایک چرخہ دیا جاتا تھا۔ جولاہے کھدر سوسی اور شکار کے کپڑے تیار کیا کرتے تھے۔ اہلِ ہزارہ کی پگڑی عموماً سات گز کی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کا گز بمشکل اٹھارہ انگل طول کا ہوا کرتا تھا۔ امراء اور شرفا کلاہ کا استعمال کرتے تھے۔ پگڑی کی چوڑائی عموماً تیرہ انچ ہوا کرتی تھی۔ چادر کا سائز ۱۰ گز × ۱½ گز ہوا کرتا تھا۔ اہلِ ہزارہ کا محبوب رنگ نیلا تھا، اس لئے وہ اسی رنگ کی لنگی کو ترجیح دیتے تھے۔ امراء کی لنگیوں کو سنہری تاروں اور ریشمی کناروں سے مزین کیا جاتا تھا۔

دلہن کی چادر اور دولہے کی لنگی کو چاندی اور سونے کی تاروں سے مزین کیا جاتا تھا۔ امراء چھنے کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ترکوں کے زوال کے بعد بدامنی اور تشدد کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا؛ تاہم اہلِ ہزارہ نے اپنی لنگی سازی کی صنعت کو کافی حد تک محفوظ رکھا۔ انگریزوں کے زمانے کی پہلی مردم شماری میں جولاہوں کی کل تعداد ۲۳،۰۳۸ نکلی۔ اس تعداد میں اُمب اور مظفر آباد کے جولاہے شامل نہیں تھے۔ اس وقت ہزارہ کے ضلع میں تقریباً ۳،۷۹۰ کھڈیاں موجود تھیں۔ ان کھڈیوں میں لنگی سازی اور کپڑا بننے کے ساتھ کالے اور نیلے رنگ کے پوت اور سالاریاں بھی تیار کی جاتی تھیں۔

فرنیچر سازی :

لکڑی کے کام میں کشمیری آرٹ کا اثر غالب تھا۔ تقریباً ہر گاؤں میں لوہار اور ترکھان موجود تھے، چونکہ فرنیچر سازی کے لئے یہاں لکڑی بکثرت پائی جاتی تھی، اس لئے اس زمانے میں فرنیچر سازی کا فن بہت ترقی یافتہ تھا۔ گھروں کے لئے جو فرنیچر تیار کیا جاتا، اس میں چارپائیاں، پلنگ، چرخے، دیارا (شمع دان) بیٹھنے کے لئے پیڑھی، پیڑھا اور تخت تیار کئے جاتے تھے۔ نماز پڑھنے کے لئے لکڑی کی جانمازیں تیار کی جاتیں۔ پاؤں میں پہننے کے لئے ایک لکڑی کا جوتا (کھڑاواں) بنایا جاتا تھا۔ کھانا کھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی میزیں (چوکیاں) بنائی جاتیں غلہ جمع کرنے کے لئے لکڑی کے بڑے بڑے صندوق (تونسڑیاں۔ کوٹھیاں) بنائی جاتیں۔ لکڑی سے خوبصورت ستون اور آلاتِ کاشتکاری بنائے جاتے تھے۔ مکانات اور جندروں کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال بکثرت کیا جاتا تھا۔ لکڑی پر گلکاری کا کام بڑی نفاست سے کیا جاتا تھا۔ لکڑی کے ہر کام میں محراب اور گنبد بنانے کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اہلِ ہزارہ کی کھٹ (چارپائی) اور پیڑھا وغیرہ بہت تہمن اور چمڑے سے تیار کئے جاتے تھے۔

پھلکاری :

ریشمی پھلکاری کا فن قابلِ فخر تھا۔ یہ فن ترکوں کے عہد میں تعلیمِ نسواں کا لازمی جزو تھا۔ مائیں اور استانیاں بچیوں کو بچپن ہی سے گھروں میں ریشمی پھلکاری کا کام سکھایا کرتی تھیں۔ ایک بچی کے لئے ریشمی پھلکاری کا فن نہ جاننا بڑے شرم کی بات ہوا کرتی تھی۔ پھلکاری کا کام آمدنی کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اس فن کے ساتھ اہلِ ہزارہ

کے شغف کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عورتیں مکانوں کی دیواروں پر بھی چکنی مٹی اور بھوسے کی آمیزش سے پھلکاری کا کام کیا کرتیں اور پھر اپنے کام کو مختلف رنگوں سے مزین کیا کرتی تھیں۔ درّانیوں اور سکھوں کا زمانہ اگرچہ بڑا پُرفتن تھا؛ تاہم پھلکاری اور کشیدہ کاری کا فن اس حد تک باقی رہا کہ ہزارہ گزیٹیئر ۸۲-۱۸۸۳ء نے لاہور سکول آف آرٹ کے پرنسپل مسٹر لاک وُڈ کپلنگ کے مندرجہ ذیل الفاظ کو تاریخی حیثیت دے کر نقل کیا۔ [1]

> "The domestic art of silk embroidry on cotton articles of attire attains in this district to a higher quality than in any other part of the province (Punjab including N. W. F. P.). In colour, live and variety of stitch, the Pbulkari sent to the Punjab Exibition of 1882, from Hazora, were voted the first place. The smaller scarves, and bags in black or dark green cotton, with coloured silk were more like Turkish embroidry than the ordinary type of Pbulkari"

یہ اقتباس ثابت کرتا ہے کہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کے گئے گزرے دورِ غلامی میں بھی ریشمی کشیدہ کاری اور پھلکاری کا فن تمام پنجاب، بشمول شمال مغربی سرحدی صوبہ کے علاقوں سے ممتاز اور ترقی یافتہ تھا۔ اس فن میں ترکی کشیدہ کاری کا نمونہ ترکوں کے عہد کی یادگار تھا۔

---

[1] Gazzettees & Hazara District, 1883-84, page 143

لباس

ہندی باشندوں کا قدیم لباس عموماً دھوتی ۔ تنگ اور چادر پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ایرانی اور یونانی اثرات کے تحت شلوار، قمیض اور پگڑی کا استعمال شروع ہوا۔ ترکوں کے عہد میں عوام کا لباس سُتھن (شلوار) چادر، لنگی، کمبل، کُرتا اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ غربا زیادہ تر کھدر اور سوسی کے کپڑے استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں میں گھاس کی پویں، کھڑاویں اور چمڑے کے بنے ہوئے جوتے پہنے جاتے تھے۔ سیاہ اور سفید رنگ کی پگڑیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ نیلے رنگ کی لنگی کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ منصب داروں کی پگڑیوں کا طرز جُدا جدا تھا۔ ترک عموماً کلاہِ تاتاری کا استعمال کیا کرتے تھے۔ مختلف اقوام کے افسروں کی بڑی شناخت ان کی پگڑیوں سے ہی ہوا کرتی تھی۔ والیانِ ریاست اپنی داڑھیوں کے گرد ایک رومال استعمال کیا کرتے تھے۔ کمر بند سفید رنگ کا ہوا کرتا تھا جس کی کناری سرخ رنگ کی ہوا کرتی تھی۔ کمر بند، مرصع خنجر، کلاہ، پھول کٹارہ، بٹن اور کلغی جیسے نشانات سے امراء کے درمیان تمیز کی جاتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں امراء چغے کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ امرا کی لنگیوں کو سنہری تاروں اور ریشمی کناروں سے مزین کیا جاتا تھا۔ شرفاء کا پسندیدہ پاپوش زری جوتا تھا۔

زنانہ لباس ہندی ترکی لباس کا ایک عجیب امتزاج پیدا کرتا تھا۔ ترک خواتین تیموری دور کے نمونے پر اپنے سروں پر ایک خاص قسم کی اونچی سی خود نما سُرخ ٹوپی پہنا کرتی تھیں جسے شوکلی پکارا جاتا تھا۔ بڑے گھرانوں کی مستورات کی شوکلی سُرخ ریشمی رنگ کی ہوا کرتی تھی اور اسے موتیوں اور جواہرات سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس ٹوپی کے بالائی حصے پر ایک گول کالر بنا ہوتا جس میں مختلف رنگوں کے پر لٹکائے جاتے تھے۔ بعض پر آنکھوں پر بھی لٹکتے رہتے تھے اور ان سے چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ مستورات

کے چہروں پر ایک نقاب بھی ہوا کرتا جس کو بوقتِ ضرورت الٹ دیا جاتا تھا۔ وہ ایک خاص طرز کا جبہ بھی پہنا کرتی تھیں جو بازوؤں کے بغیر ہوا کرتا تھا اور گلے کے قریب پہنچ کر دھاگے اور گوند کے استعمال سے تنگ کر دیا جاتا تھا۔ عام عورتوں کا محبوب لباس پوچھن اور سالارا بھی تھا۔ ان کی شوکلی میں سلمہ ستارہ اور موتی لگے ہوتے تھے۔ کپڑوں کی طرح عورتوں کے زیورات بھی ہندی، ترکی اور ایرانی نمونوں پر مشتمل تھے۔ اکثر زیورات سونے اور چاندی کے بنے ہوتے تھے۔ ٹکہ، بھادری، تعویز، نتھ، دادنی مرصع، لونگ، جھمکہ، ڈبیڈو، ہار طلائی، ہار نقرہ، ٹھلاں طلائی، بوہٹہ، گوکھڑو، کڑا، سیری، چونپ کلی، آرسی، چوڑی، پازیب، کڑیاں، ٹاڈ، بابیاں اور بازو بند عورتوں کے مشہور زیورات تھے۔ حُسن کو دوبالا کرنے کے لئے مہندی، سُرمہ اور غازہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شہنشاہِ اکبر کی نقل کرتے ہوئے کچھ لوگ لڑکوں کو بھی کانوں میں بالیاں پہنانے لگے تھے۔

٭

رسم و رواج

تہذیب کی ترقی یا تنزل کے ساتھ ساتھ رسم و رواج کی تبدیلی ایک قدرتی امر ہے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مذہب کی تبدیلی اور اسلامی تہذیب کے غلبے کے باوجود ولایتِ پچھلی کے رسم و رواج اپنی اصل کے اعتبار سے ہندی ہی رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت ایسے رسم و رواج کی مخالف نہیں جو قانونِ الٰہی کی رُو سے حلال یا مباہات کی قبیل سے ہوں۔ ترکوں کے زمانے کے رسم و رواج ترکی، ہندی اور ایرانی رسومات کی ایک کھچڑی سی تھے، ان میں سے بعض کو ازروئے شریعت حلال، بعض کو مباح اور بعض کو بدعات کے درجے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ مذہبی رسومات کا تذکرہ ایک الگ عنوان کے تحت گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، اس لئے یہاں صرف ایسے رسم و رواج کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا تعلق عمرانی زندگی، بالخصوص شادی بیاہ اور ماتم وغیرہ کی رسومات سے ہے۔ ان رسومات کے ساتھ عوام کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ نہ تو تنگدستی اور غلامی کی زندگی ہی انہیں ختم کر سکی اور نہ ہی جدید تعلیم کی روشنی ہی سے ان کی ادائیگی میں کوئی نمایاں فرق پیدا کیا جا سکا ہے۔

نکاح کو اس ملک میں ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے؛ البتہ اسلام کی آمد اور غلبے کے بعد نکاح کی صورت بدل گئی تھی۔ شادی کو یہاں صدیوں سے خوشی کی معراج تصور کیا جاتا رہا اور اس پر زندگی بھر کی خون پسینہ کی کمائی کو پانی کی طرح بہایا جاتا رہا ہے۔ سوئمبر کی رسم ترکوں کی آمد سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شادی کی رسومات کا آغاز منگنی کی رسم سے ہوا کرتا تھا۔ اس رسم کی ادائیگی کے لئے پہلے مستورات کا ایک گروہ بن ٹھن کر دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر کو روانہ ہوتا۔ اس گروہ کے ہمراہ میراثنوں کا ایک ٹولہ بھی ہوتا۔ حجام اور چند دیگر افراد مٹھائی بتاشے اور پکوان کے ٹوکرے اٹھائے آگے آگے چلتے

جاتے تھے۔ دلہن کے گھر پہنچ کر یہ تحفے پیش کئے جاتے۔ دلہن کو ایک سُرخ رنگ کا جوڑا پہنایا جاتا۔ اسے زیورات سے آراستہ کرنے اور مہندی کی رسم ادا کرنے کے بعد دوہٹی یعنی دُلہن بنایا جاتا۔ گانے بجانے اور ناچنے کے بعد مستورات کا ایک گروہ واپس دولہا کے گھر چلا آتا، اس کے بعد مردوں کی باری آتی۔ دونوں اطراف کے مردوں کا ایک جگہ دلہن کے گھر جمع ہو جاتا۔ شربت اور چلم سے ان کی میزبانی کی جاتی اور پھر شرح جواب کی رسم ادا کی جاتی۔ دونوں اطراف کے والدین بآوازِ بلند شرح جواب کے الفاظ ادا کرتے۔ اس کے بعد شیرینی تقسیم کی جاتی اور دعائے خیر کے بعد مرد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

شادی کی تاریخ باہمی مشورے سے طے ہوتی۔ علمِ نجوم کے حساب سے چاند کی بعض تاریخوں کو مبارک اور بعض کو نحس شمار کیا جاتا تھا۔ شادی سے تین روز قبل "مایاں" کی رسم شروع ہو جاتی۔ دلہن کو سیج پر بٹھا دیا جاتا اور دولہا کو ایک ہاتھ میں گانا (ہار) پہنا دیا جاتا۔ تین دن تک گانا بجانا جاری رہتا۔ شادی کے دن علی الصبح دولہا کے گھر والیاں اپنی سہیلیوں سمیت دولہا کو غسل دینے کے لئے ایک خوبصورت گھڑے (ڈولی) میں پانی بھر کر لاتیں۔ دولہا میاں عورتوں کے جھرمٹ میں غسل کرتا اور پھر اسے مہاراجہ بنایا جاتا۔ نئے کپڑے پہن کر دولہا اپنے سر پر ایک سہرا بندھواتا جس سے اس کا چہرہ کافی حد تک چھپ جاتا۔ پھر دولہا یا مہاراجہ کو بالعموم ایک نیلے رنگ کی لنگی میں لپیٹ کر گھوڑے پر سوار کر دیا جاتا۔ اس کے دو دوست ہاتھوں میں لکڑی اور کاغذ کے خوبصورت رنگوں سے بنے ہوئے دو تیر ہاتھوں میں اٹھائے اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے۔ اس موقع پر نٹ بھانڈ اور بہجڑے گا بجا کر روپیہ بٹورتے۔ باراتی مہاراجہ کے گرد جمع ہو جاتے۔ میراثی اور ناچنے والے نوجوانوں کی ٹولیاں بارات کے آگے آگے روانہ ہو جاتیں اور ناچنے والی ٹولیوں کے ہاتھوں میں بسا اوقات چٹکیاں، ڈنڈے یا گتکے ہوتے۔ اس سج دھج کے ساتھ بارات دلہن کے گھر پہنچتی۔

شربت اور چلم کے ساتھ بارات کی تواضع کی جاتی۔ دولہا میاں کو اس کے دوستوں سمیت ایک مخصوص مقام پر بٹھا دیا جاتا۔ دلہن کے قریب اس کی سہیلیاں رنگا رنگ گیت گاتیں اور بڑے انہماک کے ساتھ اسے دوہٹی بناتیں۔ باراتی دلہن کے گھر کے قریب کسی کھلے میدان میں یا گاؤں کے حجرے میں جمع ہو جاتے۔ یہاں مجمع عام کے اندر رُوٹی اٹھانے (وزن اٹھانے)، ٹُمن مارنے (نشانہ بازی)، کبڈی کھیلنے، گتکا بازی اور نیزہ بازی کے مقابلے ہوتے۔ جی بھر کر کھیلنے اور ناچنے کے بعد سب لوگ دلہن کے گھر جمع ہو جاتے اور

پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ رسم نکاح ادا کی جاتی؛ چونکہ اس ملک میں صرف اہل سنت والجماعت مسلمان ہی رہتے تھے، اس لئے نکاح فقہ حنفیہ کے مطابق سرانجام دیا جاتا تھا۔ نکاح کے بعد دُعائے خیر ہوتی اور پھر شیرینی تقسیم کی جاتی۔ اس موقع پر گاؤں کا حجام مہاراجہ کو شیشہ کا تحفہ پیش کر کے انعام حاصل کرتا۔ نکاح کے بعد دولہا یا مہاراجہ اپنی ساس کے سلام کے لئے دلہن کے گھر کے اندر چلا جاتا۔ یہاں گھر والیوں کے جھرمٹ میں اپنے آپ کو گرفتار پاکر اسے رنگ برنگ مذاق کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مذاق کو برداشت کر لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ بہرحال سلام کے بعد دلہن کی ڈولی تیار کی جاتی۔ دلہن کو ڈولی میں بٹھانے کا منظر بڑا حسرت ناک مگر قابلِ دید ہوتا۔ سہیلیاں خوشی سے گیت گاتیں، مگر والدین اور دلہن کی آنکھوں سے جدائی کے آنسو رواں ہو جاتے۔ خوشی اور غم کے اس ملے جلے ماحول میں ڈولی روانہ ہوتی۔ دولہا کا بڑا بھائی یا والد تر کی رسم کے مطابق ڈولی پر سکے نچھاور کرتا۔ عجب تماشا یہ ہوتا کہ دولہن کے گھر والیاں دولہا کے گھر والیوں یا باراتیوں پر آوازے کسنے شروع کر دیتیں۔ یہاں تک کہ نوبت ننگی گالیوں تک بھی پہنچ جاتی۔ ہندکو زبان میں ان آوازوں اور گالیوں کا نام سُٹھنیاں رکھا گیا تھا۔ "سُٹھنیاں اور ہیریاں" وصول کرنے کے بعد بارات، ڈولی لے کر واپس لوٹتی۔ جوں ہی بارات دولہا کے گھر کے سامنے پہنچتی، دولہا کے گھر والیاں خوشی کے عالم میں مخصوص گانے گا گا کر اس کا استقبال کرتیں اور ایسا دکھائی دیتا گویا کہ مہاراجہ ایک عظیم فتح حاصل کرنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہا ہو۔ ڈولی اتارتے وقت عام طور پر دُلہن کو سونے چاندی، روپے یا گائے بھینس کی شکل میں دولہا کی طرف سے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جاتا۔

ولیمہ کی دعوت عموماً شادی کے روز ہی دی جاتی تھی۔ چاول، گھی، شکر اور گوشت، عوام کے مرغوب کھانے تھے۔ امراء کی دعوتوں میں دسترخوان بچھا دیئے جاتے۔ ملازم دوزانو ہو کر مہمانوں کے سامنے کھانے کے برتن پیش کرتا اور اس کے مونڈھے پر ایک رومال یا تولیہ لٹکا ہوتا تھا۔ ترک سردار گھوڑے کی بھُنی ہوئی ران اور شراب استعمال کرتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ اسپ خوری اور شراب نوشی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسرے حلال جانوروں کا گوشت اور سرکے مشروب استعمال ہونے لگے۔

جس طرح شادی کو خانہ آبادی کی تقریب تصور کیا جاتا تھا، اسی طرح ماتم کو خانہ بربادی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خاوند کے مرنے کے بعد ہندو بیوہ تو چتا میں چھلانگ لگا کر زندہ جل مرتی تھی اور اسے ستی کی رسم کہا جاتا تھا، لیکن مسلمان بیوہ صرف سوگ منانے پر ہی اکتفا کرتی تھی۔ اسے خاوند اور والدین

کی طرف سے میراث کا مقرر حصہ اور معاشرہ کی طرف سے ضرورت کے مطابق زکوٰۃ، صدقات ملنے کی بھی اُمید ہوا کرتی تھی، اس لیے ہندو بیوہ کے مقابلے میں مسلمان بیوہ کو اچھا خاصا مادی سہارا مل جاتا تھا، مگر اسلامی شریعت کے قانون کی موجودگی کے باوجود مسلمان بیوائیں معاشرتی دباؤ یا باپ دادا کے دیرینہ اثرات کے تحت آسانی سے دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ میت پر رونے اور بَین کرنے کا رواج موجود تھا، لیکن پیٹنا اور گریبان پھاڑنا منع تھا۔ کفن دفن کی تمام رسومات اسلامی تھیں جو تا حال جاری ہیں۔

فصل کاٹنے اور گھاس کاٹنے کے مواقع پر کھیتوں میں بڑی رونق ہوا کرتی اور ہشری کے موقع پر تمام اُلُس اکٹھا ہو جاتا (اُلس اور ہشری دونوں ترکی زبان کے الفاظ ہیں اور ابھی تک اس ملک کے بیشتر علاقوں میں مستعمل ہیں) اور لوگ باہمی تعاون اور ہمدردی کے جذبے سے ایک دوسرے کے کام کرتے۔ ہشری کے وقت ڈھول باجے اور دعوت کا اہتمام کیا جاتا۔ شادی، ماتم، ہشری اور اس قسم کے دوسرے مواقع پر ہر گاؤں یا محلے کا کم از کم ایک فرد ہر گھر سے آکر لازماً شرکت کرتا۔ اس طرح گاؤں یا محلے میں برادری اور بھائی چارے کی فضا قائم رہتی۔ لوگ فصل کاٹنے، گھاس کاٹنے، لکڑی اٹھانے، مکان تعمیر کرنے، قبر کھودنے، پُل تعمیر کرنے، مسجد تعمیر کرنے اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا کرتے تھے۔ اسی تعاون کی وجہ سے ان کی زندگی میں امن، خوش حالی اور مسرت کا دَور دورہ تھا۔

٭

عمارات

شہر یا قصبہ کی خوبصورت ترین عمارات مسجد، مندر اور والیانِ ریاست کے محلات یا قلعے ہوا کرتے تھے۔ یہ تمام عمارات پختہ ہوا کرتی تھیں اور ان کی تعمیر میں پتھر، اینٹ، چونا بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر گاؤں میں عموماً مسجد کے قریب گاؤں کے مقدم، نمبردار یا خان کا حجرہ ہوا کرتا تھا جسے اہلِ ہزارہ بیٹھک یا ڈیوڑھی کے نام سے پکارتے تھے۔ شادی، ماتم اور ہشری جیسے مواقع پر تمام اہلِ دیہہ حجرے کا استعمال کر سکتے تھے۔ عام لوگوں کے مکانات کچے ہوا کرتے تھے اور انہیں پتھر، لکڑی اور مٹی سے تعمیر کیا جاتا تھا؛ چونکہ پتھر، لکڑی اور مٹی بکثرت دستیاب تھی، اس لئے مکان کی تعمیر کوئی بڑا مسئلہ نہ تھی۔ مکانوں کی اندرونی دیواروں پر چونے، مٹی اور کیچڑ کے مختلف رنگوں سے گلکاری کی جاتی تھیں۔ لکڑی کے ستونوں، محرابوں، دروازوں اور کھڑکیوں پر گلکاری کے عمدہ نمونے کندہ کئے جاتے تھے۔ شاہی محلات اور مساجد میں داخلہ کے وقت جوتے اُتار لئے جاتے تھے۔ مال مویشیوں کے لئے کھیتوں میں باڑی یا کُرڑھ تعمیر کی جاتی تھی۔ مساجد کے خدام، غسال اور کمین لوگوں کو فصل کے موقع پر کھیلن دی جاتی تھی۔ امام مسجد کا وظیفہ مقرر تھا اور گاؤں یا قصبہ کے شرفا مسجد کے متولی ہوا کرتے تھے۔

تفریحات

عوامی تفریحات میں کبڈی کھیلنا، گلی ڈنڈا، تیراکی، گتکا بازی اور پہلوانی جیسی کھیلیں شامل تھیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ٹمن مارنے (نشانہ بازی) اور کٹی اٹھانے (وزن اٹھانے) کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ عوامی میلوں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ گیت گاتے اور ناچ تماشے دکھانے کا رواج تھا۔ ہیجڑے، نٹ، بھانڈ، میراثی، کنجر، شعراء اور سوانگی سب اپنے اپنے فن سے حاضرین کو محظوظ کیا کرتے تھے۔ اہل ہزارہ کے چار بیتے (رباعیاں) بڑے نرالے طریقے سے طنبورے کے ساتھ چار چار کی ٹولیوں میں گائے جاتے تھے۔ ہر ٹولی کا ایک سردار ہوا کرتا تھا۔

ان شعراء کا ایک دوسرے کو چیلنج دینے اور بدیہہ گوئی کا منظر قابل دید ہوا کرتا تھا۔ عموماً چار بیتے بڑے نصیحت آموز ہوا کرتے تھے۔ تقریباً ہر چار پانچ کوس کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی سرائے موجود ہوتی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ٹھہرنے کا الگ الگ انتظام ہوا کرتا تھا۔ سرائے کے ساتھ ہی داروغہ ڈاک چوکی کا دفتر بھی ہوا کرتا تھا۔ مسافروں کی آمد و رفت اور ڈاک کی ترسیل کی وجہ سے ان سراؤں میں کافی چہل پہل رہتی اور رات کے وقت لوگ عموماً قصہ گو کے پاس ایک آدھ قصہ سننے کے لئے جمع ہو جاتے۔ قصہ الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہؓ اور قصہ یوسف زلیخا جیسے قصے اور افسانے سنا کر قصہ گو حضرات لوگوں کو محظوظ کرتے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتھائیں بھی بڑی دلچسپ ہوا کرتیں۔

امراء کی کھیلوں اور مشغلوں میں چوگان بازی، کبوتر بازی، نیزہ بازی، شکار، شطرنج بازی وغیرہ جیسی چیزیں شامل تھیں۔ امراء کی ترقی کے مواقع پر کئی کئی روز تک جشن منائے جاتے تھے۔

معاشرتی گروہ بندی

ترکوں کے عہد کے معاشرہ کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سرِ فہرست حکمران اور شاہی منصب دار تھے۔ یہ حضرات سول انتظامیہ اور فوج ہر دو کے افسرانِ بالا ہوا کرتے تھے۔ والیانِ ریاست اور شاہی منصبداروں کی تقرری شہنشاہ کی منظوری سے ہوا کرتی تھی۔ دفاعی خدمات سرانجام دینے کے علاوہ یہ حضرات ملک میں امن و امان بحال کرنے، شاہراہوں کی حفاظت کرنے اور لگان وصول کرنے کے فرائض بھی سرانجام دیا کرتے تھے۔ دوسرے درجہ پر دفتری، علماء، ماتحت عملہ، سوداگر اور پیشہ ور حضرات تھے۔ تیسرے درجے پر کاریگر، مزدور، کسان، نجی ملازمین اور دکاندار تھے۔ چوتھے درجے میں غلام، بیجڑے اور کمین لوگ ہوا کرتے تھے۔ کسان طبقہ میں بھائیوال (حصہ دار) ہالی (ہل چلانے والے) اور چھمائیندار (چھ ماہ بعد غلہ کی صورت میں تنخواہ وصول کرنے والے) ہوا کرتے تھے۔ ترکھان، لوہار، موچی، ڈوم اور حجام قسم کے کمین لوگوں کو فصل تیار ہونے اور کھلاڑہ (کھلیان) کے موقع پر فصل یا غلہ کی صورت میں معاوضہ دیا جاتا تھا اور اسی وجہ سے انہیں کھلین پکارا جاتا تھا۔ یہ کمین طبقے کے لوگ دیہاتی زندگی میں کسانوں کے لئے بڑے کارآمد اور معاون ثابت ہوتے تھے۔ کمین لوگوں کے پیشے موروثی ہوا کرتے تھے اور بہت کم ہی ایسا ہوتا کہ ایک شخص اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرتا؛ چونکہ ایک ہی پیشہ کو اختیار کئے ہوئے ایک خاندان کی کتنی ہی نسلیں گزر جاتی تھیں، اس لئے اسی پیشے کی نسبت سے اس کی ذات یا قوم کا تعین کیا جاتا تھا، لیکن مندرجہ بالا معاشرتی گروہ بندی قدیم ہندو معاشرے کی طرح چار یا پانچ مستقل ذاتوں میں تقسیم نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ معاشرہ میں ہر شخص کو اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بناء پر اعلیٰ درجے میں ترقی کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ بعض اوقات غلام ترقی کرتے کرتے

حکمرانی کے بلند منصب تک جا پہنچے اور بعض اوقات امراء کے بیٹے اپنی نااہلی کی بدولت ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق پیشہ یا فن منتخب کرنے کا قانونی حق حاصل تھا۔ شہریوں کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو شریعتِ الٰہیہ کے ان کے لئے مقرر کر رکھے تھے اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے شرعی عدالتیں موجود تھیں۔ مختلف پیشوں کا موروثی بن جانا خاندانی ماحول اور وقت کے تقاضوں کی وجہ سے تھا نہ کہ از روئے قانون لازمی تھا۔

٭

خطبہ و سکہ

خلافتِ راشدہ کے زمانے سے بنو عباس کے زمانے تک اسلامی ممالک میں خلفاء کے نام کا خطبہ و سکہ رائج تھا، لیکن ترکوں کے عروج کے بعد خطبہ و سکہ کے اجراء میں نمایاں تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ عثمانی ترکوں کی خلافت کے علاقوں میں عثمانی خلفا کے ناموں کا خطبہ و سکہ رائج تھا، لیکن مشرقی ممالک کے ترک حکمرانوں نے اپنے اپنے ملک میں اپنے ناموں کے خطبے اور سکے جاری کر دیئے اور علمائے اسلام نے حالات کی ضرورت کے تحت انہیں جائز قرار دے دیا۔ حکمرانی کا نمایاں اظہار خطبے اور سکے ہی کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔

ہندوستان میں سونے، چاندی اور دیگر دھاتوں کے سکے یونانیوں کے دورِ حکومت ہی سے رائج چلے آرہے تھے۔ لہٰذا ترک حکمرانوں کو ان کے اجرا میں زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ امیر تیمور کے حملے کے زمانے تک اس ملک میں لولو، ضروار، دام، ٹنکہ اور دیناروں جیسے سکے جاری تھے، لیکن ان کی کمیت، باہمی مطابقت اور حساب معیاری نہ تھا، اس لئے اکبر بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل، مظفر خان اور شاہ منصور کی زیر سرپرستی ۱۵۷۷ء میں کرنسی کے نظام کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ سونے چاندی اور تانبے کے نئے سکے جاری کئے گئے۔ سونے کے سکوں کی کل ۲۶ اقسام تھیں۔ ان تمام میں اعلیٰ سکہ "شہنشاہ" تھا جس کا وزن ۱۰۱ تولہ ۹ ماشے اور ۷ سرخس تھا اور سب سے کمتر "مہر" تھا جس کا وزن ۹۱ تولے ۸ ماشے تھا۔ "آفتاب" اور "الٰہی" دس روپیہ کے برابر ہوا کرتے تھے۔ چاندی کے مشہور سکے کا نام "روپیہ" تھا اور اس کا وزن ½ ۱۱ ماشے ہوا کرتا تھا۔ تانبے کا مشہور سکہ "دام" کہلاتا تھا اور اس کا وزن ۵ ٹنکے یعنی ایک تولہ ۸ ماشے اور ۵ سرخس تھا۔

روزمرّہ کی مزدوری دو دام یعنی ایک دونی کے برابر ہوا کرتی تھی، لیکن پیشہ ور حضرات کی مزدوری ۴۸ دام تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ آئینِ اکبری میں روزمرّہ کی ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہیں۔

نام شے	قیمت فی من	نام شے	قیمت فی من
گندم	۱۲ دام	چاول گھٹیا	۲۰ دام
جَو	۸ دام	مونگ	۱۸ دام
چاول بہترین	۱۱۰ دام	ماش	۱۶ دام
موٹھ	۱۲ دام	دُودھ	۲۵ دام
جوار	۱۰ دام	نمک	۱۶ دام
گھی	۱۰۵ دام	شکر	۶ دام فی سیر

اس زمانے میں ایک من ۵۵½ پونڈ یا ۲½ جدید من کے برابر ہوا کرتا تھا۔ پچھلی سرکار اور بنجارہ قارلق میں وزن کے پیمانے دو طرح کے جاری تھے۔ ایک کا نام محمود شاہی سیر اور دوسرے کا نام بہادر شاہی سیر تھا۔ وزن کے یہ پیمانے انگریزوں کی آمد تک اس علاقے میں رائج تھے۔

❖

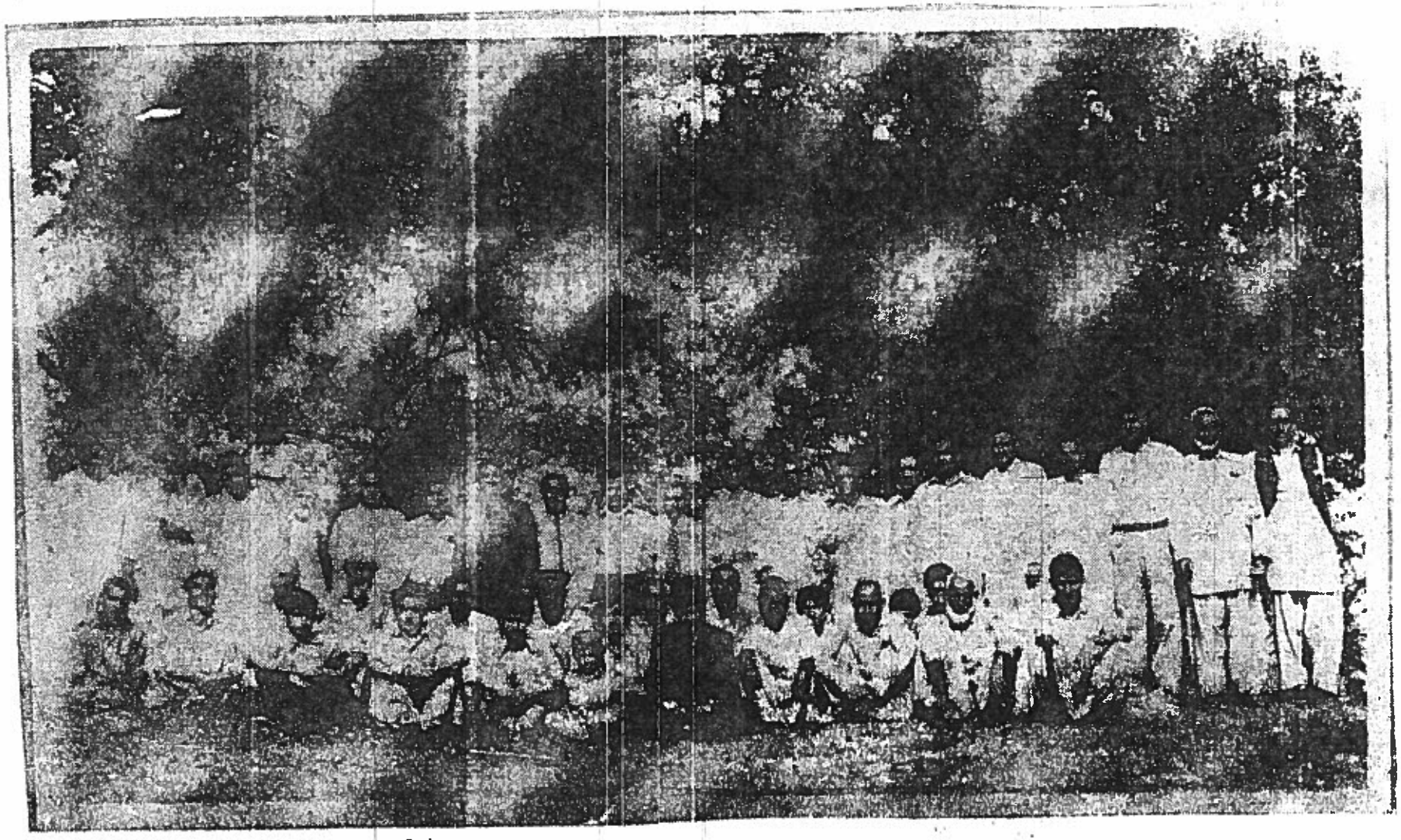

ترکانِ تیموری کا ایک گروہ مصنف کے ہمراہ قلعہ گلی باغ کے احاطے میں

ترک دورِ غلامی میں

ہندو دور سے ترکوں کے عہد تک کی تاریخ کے اہم خدوخال گزشتہ اوراق میں بیان کئے جا چکے ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ۱۰۰۰ء سے اٹھارھویں صدی تک طویل عرصے میں ترکوں کے متعدد شاہی خاندانوں نے غزنی، کابل، لاہور، دہلی اور آگرہ کے دارالحکومتوں سے تمام برصغیر پر حکمرانی کی ہے۔ ولایتِ پکھلی میں غزنویوں کے عہد میں اوّل اوّل اسلام متعارف ہوا۔ غوریوں کے عہد میں اسلام کا تعارف وسیع تر ہو گیا اور امیر تیمور کے حملے کے بعد یہاں ترک مسلمانوں کا مستقل غلبہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد تین سو برس تک ترکوں کا ایک ہی قبیلہ یہاں حکمرانی کرتا رہا اور بالآخر ۱۷۱۳ء میں تسخیر گلی باغ کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ بمبہ، سواتی، تنولی، جدون اور دوسرے متعدد قبائل ولایتِ پکھلی کے مختلف ٹکڑوں پر قابض ہو گئے، لیکن ان میں سے کوئی بھی قبیلہ ولایتِ پکھلی کے سارے علاقے پر اپنی حکمرانی قائم نہ کر سکا۔ یہ قبائل باہمی کشمکش اور چھینا جھپٹی میں مصروف ہی تھے کہ افغانستان کے علاقے سے درّانی افواج نے اس علاقے میں پیش قدمی شروع کر دی اور اہلِ ہزارہ کو ان کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ترکوں کی نصف سے زیادہ تعداد ہجرت کر کے کشمیر چلی گئی اور جو یہاں باقی بچے ان میں سے بعض کو یہاں جزوی کامیابیاں حاصل ہو گئیں؛ لہٰذا انہوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ انہی باقیماندہ ترکوں میں سے سلاطینِ پکھلی کی اولاد کے بیشتر افراد آج تک ضلع ہزارہ میں آباد ہیں؛ لہٰذا یہ باب ان ہی ترکانِ ہزارہ کے دورِ غلامی کے حالات قلمبند کرنے کے لئے وقف کیا جاتا ہے تاکہ وہ خود بھی اور اہلِ ہزارہ میں سے تاریخ کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی اس تاریخی قبیلے کے انجام سے باخبر ہو سکیں

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انگریزوں کے زمانے کی پہلی مردم شماری، پنجاب اور سرحد کے تمام گزیٹیرز، ٹوڈ اور وائکلی جیسے مصنفین کی کتاب پنجابی مسلمان اور اکثر دیگر تاریخی دستاویزات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہزارہ اور کشمیر کے ترکوں کے علاوہ آج ترکوں کا کوئی اور قبیلہ پنجاب اور سرحد میں موجود نہیں۔ اگر کچھ ترک پنجاب اور مرکزی ہند میں موجود بھی تھے، تو لوگ انہیں مغل کے نام سے پکارتے تھے، وہ خود بھی اپنے لئے یہی لفظ مغل استعمال کرتے رہے، لیکن جیسا کہ گزشتہ اوراق میں لفظ ترک اور مغل کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ مغول درحقیقت چنگیز خان کے دور میں ایک سرکاری اصطلاح تھی جس کا اطلاق اس کے تمام عساکر پر ہوا کرتا تھا۔ چنگیز خان کی اسی اصطلاح اور اس کے مغول کے دبدبے کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے لوگوں نے تورانی النسل ترکوں کو بھی مغولان پکارنا شروع کر دیا۔ عوامی سطح پر چنگیز خان کے بعد شمال کی طرف سے آنے والے ہر حملہ آور کو مغل ہی پکارا جاتا رہا؛ حالانکہ تمام مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے صرف منگولیا یا مغولستان کے لوگ منگول، مغول یا مغل تھے۔ لفظ مغل کے اسی غلط استعمال کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کے لوگ ترکوں کو، بالخصوص سلسلۂ بابری کے تیموری ترکوں کو مغل ہی پکارتے رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شاہی نسل کے افراد پر اتنے مظالم توڑے گئے کہ ان میں سے بعض نے خوف کے مارے اپنی قومیت بدل لی اور بعض شہری علاقے سے نکل کر دُور دراز علاقوں میں روپوش ہو گئے۔

لیکن ہزارہ قدیم میں سلاطینِ پکھلی کو عوام ترک ہی پکارتے تھے گو کہ ان کے ناموں کے ساتھ راجہ کا لقب بھی استعمال ہوتا رہا۔ تمام کتب تاریخ میں انہیں مغل نہیں، بلکہ ترک ہی لکھا گیا ہے، حتیٰ کہ تاریخ ہزارہ اور ہزارہ گزیٹیر تک میں بھی انہیں ترک ہی لکھا گیا۔ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ انگریز ۱۸۴۸-۴۹ء میں ہزارہ پر قابض ہوئے۔ انہوں نے ترک سرداروں کو جیل میں ڈالا۔ ان سے ان کی بیشتر املاک چھین کر انہیں مفلوک الحال بنا دیا اور ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے، لیکن ان تمام تدابیر کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انگریزوں نے یہاں ترک قوم کی بیخ کنی نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ سارا ہندوستان فتح کرنے کے بعد انگریز یہاں تک پہنچا تھا اور اسے یقین تھا کہ اب اس علاقے کے ترکوں میں اتنی سکت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے خلاف باغیانہ روش اختیار کر سکتے۔ پس ہندوستان اور پاکستان میں آج اگر کسی تاریخی ترک قبیلہ کی بقا کا مستند تاریخی ثبوت فراہم ہو سکتا

ہے تو وہ صرف ضلع ہزارہ کا یہی ترک قبیلہ ہے جو سلاطین پکھلی کی اولاد میں سے ہے اور جس کے افراد ہزاروں کی تعداد میں ہزارہ اور کشمیر میں زندہ موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کے دورِ غلامی کے حالات اور ان کے مشہور خانوادوں کا شجرہ نسب قلمبند کرنے کے لئے یہ باب مختص کیا ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کے زمانے میں ترکوں کے خلاف اختیار کئے گئے ظالمانہ رویے پر مجموعی نظر ڈالنے سے مندرجہ ذیل حقائق واضح نظر آتے ہیں:

۱۔ ترکوں کے زمانے کے اہم شہروں اور قصبوں کو یا تو سرے سے مسمار کر دیا گیا اور یا پھر ان کی اہمیت ختم کرنے کے لئے نئے شہر اور قصبے تعمیر کئے گئے۔ مانگلی کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ بیدادی، دھتوڑ، شیروان اور مانکرائے کی اہمیت ختم کرنے کے لئے سکھوں اور انگریزوں نے مانسہرہ، نواں شہر، ایبٹ آباد اور ہری پور کے قصبے آباد کئے۔ گلی باغ اور کوڑمنگ پہلے ہی خانہ جنگی کے زمانے میں تباہ و برباد ہو چکے تھے۔

۲۔ گزشتہ اڑھائی سو برس کے طویل عرصے میں ترکوں کے عہد پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی؛ حالانکہ تمام مصنفین جانتے ہیں کہ درانیوں کی آمد سے قبل صدیوں تک یہاں ترکوں کی حکمرانی قائم رہی۔ ترکوں کے عہد کی تاریخ پر تاریکی کے پردے ڈال دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنے شاندار ماضی سے بے خبر ہو گئے اور تاریخ ہزارہ محض سکھوں اور انگریزوں ہی کے عہد کی تاریخ کا نام رہ گیا۔

۳۔ درانیوں کے عہد تک ترک پٹی مانکرائے اور پکھلی کے بعض دیہات پر کسی حد تک قابض رہے لیکن سکھوں نے انہیں ان کی بیشتر املاک سے بے دخل کر دیا اور ان کے اکثر مواضعات دوسرے لوگوں کو عطا کر دیئے۔

۴۔ کیپٹن ایبٹ کے ہزارہ پر قابض ہونے کے وقت ترک سرداروں بالخصوص فتح خان اور حیات خان کو گرفتار کر کے قلعہ ہرکشن گڑھ میں قید کر دیا۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۷۰ء کے بندوبست میں ترکوں کی بقیہ اراضیات کا بیشتر حصہ ان سے چھین لیا گیا۔ انہیں ایک دوسرے سے اتنے دور دراز دیہات میں آباد رہنے دیا گیا کہ جن میں رہتے ہوئے وہ آپس میں رہتے ہوئے وہ آپس میں سیاسی یا معاشرتی تعلقات بمشکل قائم رکھ سکتے تھے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند پشتوں بعد وہ کافی حد تک ایک دوسرے سے کٹ گئے۔

۵۔ اس طویل عرصے میں ترکوں کو کوئی جاگیر نہیں عطا کی گئی۔ جاگیر عطا کرنا تو درکنار انگریزوں نے کسی ترک کو خان بہادری یا خانصاحبی جیسے ذلیل مناصب سے بھی نہیں نوازا۔

۶۔ گزشتہ عالمی جنگ تک ترکوں کو فوج یا سول انتظامیہ کے کسی عہدے پر تعینات نہیں کیا گیا حالانکہ

خود انگریزوں کی مردم شماری کے مطابق ترک ہزاروں کی تعداد میں یہاں آباد تھے، انہیں زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی گئی کہ وہ جہاں کہیں آباد تھے، انہیں اپنی زمینوں کے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔

انگریزوں کے زمانے کی مردم شماریوں کے مطابق ۱۸۶۹-۷۰ء میں ضلع ہزارہ میں ترکوں کی کل تعداد ۹۷۰ر۱ تھی۔ ۱۸۹۱ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۸۲۱ر۳ ہوگئی، مگر ۱۹۰۱ء میں ان کی تعداد ۳۷۹ر۲ رہ گئی۔ ہزارہ گزیٹیر میں ترکوں کی یہی تعداد درج ہے۔ ۱۸۶۹-۷۰ء میں ضلع ہزارہ کی کل آبادی ۵۰۵ر۳۴۳ر۳ تھی۔ ترکوں کے خلاف کئے گئے مندرجہ بالا اقدام کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیاسی اور معاشی طور پر تباہ و برباد ہوگئے، مگر پھر بھی وہ بقیہ ہندوستان کے ترکوں کے مقابلے میں نسبتاً کم خسارے میں رہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ ہندوستان کی آخری سرحد پر واقع تھا اور یہاں پہنچ کر انگریزوں کو یقین ہو چکا تھا کہ ترکوں کی یہ تھوڑی سی آبادی ان کے لئے تشویش کا سبب نہیں بن سکتی؛ لہذا انہوں نے بقیہ ہندوستان کی طرح ترکوں کو سرے سے ختم کرنے کی بجائے انہیں معاشی بدحالی میں مبتلا کر دینا ہی کافی تصور کیا، مگر انگریزوں کی اس سختی کا ایک اچھا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ یہاں کسی نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو ترک کہلوانے کی جرأت نہ کی، کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ ترک کہلوانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس طرح ترکان تیموری کی یہ شاخ مکمل طور پر نسل کشی سے بچ نکلی۔ ترکوں کی اسی شاخ کے بچ نکلنے کے متعلق کرنل واٹکلی لکھتا ہے:[1]

> **Of the Turks but few remain, a single tribe in Hazara being the sole representative".**

کتاب پنجابی مسلمان کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہزارہ کے اس ترک قبیلہ کے علاوہ پورے پنجاب میں ترکوں کا کوئی دوسرا قبیلہ باقی نہیں رہا۔ برصغیر ہند و پاکستان پر صدیوں تک حکمرانی کرنے والی ترک قوم کے اس انجام میں تمام انسانوں کے لئے عبرت حاصل کرنے کا ایک نہایت مفید سبق موجود ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

---

[1] پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل واٹکلی صفحہ ۷

ترکی پٹی مانک رائے :

۱۶۶۰ء سے ۱۶۷۴ء کا درمیانی زمانہ تمام صوبۂ سرحد کے علاقے میں بدامنی اور انتشار کا زمانہ تھا۔ بہاکو خان یوسف زئی، خوشحال خان خٹک اور ایمل خان آفریدی نے تمام قبائل کو سلطنتِ مغلیہ کے خلاف اُبھار دیا تھا۔ شاہراہِ کابل خطرے میں پڑ چکی تھی۔ بغاوت اور بدامنی کے اثرات ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار کے علاقے تک پہنچنے لگے تھے۔ ۱۶۶۶-۶۷ء میں یوسف زئیوں نے پانچ ہزار کی تعداد میں دریائے سندھ کو عبور کر کے پکھلی سرکار کے سرحدی قلعہ چھانجل پر قبضہ کر لیا۔ میدانِ ہزارہ قارلق میں ترینوں نے قدم جما لئے اور غورغشتی قبیلہ کے لوگ علاقہ مانکرائے پر قبضہ کرنے کے بعد پکھلی سرکار کی شمال مشرقی سرحد کے لئے خطرہ بن گئے۔ سندھ کے اس پار سے مزید قبائل کی پیش قدمی کا خطرہ بڑھ گیا۔ اس طرح نہ صرف پکھلی سرکار بلکہ شاہراہِ کشمیر بھی خطرے میں پڑ گئی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے فرمان کے مطابق والیٔ پکھلی سلطان محمود بھی علاقہ گکھڑ، نیلاب اور اٹک کے دوسرے منصب داروں کی طرح قبائل کی پیش قدمی روکنے اور ان کی بغاوت کچلنے میں مصروف ہو گیا، لیکن بغاوت کی آگ مسلسل بھڑکتی رہی۔ ۱۶۷۴-۷۵ء میں اورنگ زیب عالمگیر بنفسِ نفیس حسن ابدال پہنچا اور سرحدی مہمات کی نگرانی کرنے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے متعدد اقدامات سے وقتی طور پر بغاوت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ بہاکو خان فوت ہوا اور اس کا بیٹا اطاعت کے لئے حاضر ہو گیا۔ خوش حال خان خٹک کو قید کیا گیا اور پھر رہائی کے بعد اس نے اطاعت اور وفاداری کا عہد کر لیا۔ ایمل خان آفریدی کو آغر خان ترک نے شکست فاش دے کر آفریدیوں کی بغاوت کو فرو کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر ایک سال کے قیام کے بعد حسن ابدال سے واپس دہلی روانہ ہو گیا، مگر اس کی روانگی کے بعد پھر بدامنی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

والیٔ پکھلی سلطان محمود خورد شہنشاہ کی ملاقات کے لئے دہلی روانہ ہوا تاکہ حالات کی تفصیلی رپورٹ شہنشاہ کو پیش کی جائے۔ واپسی پر سلطان محمود پھر قبائل کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لینے لگا۔ یوسف زئیوں سے قلعہ چھانجل واپس لے لیا گیا۔ سلطان مکرم خان اور شمشیر خان جیسے بہادر افسروں نے سوات کے علاقے کے اندر گھس کر یوسف زئیوں کی بعض اہم کمین گاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وقتی طور پر یوسف زئیوں کے پکھلی سرکار میں داخلے کا خطرہ ٹل گیا۔ پکھلی خاص سے سلطان محمود خود

کا ایک بیٹا سلطان فاضل خان اپنے دو بہادر بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر خان سمیت ترک فوج لے کر ۱۶۶۹ء میں میدانِ ہزارہ قارلق کی طرف آگے بڑھا۔ موضع سلطان پور کے مقام پر پہنچ کر سلطان فاضل خان نے کیمپ لگایا اور شاہراہِ کشمیر کے دونوں اطراف میں زبردست پہرہ بٹھا دیا۔ اسی مقام سے ملوک خان ترک فوج کا ایک مضبوط دستہ لے کر موضع علی خان کے علاقے سے ہوتا ہوا مانکرائے کے اہم قصبے پر حملہ آور ہوا۔ سخت لڑائی کے بعد غورغشتی قوم کو شکست ہوئی اور ملوک خان نے نہ صرف مانکرائے بلکہ اس سے ملحقہ تمام دیہات پر قبضہ کر کے اس علاقے سے غورغشتیوں کو مار بھگایا۔ لڑائی کے دوران میں مانکرائے کا قدیم قصبہ تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ قصبہ مانکے دی ڈھیری کی پچھلی سمت واقع تھا۔ ملوک خان کی نگرانی میں ترکوں نے موجودہ مانکرائے کا موضع نئے سرے سے آباد کیا۔

ترک فوج کی اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف شاہراہِ کشمیر بلکہ ندی دوڑ کا تمام مشرقی کنارہ سلطان پور کے موضع سے لے کر تربیلا کے علاقے تک محفوظ ہو گیا۔ اس زمانے میں یہ سارا علاقہ پکھلی سرکار میں شامل تھا؛ البتہ موضع مانکرائے میدانِ ہزارہ قارلق کے پرگنے میں واقع تھا۔ اس موضع پر قبضہ کرنے کے بعد میدانِ ہزارہ قارلق میں بھی ترکوں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ تاریخ ہزارہ مصنفہ کیپٹن ویس میں ترکوں کے مانکرائے پر قبضہ کرنے کا سن ۱۶۶۹ء لکھا ہوا ہے۔ اسی دوران میں ترینوں نے بھی میدانِ ہزارہ قارلق میں چند دیہات آباد کر لئے تھے۔

۱۶۷۴-۷۵ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے حسن ابدال تشریف لانے پر میدان ہزارہ قارلق کے گوجروں نے دیگر اقوام بالخصوص ترینوں کے خلاف بادشاہ کے حضور میں ایک شکایت پیش کی۔ اتفاق سے صالح محمد خان دلازاک بھی اس وقت شاہی دربار میں موجود تھا۔ اس نے جھٹ ثالثی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں جسے نادانی سے گوجروں نے تسلیم کر لیا۔ اب صالح محمد خان نے ثالث بن کر میدان ہزارہ قارلق کے پرگنے کے کل چوراسی دیہات کو اکیس اکیس دیہات کی چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ایک ترکی پٹی مانکرائے تھی جس میں اکیس دیہات شامل تھے۔ ہزارہ قارلق کی اس تاریخی تقسیم کے حالات ایک الگ عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ سلطان فاضل خان نے موضع سلطان پور کے مقام پر کیمپ لگا کر شاہراہِ کشمیر کے دونوں اطراف میں جن مواضعات پر قبضہ کر لیا تھا، وہ ان اکیس دیہات کے ماسوا تھے۔ اس لئے کہ وہ دراصل میدانِ ہزارہ قارلق کا حصہ نہ تھے، بلکہ دھنوڑ کے تابع تھے۔ ان مواضعات میں مانکرائے سے بکرگڑھ، درشخیل اور

اور پھلاہ گلی تک کا تمام علاقہ شامل تھا؛ لہذا ترکوں نے ان مواضعات کو بھی ترکی پٹی کے مواضعات کے ساتھ شامل کر دیا، اس طرح اس علاقے میں ترکوں کی ایک نئی ریاست وجود میں آگئی جس کا مرکزی مقام مانکرائے بن گیا۔ تاریخ ہزارہ میں ان مواضعات کی فہرست جو تمام ترکی پٹی میں شامل کئے گئے، مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہے:

مانکرائے، تیر، کمکہ، پھر ہالہ، نڑتوپہ، پھر ہاڑی، نیلور، گاڑ، موہڑہ محمود، مکھتن، دوبندی، پنڈ ہاشم خان، ڈھیری، قاضیاں، بانڈی میرداد، پست، بانڈہ، کرم، بھیڈیاں، نوشہرہ، کیلگ، چیتے مہکے، بگڑہ نصف، رتانبہ، سیریاں نصف، بھجوالہ، دوشخیل، بیکے، کڑی، پھولاہ گلی، برتھال، مقصود کوکہ، چھتڑی، بھیرہ، پنڈ مانکرائے داخلی پینیاں، کنڈل، تورکا بانڈہ، گجل، ساہیا، گھوساں۔

مندرجہ بالا مواضعات میں سے پنڈ ہاشم خان اور موہڑہ محمود بعد میں آباد کئے گئے۔ اگرچہ ان کا علاقہ ابتدا ہی سے ترکی پٹی میں شامل تھا۔ مندرجہ بالا تمام دیہات آج تک موجود ہیں۔ ان کے محل وقوع سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترکوں نے اپنے لئے وہی مواضعات پسند کئے جو بالعموم پکھلی سرکار کی سرحد پر واقع تھے، اس طرح ترکوں کی مقبوضات میں اضافہ ہو گیا۔ سلطان فاضل خان، ملوک خان اور شمشیر کی اولاد اسی ترکی پٹی میں آباد ہو گئی، مگر ترکوں کی اس آبادکاری کو بمشکل ایک ہی نسل کا عرصہ گزرا تھا کہ پکھلی سرکار میں ترکوں کے مابین وہ خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا تذکرہ ایک علیحدہ عنوان کے تحت گزشتہ سطور میں کر دیا گیا ہے۔ یہ خانہ جنگی سلطان محمود والئ پکھلی کی گمشدگی یا شہادت کے بعد شروع ہوئی تھی اور اس میں سلطان محمود خورد کے ایک بھائی سلطان مقرب خان حاکم دھمتوڑ کا پلہ بھاری رہا تھا، مگر پکھلی سرکار کے دیگر سلاطین زادوں نے سلطان مقرب خان کی باغیانہ اور ظالمانہ روش کے خلاف اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں ایک شکایت روانہ کی جس پر بادشاہ نے سلطان مبارز الدین خان گکھڑ کی سرکردگی میں شاہی فوج کو سلطان مقرب خان کے خلاف کارروائی کے لئے روانہ کر دیا۔ سخت لڑائی کے بعد شاہی فوج نے پکھلی سرکار کے دیگر سلاطین زادوں کی امداد سے سلطان مقرب خان کو سخت شکست دی۔ اس لڑائی میں دھمتوڑ کے قصبے کو بہت نقصان پہنچا۔ بدقسمتی سے ترک پھر بھی کسی ایک سلطان زادے کی حکمرانی پر متفق نہ ہو سکے۔ انتشار مزید بڑھا اور ترک سردار پکھلی سرکار کے بیسیوں ٹکڑوں پر الگ الگ قابض ہو گئے۔ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہا۔ ان کا زوال یقینی تھا۔ ۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا کے سواتی لشکر نے بغیر

کسی مزاحمت کے قلعہ گلی باغ پر قبضہ کر لیا۔ تنولی سندھ پار کے علاقے سے آگے بڑھ کر علاقہ شیروان پر بھی قابض ہو گئے۔ ترکوں کے زوال کے تفصیلی حالات گزشتہ اوراق میں بیان کر دیئے گئے ہیں، مگر ترکی پٹی مانکرائے اس زمانے میں مندرجہ بالا قبائل کی بغاوت یا پیش قدمی سے متاثر نہ ہوئی اور ترک بدستور اس پر قابض رہے۔ عہدِ مغلیہ میں ترکی پٹی کا سالانہ لگان مبلغ -/۳۰۰۰ روپیہ تھا جو اٹک کے قلعے میں واجب الادا ہوا کرتا تھا۔ یہ لگان ترکی پٹی کے ان دیہات کا تھا جو ترکی پٹی کے میدانِ ہزارہ قارلق میں واقع تھے۔

سنہ ۵۲-۱۷۵۳ء تک ترکی پٹی کے حالات معمول کے مطابق چلتے رہے، لیکن درانیوں کی پیش قدمی کے بعد حالات میں عظیم تغیر رونما ہوا۔ درانیوں کی آمد سے قبل پکھلی سرکار کے تمام اہم مقامات ترکوں سے چھین لئے گئے تھے، ان کی کثیر تعداد کشمیر کے علاقے کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ عوام میں ترکوں کے خلاف نفرت کے جذبات موجود تھے، مگر طویل کشمکش کے باوجود کوئی ایک قبیلہ تمام ولایتِ پکھلی یا پکھلی سرکار کے پورے علاقے پر قابض نہ ہو سکا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مختلف قبائلی سردار حکمرانی کر رہے تھے کہ سنہ ۴۹-۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد درانیوں نے ہزارہ قارلق، پکھلی سرکار اور کشمیر سرکار کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ خوانین میں سے کسی کو بھی درانیوں کی مزاحمت کی جرأت نہ ہوئی، بلکہ ان میں سے اکثر درانیوں کی حمایت اور وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ درانیوں نے نجیب اللہ خان ترین کو میدانِ ہزارہ قارلق میں اپنی طرف سے عامل مقرر کر دیا۔ زبردست خان المعروف صوبہ خان کو علاقہ تناول میں اور سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ کو پکھلی خاص میں اسی طرح درانی عامل کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔

حالات سے قطعاً بے نیاز ہو کر ترکی مانکرائے کے ترک سرداروں نے درانیوں کی مزاحمت شروع کر دی۔ اس زمانے میں ترکوں کا مشہور سردار سلطان بے نام المعروف بے ناماں راجہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سلطان بے نام کا اصل نام آزاد خان تھا، لیکن اس نے میرزا بیدل اور میرزا بیدم کی طرح اپنے لئے سلطان بے نام کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔ اسی وجہ سے لوگ اسے "بے ناماں راجہ" کہا کرتے تھے۔ ترکی پٹی شاہراہ کشمیر کے دونوں اطراف میں واقع تھی اور درانیوں کی اصل دلچسپی اسی شاہراہِ کشمیر سے تھی۔ درانیوں کو اس شاہراہ کے آس پاس ایسے وفادار قبائل اور خوانین کی ضرورت تھی جو ان کی خاطر اس شاہراہ کی حفاظت کر سکیں۔ شاہراہِ کشمیر پر ترکوں کی مزاحمت کی وجہ سے درانی ترکوں

کے خلاف ہوگئے۔ درانی فوج سلطان پور اور مانکرائے کی جانب سے پیش قدمی کرتی ہوئی آگے بڑھی سلطان پور، مگری، مانکرائے، نڑتوپہ اور پھر ہاڑی کے مقامات پر ترکوں کی گڑھیوں کو تباہ و برباد کرتی ہوئی مگری بالا کے مقام پر پہنچ گئی۔ یہ مقام موضع پھر ہاڑی سے آگے ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ یہاں ترکوں نے سلطان بے نام کی سرکردگی میں درانیوں سے آخری ٹکر لی، جس میں سلطان بے نام شہید ہوگیا۔ اب بھی سلطان بے نام کا مزار اسی مگری کے مقام پر واقع ہے۔ درانیوں نے ترکوں سے بگڑہ، مقصود، دوشخیل، پھولاہ گلی وغیرہ کے وہ تمام مقامات چھین لئے جو شاہراہِ کشمیر پر واقع تھے۔ مواضعات مانکرائے، نڑتوپہ اور پھر ہاڑی کی صورت دیہوں سے اس علاقے میں درانیوں کی پیش قدمی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لڑائی کے بعد سلطان بے نام کا اکلوتا اور کمسن بیٹا محمد شیر علی خان موضع پھر ہاڑی میں اپنے رشتہ داروں میں آباد ہوگیا۔ اب حالت یہ تھی کہ درانی حکومت اور مقامی عوام ترکوں کے مخالف بن گئے۔

جب غورغشتیوں کو درانیوں اور ترکوں کی اس کشمکش کے حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر مانکرائے کے باغات پر قبضہ کرلیا۔ ترک اب کمزور تھے، اس لئے وہ درانی حکمران تیمور شاہ کے پاس ایک شکایت لے کر پہنچے، لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ واپس لوٹ کر ترکوں نے ایک بار پھر غورغشتیوں پر ہلہ بولا اور انہیں اس علاقے سے دوبارہ مار بھگایا۔ اس وقت ترکی پٹی کی راجگی ملوک خان کی اولاد میں سے دو خاندانوں کے پاس تھی اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو چت کرنے کی فکر میں تھا۔ ایک حصے کی راجگی عنایت خان کے پاس تھی اور دوسرے حصے کی راجگی کمال خان کے پاس تھی۔ عنایت خان نے مخالف دھڑے کے قلیچ بیگ کو جو مہریز خان کی اولاد میں سے تھا، قتل کرادیا۔ اس کے بدلے میں سلام خان نے عنایت خان کو قتل کرادیا۔ ۱۸۰۲ء میں مسماۃ جیونی بیگم نے جو کہ عنایت خان کی والدہ اور برکات خان تنولی کی بیٹی تھی۔ سلام خان کو بمعہ دو اور رشتہ داروں کے رتہ بند کے مقام پر قتل کرادیا۔ اس طرح عنایت خان کا فرزند ہاشم خان نابالغ رہ گیا۔ جب ہاشم خان جوان ہوا تو اس نے اپنے باپ کے خون بہا کے بدلے میں کمال خان کو بمعہ اس کے بیٹے اور ہمشیرہ زادہ نوازش علی خان کے قتل کرادیا اور اس طرح تنہا ترکی پٹی کا وارث بن بیٹھا۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ ترین پٹی گوجری اور پٹی دلازاک پر قبضہ جما کر ترکی پٹی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ترینوں کا سردار محمد خان ترین تھا جو کمال خان ترک کا دوست اور جنبہ دار تھا۔ محمد خان

ترین نے ہاشم خان ترک سے کمال خان ترک کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ وہ اپنے ہمراہ ترینوں کی ایک جمعیت لے کر ترکی پٹی میں داخل ہوا۔ فتح خان ابن کمال خان نے بڑی خوشی اور گرم جوشی کے ساتھ محمد خان کی امداد قبول کی۔ صورتِ دیہی موضع پھرہاڑی میں لکھا ہے کہ فتح خان ابن کمال خان نے محمد خان ترین کی امداد سے پھرہاری کا نیا موضع آباد کیا اور اس میں گڑھی تعمیر کی۔ بعدازیں محمد خان ترین اور فتح خان ترک نے مل کر ہاشم خان کو ترکی پٹی سے باہر نکال دیا۔ ہاشم خان پہلے تیر کے علاقے کی طرف گیا اور پھر وہاں سے سیدھا قلعہ اٹک میں سردار حکما سنگھ کے پاس پہنچا اور اس سے محمد خان ترین کے خلاف امداد طلب کی۔ سکھوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر سردار مکھن سنگھ کی سرکردگی میں پانچ سو سکھ سوار راولپنڈی سے ہاشم خان کے ہمراہ میدان ہزارہ قارلق کی طرف روانہ کر دیئے۔ ہاشم خان نے اس سکھ فوج کی مدد سے محمد خان ترین اور فتح خان ترک دونوں کو شکست دی اور آگے بڑھ کر گل ڈھیری کے مقام پر اس نے محمد خان ترین کی گڑھی کو جلا کر خاکستر کر دیا، لیکن ہاشم خان کو اپنے اصل مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی، کیونکہ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے باضابطہ طور پر ہزارہ قارلق کو اپنی قلمرو میں شامل کر دیا اور ہاشم خان کو سکھوں کی ماتحتی قبول کرنا پڑی۔ ۱۸۲۰ء میں محمد خان ترین نے دوسرے خوانین کے تعاون سے سردار مکھن سنگھ کو قتل کر دیا، لیکن اس قتل سے حالات میں کوئی بڑا تغیر رونما نہ ہوا۔ ۱۸۲۱ء میں سردار ہری سنگھ نلوہ نے کشمیر سے واپسی پر مانگلی کے خوبصورت قصبے کو جلا دیا۔ ۱۸۲۳ء میں اس نے ہری پور کا شہر اور قلعہ ہرکشن گڑھ تعمیر کیا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ نے محمد خان ترین اور ہاشم خان ترک کو جاگیریں عطا کر کے خاموش کرنے کی کوشش کی، لیکن جاگیریں قبول کرنے کے باوجود میدان ہزارہ قارلق کے یہ سردار سکھوں کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ اگرچہ ان میں اتفاق نہ تھا۔ حالات پر قابو پانے کے لئے سکھوں نے دھوکے سے محمد خان ترین کو گرفتار کر کے کلر کہار کے قلعے میں قید کر دیا جہاں وہ قید ہی کی حالت میں شہید ہوا۔ ۱۸۲۴ء میں بوستان خان ترین، محمد خان پدر پائندہ خان، جلال خان دلازاک، شیر محمد خان مشوانی اور شیخا جدون کے سر توپ سے اڑا دیئے گئے، لیکن ہاشم خان اور فتح خان ترک روپوش ہو کر علاقہ غیر میں چلے گئے اور کافی عرصے تک مفرور رہے۔ سکھوں کے دیوان مولراج نے ترکی پٹی پر یلغار کی۔ مانکرائے، نڑتوپہ اور پھرہاڑی کے مواضعات میں ترکوں کی گڑھیوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ پیر صحابہ کے مقام پر ترکوں نے سکھوں سے آخری ٹکر لی اور پھر مفرور ہو گئے۔ سکھ مار دھاڑ کرنے کے بعد روزانہ واپس ہری پور کے قلعے میں چلے آتے اور ترک بال بچوں سمیت بلند چوٹیوں کی طرف

منتقل ہو جاتے۔ کافی عرصہ کی کشمکش کے بعد سردار تیجا سنگھ نے ۱۸۳۸ء میں ایک بار پھر ہاشم خان کو ایک ہزار کی جاگیر عطا کر کے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ہاشم خان ۱۸۴۲ء میں فوت ہوا۔

ہاشم خان کا بیٹا حیات خان شنگھڑی کے نواب خان کا بہنوئی تھا؛ لہٰذا صوبہ خانی تنولی اکثر اس کی امداد کرتے رہتے تھے۔ نواب خان آف شنگھڑی نے علاقہ تناول میں سکھوں کے مشہور قلعہ شیروان کا محاصرہ کر لیا۔ سکھوں نے نواب خان سے بدلہ لینے کے لئے حیات خان کو گرفتار کر کے قلعہ ہری پور میں قید کر دیا اور کافی عرصے کے بعد اسے رہا کیا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ کے دور یعنی ۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۵ء تک میدان ہزارہ قارلق کے مسلمان سکھوں کے خلاف جذبۂ جہاد سے لڑتے رہے۔ تنولی، مشوانی، اور کرڑال بڑی بے جگری کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان تمام قبائل نے اپنے اپنے علاقوں میں بے مثال قربانیاں دیں۔ ہری سنگھ نلوہ موضع جاگل کے قریب زخمی ہوا اور بعد ازاں اسے سکھوں نے درانیوں کے خلاف لڑنے کے لئے پشاور میں متعین کر دیا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ سکھوں کا سب سے زیادہ مشہور جرنیل تھا۔ وہ درانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پشاور کے قریب مارا گیا۔ ۱۸۴۵ء تک ہزارہ کے مسلمانوں نے سکھوں کے خلاف مسلسل جہاد کرتے ہوئے ان کی کمر توڑ دی اور وہ اس میدان سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۸ء تک کے زمانے کو کتبِ تاریخ میں "لنڈی مسلمانی" یعنی لنگڑی مسلمان حکومت کا زمانہ لکھا گیا ہے۔ ان تین سالوں میں مسلمانوں نے اتفاق کر کے ستھانہ کے سید اکبر شاہ کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ نواب خان آف شنگھڑی اور غلام خان ترین اس کے دو وزیر منتخب کئے گئے، لیکن یہ حکومت فی الواقع لنگڑی حکومت ہی ثابت ہوئی۔ علاقے میں امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ قبائلی چپقلش اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ اس زمانے میں کیپٹن ایبٹ بھیس بدل کر اس علاقے میں سکھوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات بھڑکاتا رہا۔ اس نے کھلابٹ اور سریکوٹ جیسے مقامات پر سکونت پذیر ہو کر سکھوں کے خلاف ریشہ دوانیاں جاری رکھیں۔ اپنے ہمدردانہ رویے اور نرم روی کی وجہ سے اس نے مسلمانوں کے دل موہ لئے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں اور زمین پوری طرح سرکار برطانیہ کی عملداری کے لئے تیار ہو چکی ہے۔ اس وقت اس نے ایک انگریزی فوج کے دستے کے ساتھ کسی قابلِ ذکر مزاحمت کے بغیر اس علاقے پر قبضہ جما لیا۔ اسی زمانے میں سردار چھتر سنگھ کی بغاوت کی وجہ سے علاقے میں بدامنی اور بغاوت کے آثار دوبارہ پیدا ہونے لگے۔ ترکی پٹی کے دونوں ترک سردار محمد حیات خان اور فتح خان انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔

ہری پور اور موضع علی خان کے مقامات پر لوگوں نے کچھ انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ ابھی تک ان انگریز افسروں کی قبریں موجود ہیں، لیکن کسی منظم طاقت کے بغیر سرکارِ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا جو انجام ہونا چاہیئے تھا، وہ ہوا۔ حیات خان اور فتح خان دونوں کو گرفتار کر کے قلعہ ہری پور میں قید کر دیا گیا۔ ایبٹ صاحب ۱۸۴۸-۴۹ء میں ضلع ہزارہ کا پہلا انگریز ڈپٹی کمشنر بنا۔ اہلِ ہزارہ میں سے وہ لوگ جو اس کے حمایتی اور وفادار ساتھی تھے، انہیں جاگیروں اور انعامات سے نوازا گیا، مگر ترک سرداروں کے حصے میں قید آئی۔ تقریباً دو سال قید گزارنے کے بعد ایبٹ صاحب نے ترک سرداروں کو معافی دی، لیکن ان کی زمین کا بیشتر حصہ ان سے چھین کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح انہیں مفلوک الحالی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چونکہ مہندا خان ابن ہاشم خان نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا، اس لئے وقتی طور پر مانکرائے کی کتاب اس کے حوالے کی گئی۔ ۱۸۵۲ء میں انگریزوں نے مانکرائے کا بندوبست چراغ علی شاہ اور ملک خیرا جولاہا کے نام کر دیا۔ ۱۸۷۲ء کے بندوبست تک ترکوں کی معاشی حالت نہایت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آبائی علاقے میں بیگانے ہو کر رہ گئے۔ فتح خان اور اس کی اولاد خاص طور پر سکھوں اور انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہی۔

اس وقت تک ترک اپنی پرانی ترکی پٹی کے بعض مواضعات میں آباد ہیں۔ رواج نامہ بندوبست اور ترکوں کے مخصوص دیہات کی صورتِ دیہوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کی ریاست میں وراثت کا وہی پرانا کا وہی پرانا طریقہ رائج تھا جو صدیوں سے پچھلی سرکار کے علاقے میں چلا آ رہا تھا۔ گدی نشین سلطان اپنے بھائیوں کو مقبوضہ مواضعات میں گزارہ اراضی عطا کیا کرتا تھا اور وہ بھائی سلطان کا دفتری کہلاتا تھا۔ ہر دفتری کو سلطان کی طرف سے ایک ملازم اور گھوڑا عطا کیا جاتا تھا۔ اگر دفتریوں میں سے کوئی لاولد مر جاتا تو اس کی اراضی گزارہ آپ سے آپ سلطان یا گدی نشین راجہ کو منتقل ہو جاتی جو زمین سلطان کی خود کاشت ہوتی تھی، اسے وراثت کے مروجہ قانون کے تحت تقسیم کر لیا جاتا تھا، لیکن ریاست صرف بڑے بیٹے کے نام ہوا کرتی تھی۔ وراثت کا یہی طریقہ نہایت سودمند تھا۔ اس طریقے کو اپنانے کے بعد جہاں ایک طرف ریاست کا وقار محفوظ ہو جاتا، وہاں گدی نشین راجہ کے بھائیوں کو بھی باوقار زندگی بسر کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔ یہ وراثت کے اسی طریقے کا نتیجہ تھا کہ تقریباً چار سو سال کے طویل عرصے میں ترکوں کے مابین صرف دو یا تین بار خانہ جنگی ہوئی۔

اگرچہ دونوں بازوؤں کے ترکوں کی اولاد کافی تعداد میں موجود تھی، لیکن درانیوں کے عہد میں سلطان فاضل خان کے تیسرے پوتے سلطان بے نام کی مگری کے مقام پر شہادت کے بعد ترکی پٹی کے بقیہ مواضعات کی راجگی کا منصب صرف دو خاندانوں کے پاس رہا جن کے گرد دائرہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اس وقت ملوک خان کی اولاد مانکرائے، پھر ہاڑی اور کسی قدر نڑتوپہ کے مواضعات میں آباد ہے۔ مانکرائے کے موجودہ ترکوں میں سے محمد ایوب خان، ابن علی مردان خان، امان اللہ خان ابن ایوب خان، ڈاکٹر اورنگ زیب خان ابن محمد خان ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر، نور محمد خان ابن پیر محمد خان اور محمد سرور خان ابن اکبر خان قابلِ ذکر افراد ہیں۔

پھر ہاڑی:

زبانی روایات کے علاوہ صورتِ دیہی موضع پھر ہاڑی اور شجرہ نسب مالکانِ دیہہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں درانیوں کے عہد میں بھی ترکوں کی ملکیت تھا۔ ترکی پٹی مانکرائے کے عنوان کے تحت گزشتہ اوراق میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ملوک خان ترک نے ۱۶۶۹ء کے لگ بھگ مانکرائے پر حملہ کر کے اس کے تمام ملحقہ دیہات سے ان غور غشتیوں کو مار بھگایا تھا جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اس علاقے میں داخل ہو کر بیشتر مواضعات پر قابض ہو گئے تھے۔ اسی یلغار میں پھر ہاڑی کے موضع پر بھی ترکوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ درحقیقت اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے تقریباً تین صد سال پہلے سے بھی پھر ہاڑی کے موضع تک کا علاقہ سرکار پکھلی کی حدود میں شامل تھا، مگر عالمگیر کے عہد کی بدامنی کے زمانے میں غور غشتی قوم کے لوگ اس پر قابض ہو گئے تھے جنہیں ملوک خان نے نکال کر ترکوں کا قبضہ بحال کر دیا تھا۔

ترکی پٹی مانکرائے کی تشکیل کے بعد یہ موضع مسلسل ترکوں کے قبضے میں رہا۔ پھر ہاڑی کا قدیم موضع موجودہ موضع سے مشرقی جانب ایک بلند تر پہاڑی پر واقع تھا اور اس میں گوجر آباد تھے۔ اسی پھر ہاڑی کے موضع کے قریب مگری کا موضع موجود ہے جہاں ترکوں نے سلطان بے نام کی سرکردگی میں درانیوں سے لڑائی لڑی تھی۔ اسی لڑائی کے دوران میں سلطان بے نام شہید ہوا اور اس کی شہادت کے ساتھ ہی درانیوں نے ترکی پٹی کے وہ مواضعات ترکوں سے چھین لئے جو شاہراہِ کشمیر کے دونوں اطراف میں واقع تھے؛ چونکہ درانیوں کا اصل مقصد شاہراہِ کشمیر کو محفوظ کرنا تھا؛ لہٰذا انہوں نے ترکی پٹی کے بقیہ مواضعات ترکوں ہی کے قبضے میں رہنے دیئے؛ البتہ مگری کی لڑائی کے بعد ترکوں کے ساتھ ان کا رویہ سخت ہو گیا۔

صورتِ دیہی موضع پھر ہاڑی میں لکھا ہے کہ ۱۸۱۶ء میں جب ہاشم خان نے اپنے باپ کے خون بہا کے عوض کمال خان کو قتل کرایا تو کمال خان کا کمسن بیٹا فتح خان مانکرائے سے نکل کر پھر ہاڑی کے گاؤں میں چلا آیا۔ ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ فتح خان نے ترینوں کی امداد سے پھر ہاڑی کا موجودہ موضع آباد کیا۔ اس میں ایک گڑھی بھی تعمیر کی گئی اور اس کے دفاع کے لئے گڑھی میں ایک مضبوط برج بھی تعمیر کیا گیا۔ بعد ازاں فتح خان اور ہاشم خان کے درمیان وہ کشمکش جاری رہی جس کا تذکرہ ترکی پٹی کے حالات میں کر دیا گیا ہے ۱۸۲۳ء میں ہری پور شہر کی تعمیر کے زمانے میں سکھوں نے سردار ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں تمام میدان ہزارہ قارلق کے خوانین کے خلاف یلغار شروع کر دی۔ چیدہ چیدہ خوانین کے سر توپ سے اڑا دیئے گئے۔ فتح خان اور ہاشم خان کی گرفتاری کے لئے بارہا سکھوں نے ترکی پٹی کے علاقے میں تاخت کی لیکن یہ دونوں ترک سردار سکھوں کے قابو میں نہ آئے۔ کافی عرصہ تک سکھوں سے لڑنے بھڑنے کے بعد ترک مفرور ہو گئے۔ اسی زمانے میں سلطان بے نام کا اکلوتا بیٹا جدنا محمد شیر علی خان جو اب جوان ہو چکا تھا، پھر ہاڑی سے نکل کر رجوعیہ میں روپوش ہو گیا۔ کچھ عرصہ رجوعیہ میں زندگی بسر کرنے کے بعد وہ تحصیل ایبٹ آباد میں ایبٹ آباد کے قریب موضع بانڈہ پھگواڑیاں میں اپنے دوسرے رشتہ داروں کے پاس سکونت پذیر ہو گیا۔ ہاشم خان اور فتح خان ترکوں کی ایک جمعیت سمیت علاقہ غیر کو چلے گئے۔

سکھ اپنے تمام مظالم کے باوجود اس علاقے میں امن قائم نہ کر سکے۔ ترک وقتاً فوقتاً اس علاقے میں سکھوں اور ان کے بعض حلیف مسلمانوں پر چھاپے مارتے رہے۔ بالآخر سردار تیجا سنگھ نے ہاشم خان کو دوبارہ ایک ہزار کی جاگیر دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی ـــــ ہاشم خان ۱۸۴۲ء میں فوت ہوا۔ فتح خان اور اس کی اولاد کے ساتھ سکھوں نے زیادہ بُرا سلوک کیا۔ فتح خان سے اس کی تمام املاک چھین لی گئیں۔ انہوں نے پھر ہاڑی کا موضع اپنے ایک وفادار خادم سید حسن شاہ کو عطا کر دیا۔ اس طرح فتح خان کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ انگریزوں کی آمد کے موقع پر فتح خان اور حیات خان ابن ہاشم خان پھر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بار انہیں گرفتار کر کے قلعہ ہری پور میں قید کر دیا گیا، جہاں وہ مسلسل دو برس سزا بھگتنے کے بعد رہا ہوئے۔

سکھوں کے زمانے میں موجودہ تحصیل مانسہرہ کے موضع برٹ سے ایک ترک مسمی فرید خان نے میدانِ ہزارہ قارلق کا رُخ اختیار کیا اور یہاں آنے کے بعد موضع شنگرڑھی میں سکونت پذیر ہو گیا۔ نادر خان ابن فرید خان پہلے تو تنولیوں اور ترکوں سے مل کر سکھوں کے خلاف سرگرم عمل رہا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے

سکھوں کی مخالفت ترک کر دی۔ سکھوں نے اس کی بعض خدمات سے خوش ہو کر اسے پھر ہاڑی، چیچھڑی، بایاں احمد علی خان اور کسی حد تک پنڈ ہاشم خان کے مواضعات عطا کر دیئے۔ اس وقت سے نادر خان کی اولاد ان مواضعات میں آباد چلی آ رہی ہے؛ چونکہ نادر خان ولد فرید خان موضع برٹ تحصیل مانسہرہ سے آیا تھا اس لئے ترکی پٹی میں اس کا خاندان برٹی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اب تک یہ خاندان برٹی ہی کہلاتا ہے۔ ۱۸۷۲ء کے بندوبست کے کاغذاتِ مال میں نادر خان ابن فرید خان کی قوم ترک لکھی ہوئی ہے اور اسے نمبردار دیہہ ظاہر کیا گیا ہے۔ میں نے نادر خان کا شجرہ نسب تلاش کرنے کی بہت کوشش کی، مگر مجھے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

فتح خان کی اولاد مفلسی اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ان کے بعض افراد محمد شیر علی خان کے چلے جانے کے بعد جوعیہ میں منتقل ہو گئے۔ کچھ مانکرائے اور نڑتوپہ میں آباد ہو گئے، مگر ان کی اکثریت اب بھی موضع پھر ہاڑی ہی میں آباد ہے۔ بانڈہ پھگواڑیاں سے محمد شیر علی خان کی اولاد میں سے بعض افراد پھر ہاڑی واپس لوٹ آئے اور یہیں آباد ہو گئے؛ چنانچہ اس موضع میں اب سلاطینِ پکھلی کی اولاد میں سے دو معتبر خاندان آباد ہیں۔ ان کا چند پشتوں تک کا شجرہ نسب مندرجہ ذیل ہے، اس کا سلسلہ ترکی پٹی مانکرائے میں درج کئے گئے شجروں سے جا ملتا ہے:

شجرہ نسب ترکان موضع پھر ہاڑی (۱)

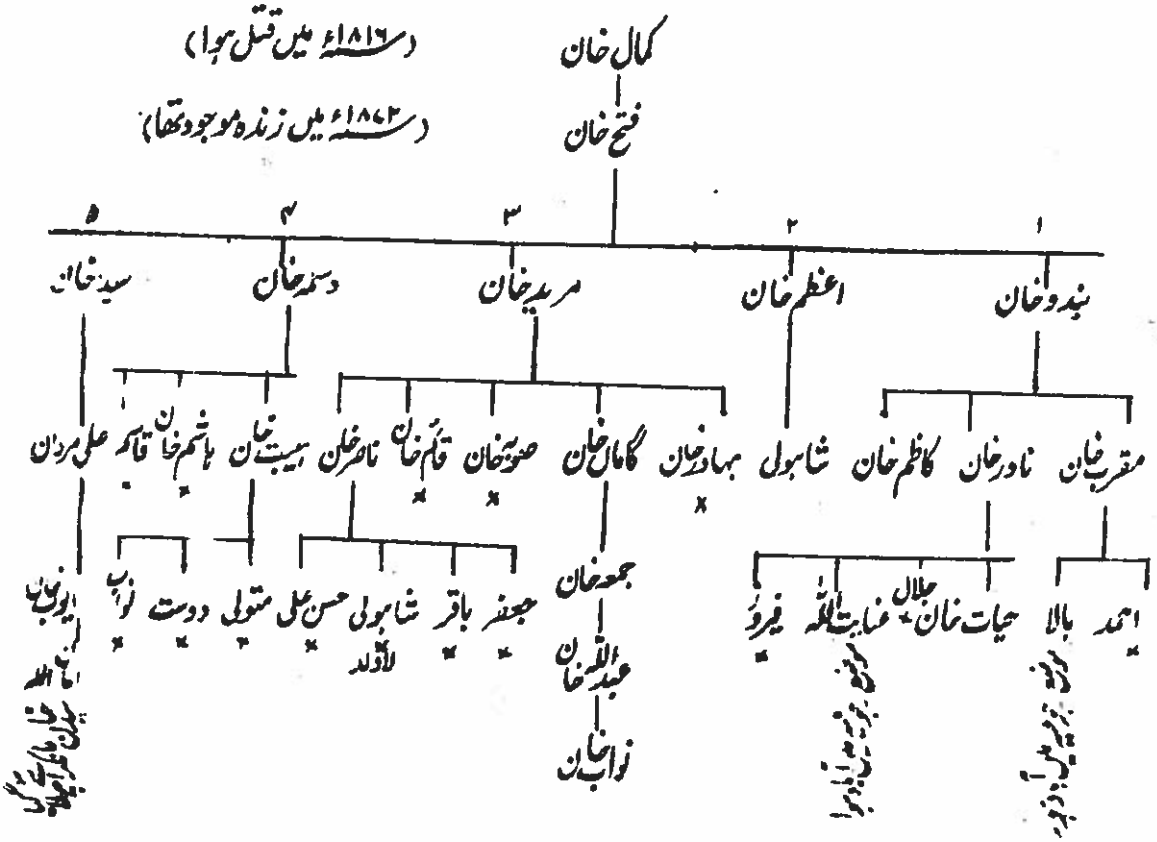

فتح خان کے پانچ بیٹوں میں سے سید خان پھر ہاڑی سے مانکرائے منتقل ہو گیا۔ بقیہ افراد پھر ہاڑی میں آباد ہیں جن افراد کے ناموں کے نیچے چرخی ٭ کے نشان ہے، ان کی اولاد کثیر تعداد میں اسی موضع میں آباد ہے۔

(۲)

سلطان بے نام المعروف بے ناماں راجہ

محمد شیر علی خان ۔ پہلے رجوعیہ اور وہاں سے بانڈہ پھگواڑیاں میں منتقل ہو گئے

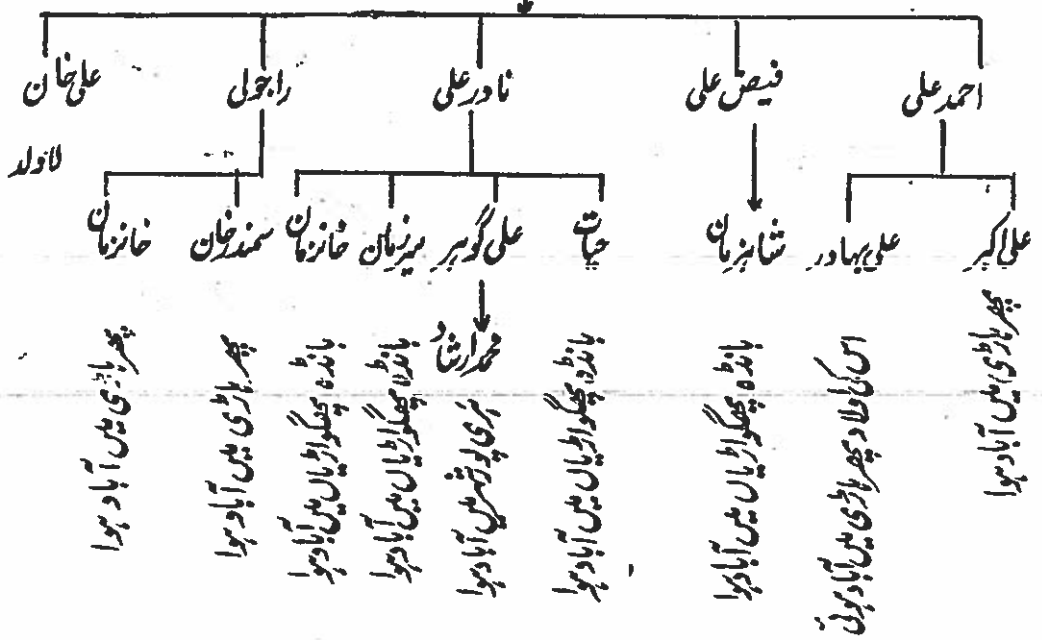

سلطان بے نام اور کمال خان کا شجرہ نسب چند پشتوں کے بعد سلطان محمود خورد والی پکھلی پر جا کر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ آخر میں منسلک کئے گئے شجرہ نسب سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا دو ترک خاندانوں کے علاوہ ترکوں کا ایک بڑا خاندان بھی موضع پھر ہاڑی میں آباد ہے، لیکن نادر خان ابن فرید خان سے اوپر کا سلسلہ معلوم نہیں، اس لئے اس خاندان کا شجرہ نامکمل رہ گیا ہے۔

نڑتوپہ :

یہ موضع ۱۶۶۹ء سے ترکوں کے قبضے میں چلا آرہا ہے۔ اس موضع کے ترکوں کے مورث اعلیٰ کا نام شمشیر خان والی پکھلی سلطان محمود خورد کے بیٹے مغل خان کا دوسرا بیٹا ملوک خان کا بھائی تھا۔ اسے نوجوانی کی عمر میں چھانجل کے مشہور قلعے کا فوجدار مقرر کر دیا گیا تھا۔ چھانجل کا قلعہ ترکوں نے دریائے سندھ کے قریب موجودہ تحصیل بٹگراں کے علاقے میں تعمیر کیا تھا۔ اس قلعہ کے ذریعے دریائے سندھ کے کنارے کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ اس قلعہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر لوگ دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ یوسف زئی کے ساتھ آمد و رفت کیا کرتے تھے۔ آمد و رفت کے اس راستے کی پاسبانی بھی اسی قلعہ کے ذریعے کی جاتی تھی۔ یہ قلعہ درحقیقت پکھلی سرکار کی بیرونی چوکی (Out Post) تھا۔ اس قلعہ کے کھنڈرات کے قریب اب بھی ایک بڑا پتھر پڑا ہوا ہے جسے لوگ ہندکو زبان میں شمشیر گٹ یعنی شمشیر خان کا پتھر پکارتے ہیں۔

مآثر عالمگیری اور تاریخ ہزارہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۶-۶۷ء میں پانچ ہزار یوسف زئیوں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے قلعہ چھانجل پر قبضہ کر لیا تھا۔ شمشیر خان کو پکھلی سے کوئی کمک نہ مل سکی، اس لئے وہ یوسف زئیوں کے اس اچانک حملے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بہرحال شمشیر خان نے پکھلی اور اٹک میں اس واقعہ کی اطلاع بھیج دی۔ اس وقت یوسف زئیوں کا سرغنہ بہاکو خان تھا۔ اسی واقعہ کے بعد شاہی افواج حرکت میں آئیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں سلطنت کے ساتھ یوسف زئیوں کی ٹکر کا آغاز اسی واقعہ سے ہوا۔ شاہی فرمان کے مطابق صوبیدار کابل، کامل خان فوجدار اٹک اور مکرم خان جیسے شاہی منصب داروں کے یوسف زئیوں کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور سوات کے بعض اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ شاہی افواج کی ان کارروائیوں سے وقتی طور پر یوسف زئی پیچھے ہٹ گئے۔

ادھر غورغشتی قوم کے لوگ میدان ہزارہ قارلق میں آگے بڑھ کر علاقہ مانکرائے پر قابض ہو گئے۔ اس لئے سلطان محمود خورد کا ایک بیٹا سلطان فاضل خان اپنے دو بھتیجوں ملوک خان اور شمشیر خان سمیت سلطان پور روڈ کے مقام پر آیا۔ یہاں سے ترک فوج نے ملوک خان کی سرکردگی میں علاقہ مانکرائے پر حملہ کر کے غورغشتیوں کو اس علاقے سے مار بھگایا۔ تاریخ ہزارہ میں ملوک خان کے حملے کا سن ۱۶۶۹ء درج ہے جو قرائن سے معلوم درست معلوم ہوتا ہے۔ فتح کے بعد نڑتوپہ کا موضع شمشیر خان کو عطا کر دیا گیا۔ اس کے بعد شمشیر خان کی اولاد

اس موضع میں آباد چلی آرہی ہے : چونکہ بہاکو خان یوسف زئی اسی زمانے میں فوت ہوگیا تھا اور اس کا بیٹا اظہار وفاداری کے لئے اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں حسن ابدال حاضر ہوگیا تھا اور بادشاہ نے خوش ہوکر اسے ایک جاگیر بھی عطا کردی تھی ، اس لئے علاقہ یوسف زئی کی طرف سے مزید قبائل کی پیش قدمی کا خطرہ ٹل گیا۔ میدانِ ہزارہ قارلق کی وہ تقسیم عمل میں آئی جس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں کردیا گیا ہے ؛ لہذا ۱۶۶۹ء کے بعد ترک اپنی ترکی پٹی میں اطمینان سے حکمرانی کرنے لگے اور یہیں آباد ہوگئے۔ پچھلی سرکار میں ترکوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں بھی ترکی پٹی کے ترکوں نے کوئی کردار ادا نہ کیا۔

۱۸۱۶ء کے زمانے میں ترکی پٹی کے ترکوں کے مابین ایک خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں عنایت خان سلام خان، قلیچ بیگ، نوازش علی خان اور کمال خان جیسے سرکردہ ترک سردار مارے گئے۔ اسی خانہ جنگی کے نتیجے میں ہاشم خان نے مایوسی کے عالم میں سکھوں سے امداد طلب کی اور سکھوں کو میدانِ ہزارہ میں دخل انداز ہونے کا موقع مل گیا۔ ترکوں کو شکست دینے کے بعد سکھوں نے اس میدان پر قبضہ کرلیا۔ ہاشم خان کی امیدوں کے برعکس سکھ اس میدان پر قابض ہوگئے اور انہوں نے ہاشم خان کو بھی اپنا مطیع ہونے پر مجبور کردیا۔ اب سکھوں اور میدان ہزارہ قارلق کے تمام قبائل کے درمیان زبردست رسہ کشی شروع ہوگئی۔ ۱۸۲۴ء میں ہری پور شہر اور قلعہ ہرکشن گڑھ تعمیر کرنے کے بعد سردار ہری سنگھ نلوہ نے میدان ہزارہ قارلق کے سرکردہ خوانین کے سر توپ سے اڑا دیئے ، لیکن ترک گرفتار نہ کئے جاسکے۔ کافی عرصہ تک مانکرائے ، پیر صحابہ ، پھر ہاڑی اور پنڈ ہاشم خان کے مقامات پر سکھوں سے لڑائیاں لڑنے کے بعد ترک مفرور ہوگئے اور علاقہ غیر کو چلے گئے۔ وہ علاقہ غیر سے یہاں آکر چھاپے مارتے اور پھر روپوش ہوجاتے بالآخر سردار تیجا سنگھ نے ہاشم خان کو ایک ہزار کی جاگیر دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی ، ہاشم خان ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔ اس موضع کے ترکوں کے مفرور ہونے کے زمانے میں سکھوں نے یہ موضع ایک جولاہے کو عطا کردیا تھا لیکن جولاہا زیادہ دیر تک یہاں قابض نہ رہ سکا اور ایک جھڑپ میں ترکوں نے اسے قتل کرڈالا۔ ۱۶۴۲ء کے بعد ترک دوبارہ اس گاؤں میں آباد ہوگئے۔ اس زمانے سے اب تک شمشیر خان کی اولاد اس موضع پر مسلسل قابض چلی آرہی ہے۔ علاقہ غیر سے واپسی پر مانکرائے کے ترکوں کے بعض افراد بھی اسی موضع میں آباد ہوگئے۔ لیکن اسی زمانے سے ترکوں کے دو تین خاندان ابھی تک علاقہ غیر کے مواضعات ابو وغیرہ میں آباد ہیں۔

شجرہ نسب ترکانِ نڑتوپہ (ملوک خانی)

- راجول خان
  - مدت خان
  - نجف خان
  - امیر خان
- فتح خان
  - علی بہادر
  - نادر
- ناصر خان
  - محمد خان
  - حیات خان
- ہاشم خان
  - گاماں
- عزیز خان
  - نجیم خان
  - پائندہ خان
- حیات خان
  - دواللہ خان

محمود خان نے سکھ دور میں موہڑہ محمود کا موضع آباد کیا۔ اس کے دو بیٹوں مسمیان گلاب خان اور احمد علی میں سے احمد علی خان لاولد فوت ہوا۔ گلاب خان کی اولاد یہیں پھلی پھولی۔ فی الحال گلاب خان کی اولاد میں سے منظفر خان نمبردار دیہہ، محمد اسلم خان کلکٹر اور احمد خان اس گاؤں کی معروف شخصیتیں ہیں۔ انگریزوں کے عہد میں علاقہ منظفر آباد کے ترکوں کے دو افراد اسی موضع میں آکر آباد ہو گئے۔

موہار کلاں :

یہ موضع ترکوں کے قدیم مرکزی شہر اور چھاونی دھنتوڑ سے چند میل کے فاصلے پر شمال جانب واقع ہے۔ اس گاؤں میں ترکوں کی آبادکاری کی داستان یہ ہے :

۱۷۱۳ء میں گلی باغ پر سید جلال بابا کے سواتی لشکر کے قبضے کے وقت سلطان محمود خورد کے دو بیٹے مسمیان عاقل خان اور مرید خان ترک خواتین کو ہمراہ لے کر درہ کونش میں روپوش ہو گئے تھے، ان کا ایک اور بھائی طاہر خان المعروف طاہری بھی کچھ عرصہ بعد ان سے جا ملا اور وہیں یکجا رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد جب حالات بدلے تو ان تینوں بھائیوں نے کونش کے درے سے نکل کر دوبارہ میدانِ پکھلی کا رُخ اختیار کیا۔ اس وقت تک کچھ سواتی واپس سوات جا چکے تھے اور جو یہاں آباد ہو گئے تھے اور ان کے اور سید جلال بابا کے درمیان علاقے کی تقسیم پر رسہ کشی شروع ہو چکی تھی۔ طاہر خان کا بیٹا رستم خان ایک بہادر نوجوان تھا، اس نے اپنے دوسرے رشتہ داروں کو ہمراہ لے کر بطور یلغار موضع گیروال پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سواتیوں کے مابین اتنے تنازعات شروع ہو چکے تھے کہ وہ رستم خان اور اس کے ترک ساتھیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ اسی طرح ترکوں کے کچھ مزید افراد پکھلی کے مواضعات میں سے دوگہ، تمباہ اور گڑھی حبیب اللہ وغیرہ کے علاقوں میں دوبارہ آباد ہو گئے۔

کچھ عرصہ تک گیروال کا موضع ترکوں کی پناہ گاہ بنا رہا۔ رستم خان کے تیسرے پوتے کا نام بھی رستم خان تھا۔ خدا جانے یہ رستم خان کس طرح قتل ہوا۔ بہر حال اس کی بیوہ کس نہایت کس مپرسی کی حالت میں اپنے دو معصوم بچوں غلام علی اور محبت خان کو ہمراہ لے کر گیروال سے نکل کر دھنتوڑ کے علاقے کی طرف روانہ ہوئی۔ دورانِ سفر میں اس بیوہ عورت نے حضرت میاں کنگال صاحب کی تکیہ گاہ کے پاس قیام کیا۔ اپنے بھوکے بچوں کو خوراک مہیا کرنے کے لئے اس صابر عورت نے کھلی زمین سے کچھ گھاس پھوس چُن کر ایک ہنڈیا

پر چڑھائی۔ حضرت میاں کنگال صاحب اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ اس عورت کے پاس تشریف لائے اور حالات دریافت کرنے کے بعد اسے ہمراہ لے کر دہمتوڑ کی طرف چل پڑے۔ یہ عورت اس امید پر سفر کر رہی تھی کہ وہ دہمتوڑ کے علاقے میں جا کر اپنے ہم قوم ترکوں کے پاس قیام پذیر ہو جائیں گی، مگر حضرت کنگال صاحب چلتے چلتے اسے دہمتوڑ سے بھی آگے موضع موہار کلاں تک ہمراہ لے گئے۔ اس وقت اس موضع میں گوجر آباد تھے، مگر اس وقت وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے مویشیوں کو لے کر بلند چوٹیوں پر چلے گئے تھے اور یہ موضع ویران پڑا تھا؛ چنانچہ ایک خالی مکان کی طرف اشارہ کر کے حضرت کنگال صاحب نے اس عورت کو اس میں آباد ہونے کا مشورہ دیا۔ رات گزارنے کے بعد دوسرے دن وہ عورت اپنے ہم قوم ترکوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی ملاقات چند ترکوں سے ہو گئی۔ یہ دہمتوڑی ترک تھے اور وہ بھی اپنے نئے مسکن کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے تھے۔ وہ عورت انہیں اپنے ہمراہ موہار کلاں میں لے آئی اور حضرت میاں کنگال صاحب کا تمام واقعہ سنانے کے بعد اس نے انہیں اس گاؤں میں آباد ہونے کا مشورہ دیا۔ اس طرح ابتدائی زمانے میں ترکوں کے کل دس افراد موہار کلاں میں آباد ہوئے ——— اس عورت کی اولاد اب تک پکھلی وال کے نام سے مشہور ہے اور دوسرے ترک دہمتوڑی کہلاتے ہیں۔ یہ دہمتوڑی ترک دہمتوڑ کے آخری ترک حکمران سلطان اکبر خان کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا شجرہ نسب نصیر الدین خان پر جا کر پکھلی وال ترکوں سے مل جاتا ہے۔

سطورِ بالا میں جس ترک بیوہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بچوں کا شجرہ نسب مندرجہ ذیل ہے:

شجرہ نسب ترکان موہار کلاں (دھستوڑی)

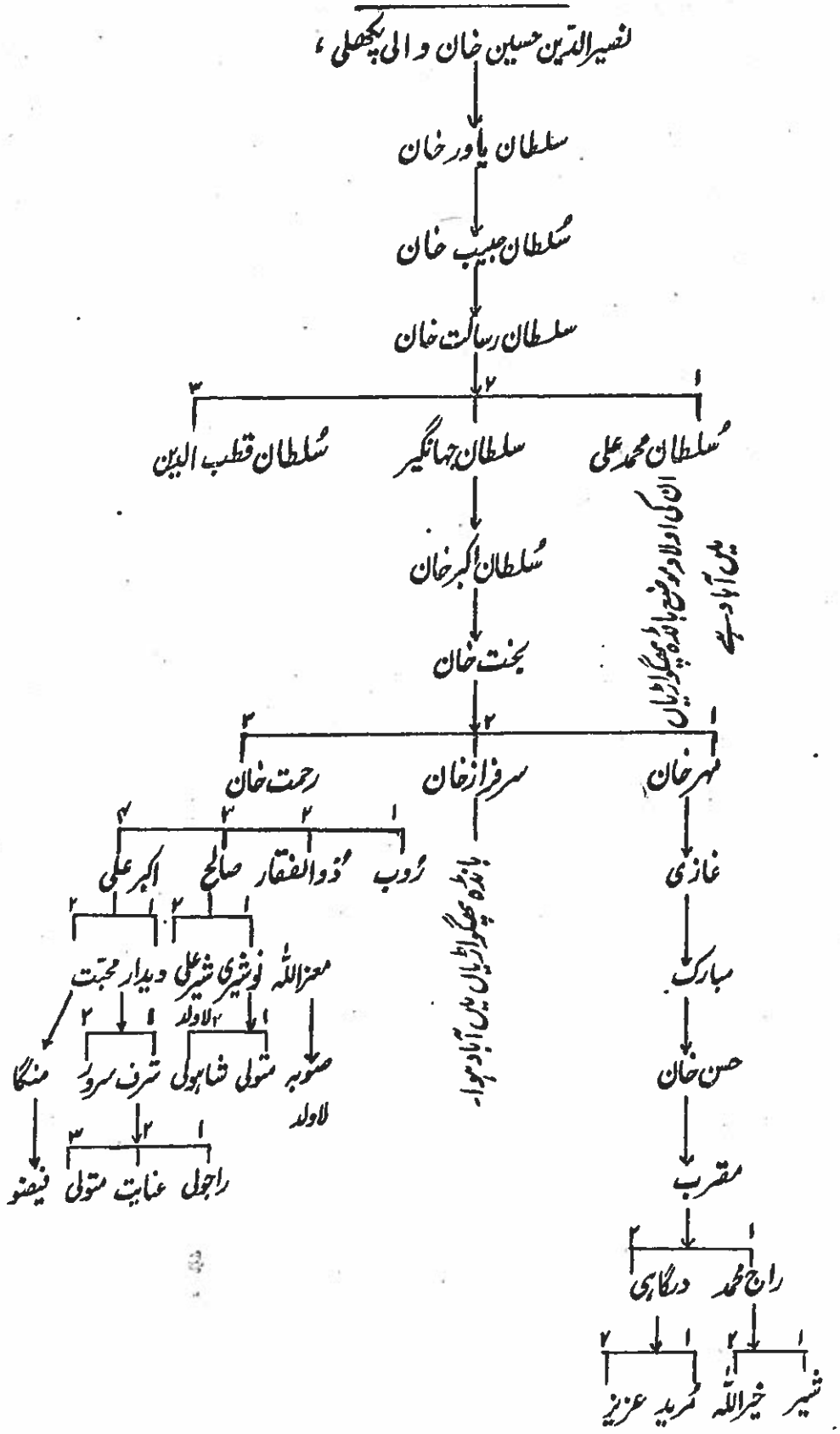

اس وقت موضع موہار کلاں میں ترکوں کی آبادی سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ نمبرداری کا سلسلہ سید خان، شیر خان اور گکھڑ خان کی اولاد یعنی پکھلی وال ترکوں میں چلا آرہا ہے۔ دمہتوڑی ترکوں میں سے دمہتوڑ کے آخری ترک حاکم سلطان اکبر خان کے دو پوتے مہر خان اور رحمت خان اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے۔ سلطان اکبر خان کا ایک اور پوتا سرفراز خان موضع بانڈہ پھگواڑیاں میں آباد ہوا تھا جہاں اب تک اس کی اولاد بیسیوں کی تعداد میں موجود ہے، جیسا کہ پکھلی وال ترکوں کے شجرہ نسب سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کی قرابت داری کا سلسلہ موضع کا سلسلہ موضع بانڈہ پھگواڑیاں کے ایک گھرانے کے علاوہ مانکرائے، پھر ہاڑی، ٹرٹو پہ اور گیروال سے ملتا ہے۔

بانڈہ پھگواڑیاں:

سلطان مقرب خان حاکم دمہتوڑ کی شورش کے بعد جب پکھلی سرکار کے مختلف قبائل نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، تو اسی زمانے میں ۱۷۲۰ء کے لگ بھگ ترکوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر جدون قوم نے موضع دمہتوڑ پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد پکھلی سرکار میں درانیوں کی پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ درانی بھی ترکوں کے مخالف تھے، اس لئے ترک پریشانی کے عالم میں تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر بیر نگلی کے راستے کشمیر چلے گئے اور کچھ علاقہ رش کے بعض دیہات میں سکونت پذیر ہو گئے۔ صورت دیہی بانڈہ پھگواڑیاں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بانڈہ پھگواڑیاں میں دمہتوڑی ترکوں کے دو بزرگ ستیان ذکری اور سرفراز پہلے پہل آباد ہوئے۔

۱۸۱۸ء کے زمانے میں جب سکھوں کو ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار کے علاقے میں غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے ترکی پٹی مانکرائے کے ترکوں پر ظلم و ستم کی ابتدا کر دی۔ ۱۸۲۴ء میں سکھوں نے میدان ہزارہ قارلق کے چیدہ چیدہ مسلمان سربراہوں کو گرفتار کر کے ان کے سر توپ اڑا دیئے، لیکن ترک سکھوں کے قابو میں نہ آسکے اور مفرور ہو گئے۔ ان میں سے اکثر علاقہ غیر میں روپوش ہو گئے، لیکن موضع پھر ہاڑی سے سلطان بے نام کا اکلوتا بیٹا پہلے تو رجوعیہ چلا گیا اور پھر وہاں سے موضع بانڈہ پھگواڑیاں میں اپنے ماموں نوشیری کے پاس چلا گیا۔ نوشیری نے اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کر کے اسے اپنے پاس آباد کر دیا۔ سلطان بے نام کے اس بیٹے محمد شیر علی خان کی اولاد یہیں پھلی پھولی، لیکن ان میں سے بعض پھر پھر ہاڑی

واپس چلے گئے۔ راقم الحروف محمد شیر علی خان ہی کی اولاد میں سے ہے۔ والد مرحوم ۱۹۳۳-۳۴ء میں ہری پور میں آباد ہو گئے تھے۔

اس طرح بانڈہ پھگواڑیاں میں ترکوں کے تین خاندان آباد ہوئے۔ اب ان کی تعداد بیسیوں سے تجاوز کر گئی ہے۔ جب انگریزوں نے ایبٹ آباد کی چھاؤنی کو توسیع دی تو دوسرے لوگوں کی طرح ترکوں کو بھی اپنی قیمتی زمین سے ہاتھ دھونا پڑا اور سوائے انگریزوں کی چاکری کے ان کے لئے دوسرا چارۂ کار باقی نہ رہا۔ غربت اور افلاس کی بنا پر ان کے اکثر افراد کراچی، راولپنڈی اور ہری پور میں آباد ہو چکے ہیں۔ ان کی رشتہ داریاں پکھلی، موہار کلاں اور ترکی پٹی مانکرائے کے علاقے کے ترکوں سے قائم ہیں۔ کچھ عرصہ سے اس موضع میں ترکوں کے تین اور خاندان بھی آباد ہو چکے ہیں جو بقول ان کے کشمیری ترکوں کی اولاد میں سے ہیں، لیکن ان کے پاس قابلِ اعتماد شجرہ نسب موجود نہیں، اس لئے ان کا شجرہ نسب یہاں منسلک نہیں کیا جا سکا۔ سکھوں کے عہد میں رجوعیہ کے گاؤں سے ترکوں کا ایک اور خاندان بھی اسی گاؤں میں منتقل ہو گیا۔

شجرہ نسب ترکان باندہ پھگواڑیاں (دہمتوڑی)

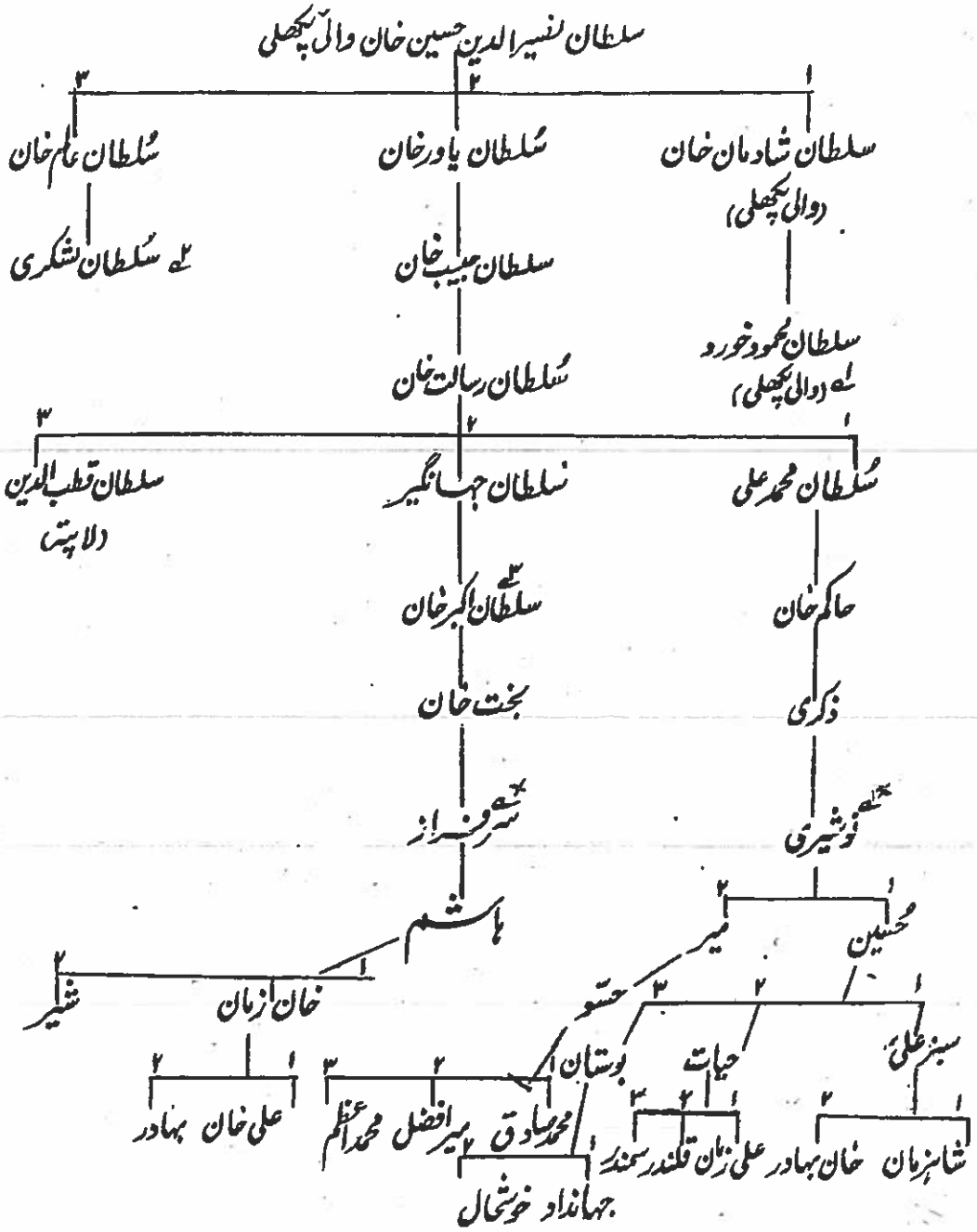

۱ سلطان محمود خورد کی اولاد مانکرائے، پھرہاڑی، باندہ، پھگواڑیاں، موہار کلاں اور گیروال میں آباد ہے۔

۲ سلطان لشکری کی اولاد بارہ مولا، کھولیاں اور گلی باغ میں آباد ہوئی۔ دیوان راجہ بابا کے مزار کے گدی نشین انہی کی اولاد میں سے ہیں۔

۳ سلطان اکبر خان دہمتوڑ کا آخری ترک حاکم تھا۔

* نوشیری اور سرفراز دہمتوڑ میں ترکوں کی خانہ جنگی اور اس پر جدونوں کے قبضے کے بعد باندہ پھگواڑیاں میں آکر آباد ہوئے۔

شجرہ نسب ترکان باندہ پھگواڑیاں (پکھلی وال)

سلطان محمود خورد والیٔ پکھلی

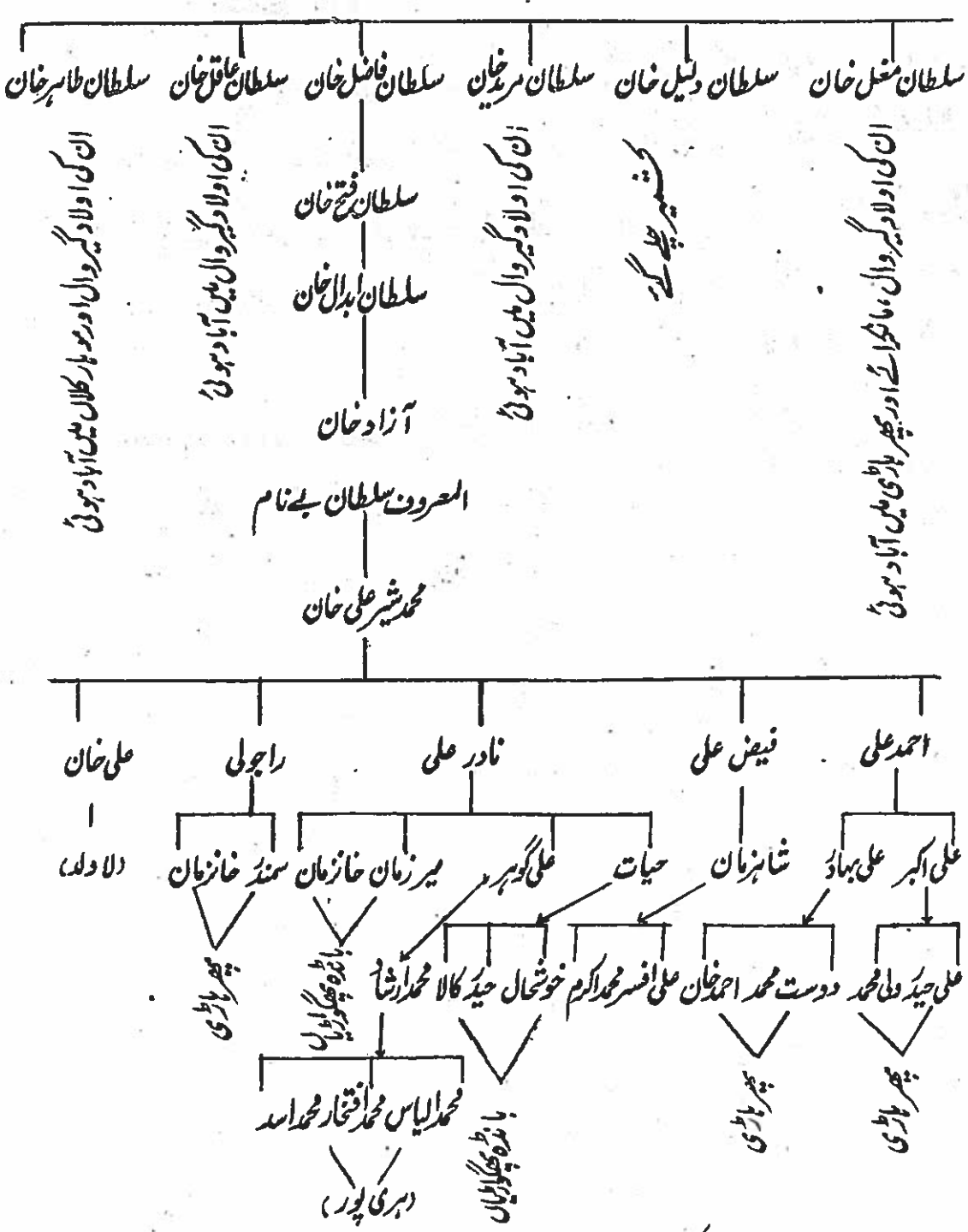

سلطان فاضل خان پکھلی سے سلطان پور (دوڑ) آئے۔

سلطان بے نام موضع مگری میں درانیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

محمد شیر علی خان پھر ہاڑی سے باندہ پھگواڑیاں منتقل ہوئے۔

بحالی:

سلطان محمود خورد والی پکھلی کے زمانے میں علاقہ تناول کے مرکزی مقامات دربند اور شیروان تھے۔ یہ مواضعات ترکوں نے اپنے ابتدائی دور میں آباد کئے تھے اور ان دونوں مقامات کے حاکم گلی باغ کے دارالریاست ہی سے مقرر کئے جاتے تھے۔ سلطان محمود خورد نے علاقہ تناول کے ان دونوں مرکزی مقامات پر اپنے دونوں بھائیوں مسمیان سلطان قیاس الدین اور سلطان سیوج المعروف سیج سلطان کو متعین کر دیا تھا۔ ترکوں کے مابین خانہ جنگی کے زمانے میں یہ دونوں بھائی اپنے اپنے علاقے میں خود مختار ہو گئے؛ چونکہ سلطان محمود خورد اس وقت شہید ہو چکا تھا اور ترک سلاطین زادے اس کی جانشینی کے مسئلے پر متفق نہ ہو سکے تھے، اس لئے سلطان قیاس الدین اور سیوج سلطان پر گلی باغ کی بالادستی باقی نہ رہی اور وہ اپنے اپنے علاقے میں من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ خانہ جنگی نے ترکوں کی کمر توڑ دی تھی اور ان کی کمزوریاں پوری طرح عیاں ہو گئی تھیں۔ عوام ترکوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں سلطان محمود خورد کے داماد سید جلال بابا نے سوات کے علاقے سے ایک سواتی لشکر کو ہمراہ لے کر گلی باغ کے دارالریاست پر قبضہ کر لیا اور بغیر کسی شدید مزاحمت کے پکھلی خاص کے علاقے کو سید جلال بابا، مراد خان اور سواتی لشکر نے آپس میں تقسیم کر دیا۔

۱۷۱۳ء میں سید جلال کے لشکر کی اس کامیابی کی خبر سن کر سندھ کے دوسرے کنارے اور مہابن کے علاقے کے تنولیوں نے بھی سرکار پکھلی کے علاقے میں پیش قدمی شروع کر دی۔ تنولیوں کی پہلی ضرب کا نشانہ سیوج سلطان بنا۔ دربند پر قبضہ کرنے کے بعد تنولی علاقہ تناول میں آگے بڑھتے چلے گئے، حتیٰ کہ انہوں نے سلطان قیاس الدین اور اس کی اولاد کو پکھلی خاص کے علاقے تک پیچھے دھکیل دیا۔ شیروان کا اہم قلعہ اور قصبہ بھی تنولیوں کے قبضے میں چلا گیا؛ چونکہ دمتوڑ اور مانکرائے کے ساتھ علاقہ تناول کے ترکوں کی عداوت تھی، اس لئے انہیں وہاں سے بھی کوئی کمک حاصل نہ ہو سکی۔ سیوج سلطان المعروف سیج سلطان لاپتہ ہو گیا تھا اور سلطان قیاس الدین تنولیوں کے ساتھ اسی کشمکش کے زمانے میں فوت ہو گیا۔ بہرحال اس کے بیٹوں نے تنولیوں سے کشمکش جاری رکھی، جو درانیوں کی آمد تک جاری رہی۔

صورتِ دیہی موضع بحالی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں اصالت خان نے آباد کیا تھا۔ اصالت خان سلطان قیاس الدین کا تیسرا پوتا تھا۔ ہزارہ گزیٹیر، تاریخ مصنفہ کیپٹن ویس اور تاریخ تناولیاں مصنفہ سید مراد علی شاہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تناول کا علاقہ تنولیوں نے آخری چغتائی عہد یعنی تسخیر گلی باغ کے بعد ترکوں سے بزورِ شمشیر چھینا تھا۔ بحالی کا موضع علاقہ تناول کے ترکوں کی بحالی کا مقام ثابت ہوا۔ اصالت خان اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں نے اسی مقام کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور نئے سرے سے تنولیوں سے کشمکش شروع کی۔ ترکوں نے اردگرد کے مواضعات پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد انہوں نے متیال، رہاڑ، حسینیاں، کرالہ، کریٹر، سرگال گھوگڑی کاکوٹ، پانڈو تھانہ، ملیار، تھاتھی، رچھ بہن، منڈرہ، سوہلن بالا اور ہلو بانڈی کے مواضعات تنولیوں سے آزاد کرالئے۔ یہ درانیوں کا زمانہ تھا اور زبردست خان المعروف صوبہ خان تنولی کو احمد شاہ ابدالی نے اپنی طرف سے حاکم تناول مقرر کر رکھا تھا۔ ادھر سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ بھی درانیوں ہی کی طرف سے اپنے علاقے کا مقرر کردہ حاکم تھا؛ لہٰذا ایسے کٹھن دور میں ترکوں کے لئے بحالی کا موضع آباد کرنا اور اس کے اردگرد کے علاقے میں از سرِ نو قدم جمانا بڑا صبر آزما اور مشکل کام تھا۔ بہر حال انہوں نے شدید کشمکش کے بعد بحالی کے علاقے کو فی الواقع ترکوں کی بحالی کا مقام ثابت کر دیا۔ اس علاقے میں ترکوں کا مشہور قلعہ موچی کوٹ کے مقام پر تھا۔ سکھوں کی آمد تک ترکوں نے شیروان اور مانسلگی کے درمیانی علاقے پر اپنی بالادستی قائم رکھی۔ ترکی پٹی مانکرائے کے علاقے کے بعد یہ دوسرا علاقہ تھا جو درانیوں کے عہد میں ترکوں کی ملکیت بنا رہا۔

صورتِ دیہی موضع بحالی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ اسلام یعنی پچھلی سرکار پر ترکوں کی حاکمیت کے زمانے میں اس موضع کو بالو نامی ایک کافر نے اوّل اوّل آباد کیا تھا، مگر نامعلوم اسباب کی بنا پر یہ موضع ویران ہو گیا اور اصالت خان نے اسے از سرِ نو آباد کیا۔

سکھوں کا زمانہ اہلِ اسلام اور بالخصوص ترکوں کے لئے بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ تمام مسلمان قبائل ایک دوسرے سے مشت و گریبان تھے۔ پچھلی سرکار یا میدانِ ہزارہ قارلق کے علاقے میں کوئی ایسی طاقت موجود نہ تھی جو سکھوں کا مقابلہ کر سکتی۔ درانی اپنی نااہلی اور داخلی انتشار کی وجہ سے روبزوال ہو چکے تھے اور میدان سکھوں کے غلبے کے لئے بالکل تیار تھا۔ سکھوں کی منظم فوج نے ۱۸۱۶ء میں میدانِ

ہزارہ قارلق پر قبضہ کر لیا اور پکھلی سرکار ان کے کشمیر فتح کرنے کے ساتھ آپ سے آپ سکھوں کے قبضے میں چلی گئی۔ سکھوں کی یلغار کے موقع پر ترکوں نے بحالی کے دفاع کی انتھک جدّ و جہد کی، لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اس لئے وہ وقتی طور پر بحالی سے نکل کر علاقہ مظفر آباد میں روپوش ہو گئے۔ جب سردار ہری سنگھ نلوہ نے پکھلی سرکار اور میدانِ ہزارہ قارلق پر قبضہ کر لیا، تو اس نے مظفر آباد سے ترکوں کو از سرِ نو بحالی میں آباد ہونے کی دعوت دی۔ ہری سنگھ نلوہ تھوڑے ہی عرصہ بعد موضع جاگل تحصیل ہری پور کے قریب مسلمانوں سے لڑتا بھڑتا ہوا زخمی ہوا اور پھر اسے پشاور تبدیل کر دیا گیا جہاں درانیوں نے اسے لڑائی کے دوران میں قتل کر دیا۔ ہری سنگھ نلوہ ہی کے زمانے میں دوبارہ ترکوں اور سکھوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ سکھوں نے ایک بار پھر بحالی پر چڑھائی کی اور اسے ویران کر دیا۔ سردار تیجا سنگھ کے زمانے میں ترکوں نے تیسری بار پھر بحالی کو آباد کیا اور اس کے بعد سکھ پھر اسے برباد نہ کر سکے۔

انگریزوں کے ابتدائی بندوبست کے زمانے میں ترکوں کو بعض دیہات کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا، مگر اس کے باوجود آٹھ دیہات کی ملکیت ان کے پاس باقی نہ رہی۔ درانیوں، سکھوں اور انگریزوں کے اسلام دشمن اور ترک دشمن اور دار گزارنے کے باوجود بحالی اور اس کے گرد و نواح کے مواضعات کے ترکوں میں ابھی تک خودداری، عزتِ نفس اور بہادری کے اوصاف موجود ہیں۔

چند پشتوں تک بحالی کے ترکوں کا شجرہ نسب مندرجہ ذیل ہے:

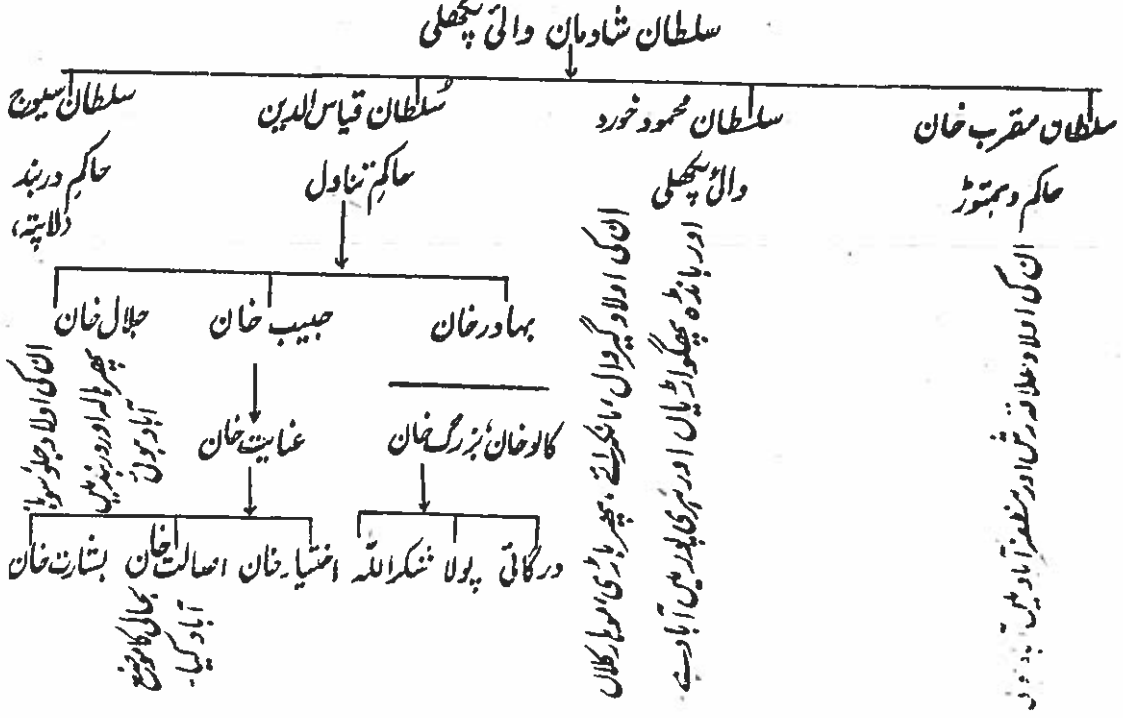

درگائی، پولا، شکراللہ، اختیار خان اور بشارت خان کی اولاد کثیر تعداد میں بحالی اور اس کے اردگرد کے مواضعات میں آباد ہے، ان میں سے ایک خاندان حسن ابدال میں بھی آباد ہے۔

گیروال :

یہ میدان پکھلی کا ایک قدیم موضع ہے۔ ہزارہ گزیٹیر اور تاریخ ہزارہ مصنفہ دیس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک صدیوں سے اس گاؤں میں آباد چلے آرہے ہیں۔ ۱۷۱۳ء میں جب ترکوں کی زمانہ جنگی کے بعد سید جلال بابا نے سواتی لشکر کے ساتھ گلی باغ پر قبضہ کیا، تو اس کے ساتھ ہی ترکوں کو یہ گاؤں بھی خالی کر کے ادھر اُدھر منتشر ہونا پڑا۔ سلطان محمود خورد کے دو بیٹے مسمیان عاقل خان اور مرید خان ترک خوانین کو ہمراہ لے کر قلعہ گلی باغ سے نکل کر درۂ کونش کے علاقے میں روپوش ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سلطان محمود خورد کا تیسرا بیٹا طاہر خان المعروف طاہری بھی ان سے جا ملا تھا۔ کچھ عرصہ تک یہ تینوں بھائی درۂ کونش ہی کے علاقے میں سکونت پذیر رہے۔ میدان پکھلی پر سواتی لشکر کے قابض ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ مراد خان، سید جلال بابا اور سواتی باشندے اراضیات کی تقسیم پر ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ ان کے باہمی تنازعات اتنے زیادہ ہو گئے کہ وہ پکھلی یا اس کے اردگرد بسنے والی اقوام کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہ کر سکے؛ چنانچہ ان کی باہمی کشیدگی کی اس فضا میں سلطان محمود خورد کے مندرجہ بالا بیٹوں نے ترکوں کی ایک چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ میدان پکھلی کا علاقہ اختیار کیا اور گیروال پر قبضہ کر لیا۔ سلطان محمود خورد کی اولاد میں سے رستم خان ایک بہادر نوجوان خوانین نے اس یلغار میں نمایاں کردار ادا کیا۔

درانیوں کا زمانہ ترکوں کے لئے ابتلا کا زمانہ تھا۔ سعادت خان اور گل محمد خان تنولی درانیوں کی طرف سے پکھلی خاص اور علاقہ تناول کے معاملات چلا رہے تھے۔ ابتدا میں ترکوں کے لئے درانیوں یا ان کے مقرر کردہ ان خوانین کے خلاف کوئی کارروائی کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں ان کے لئے باوقار زندگی بسر کرنا آسان نہ تھا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ ترک افراد گیروال کے علاوہ

دوگر، گرھی حبیب اللہ، بڑکوٹ، ہاتھی میرہ، دھڑیال، منور، ڈھوڈیال وغیرہ مواضعات میں آباد ہو گئے۔

گیروال ہی کے ترکوں میں سے ایک ترک بیوہ اپنے دو معصوم بچوں سمیت حضرت میاں کنگال صاحب کی رہنمائی میں دھتوڑ کے قریب موضع موہار کلاں میں آباد ہوئی تھی۔ فی الحال موضع گیروال میں سلطان محمود خورد کے مندرجہ بالا تینوں بیٹوں کی اولاد آباد ہے۔ جب میں ان کا شجرہ نسب ملاحظہ کرنے کے لئے موضع گیروال پہنچا، تو انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میری آؤ بھگت کی، لیکن ان کے چہروں سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ان میں ترک خون کی کمی واقع ہو چکی ہے؛ ان کی رشتہ داریاں زیادہ تر ان کے اردگرد بسنے والے سواتیوں سے ہیں؛ البتہ ان کی یہ بات قابل داد ہے کہ صدیوں کے انقلابات کے باوجود انہوں نے اپنا شجرہ نسب محفوظ رکھا ہے۔ آج کل اس موضع کے ترکوں کی معتبر شخصیتیں محمد فرید خان، محمد اسلم خان نمبردار، ریہ، شراب خان ولد رسول خان، محمد یونس ولد باز خان اور خوشحال خان ریٹائرڈ تھانیدار ہیں۔

موضع گیروال کے ترکوں کا چند پشت تک کا شجرہ نسب یہ ہے:

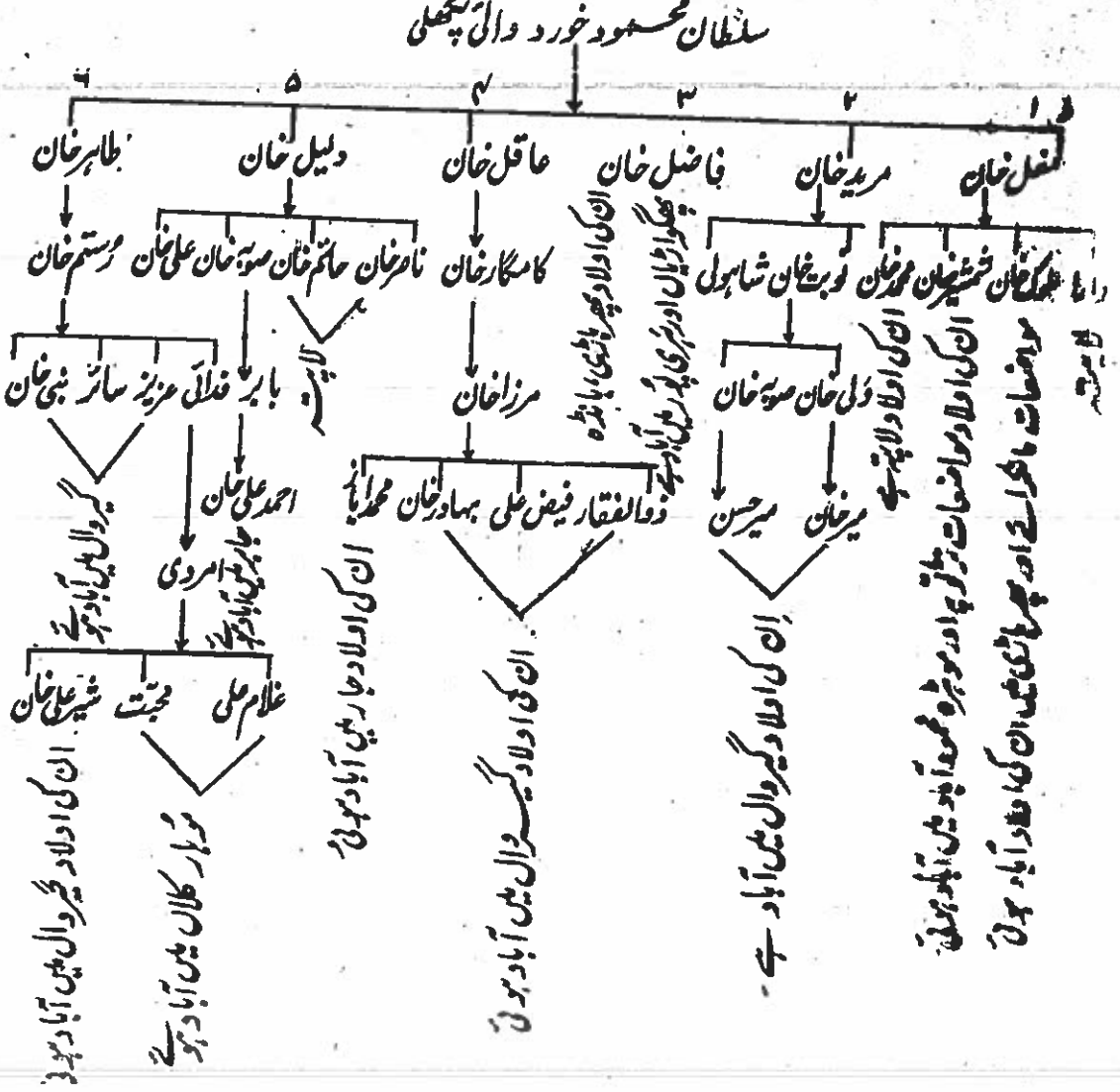

ضلع ہزارہ کے مندرجہ بالا دیہات کے علاوہ ۱۸۷۲ء کے گزیٹیر اور تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق ترکوں کے بعض خاندان منور، گڑھی حبیب اللہ، میران ہلی، سربند، ہاتھی میرہ، دھڑیال، ڈھوڈیال، سوہلن ترلی، رچھ بہن، لبڑکوٹ، پسوال، حال میرا ترلا، جلالیہ، جو گھمار، نیلور، لونگال، کھوکری، تلہاڑ چتیری، دربندی، مکھن، کمکہ، کھرالہ، چیڑا، چونیا، بھرالہ، لونگال، موہڑی ملیا، پینیاں، بکہ، سرائے نعمت خان، پنڈ خانخیل، علی میرہ، بھرڑے، چھتڑی اور ترنوائی میں بھی آباد ہیں۔ گزشتہ ایک سو سال کے طویل عرصے میں مزید نقل مکانی ہوتی رہی اور ترک کئی دوسرے مواضعات میں آباد ہو گئے۔

❖

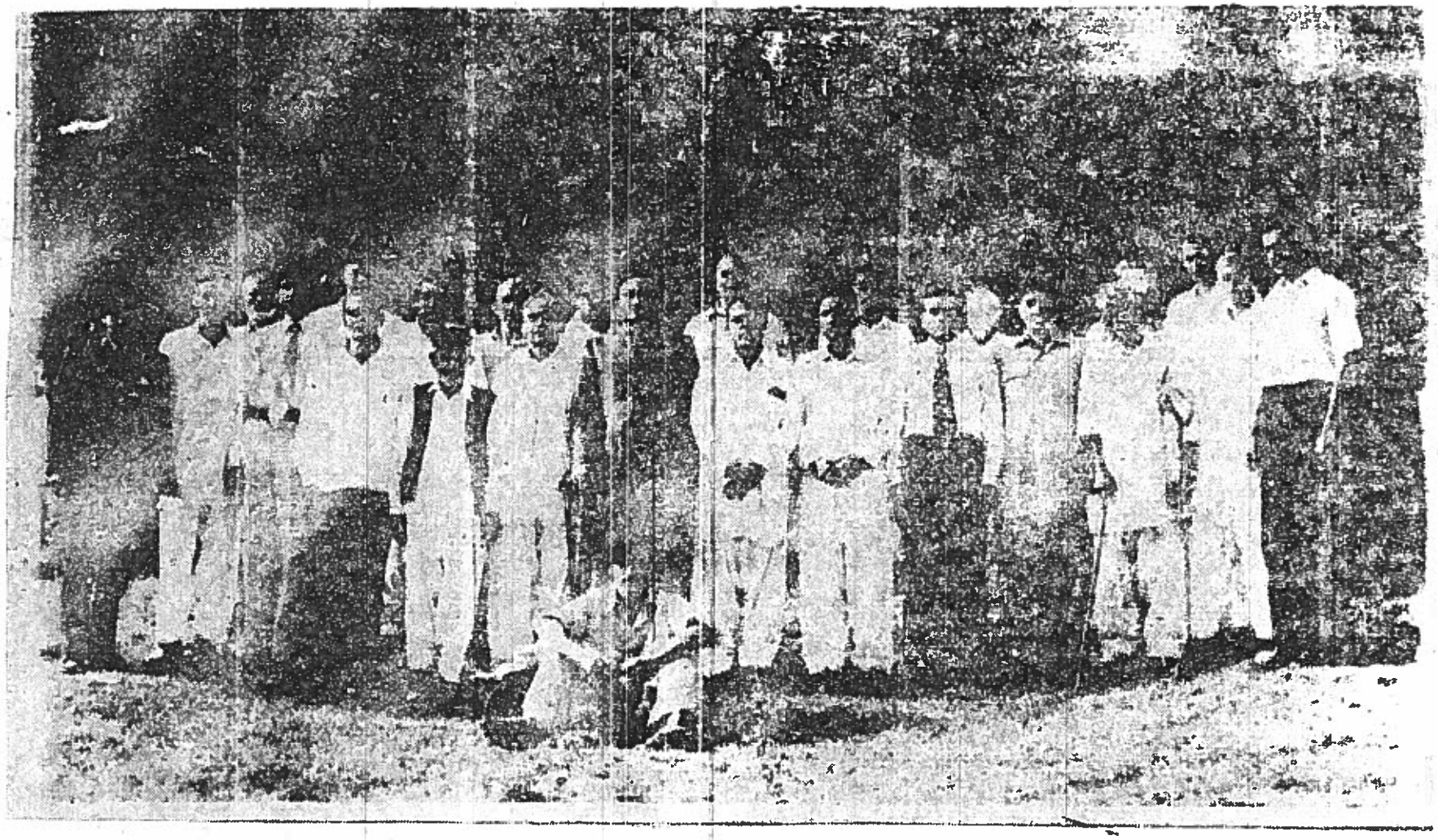

ترکانِ تیموری کا ایک نمائندہ وفد مصنف کے ہمراہ قلعہ گلی باغ کی عدالت کے سامنے

ضلع ہزارہ کے مندرجہ بالا دیہات کے علاوہ ۱۸۷۲ء کے گزیٹیر اور تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق ترکوں کے بعض خاندان منور، گڑھی حبیب اللہ، میران ہلی، سربند، ہاتھی میرہ، دھڑیال، ڈھوڈیال، سوہلن ترل، رچھ بہن، لبڑکوٹ، پسوال، حال میراترلا، جلالیہ، جو گھمار، نیلور، لونگال، کھوکری، تلہاڑ چتیری، دربندی، مکھن، کمکہ، کہرالہ، چیڑا، چونیا، بھرالہ، لونگال، موہڑی ملیا، پینیاں، بکہ، سرائے نعمت خان، پنڈ خانخیل، غلی میرہ، بھرڑے، چھتڑی اور ترنوائی میں بھی آباد ہیں۔ گزشتہ ایک سو سال کے طویل عرصے میں مزید نقل مکانی ہوتی رہی اور ترک کئی دوسرے مواضعات میں آباد ہو گئے۔

٭

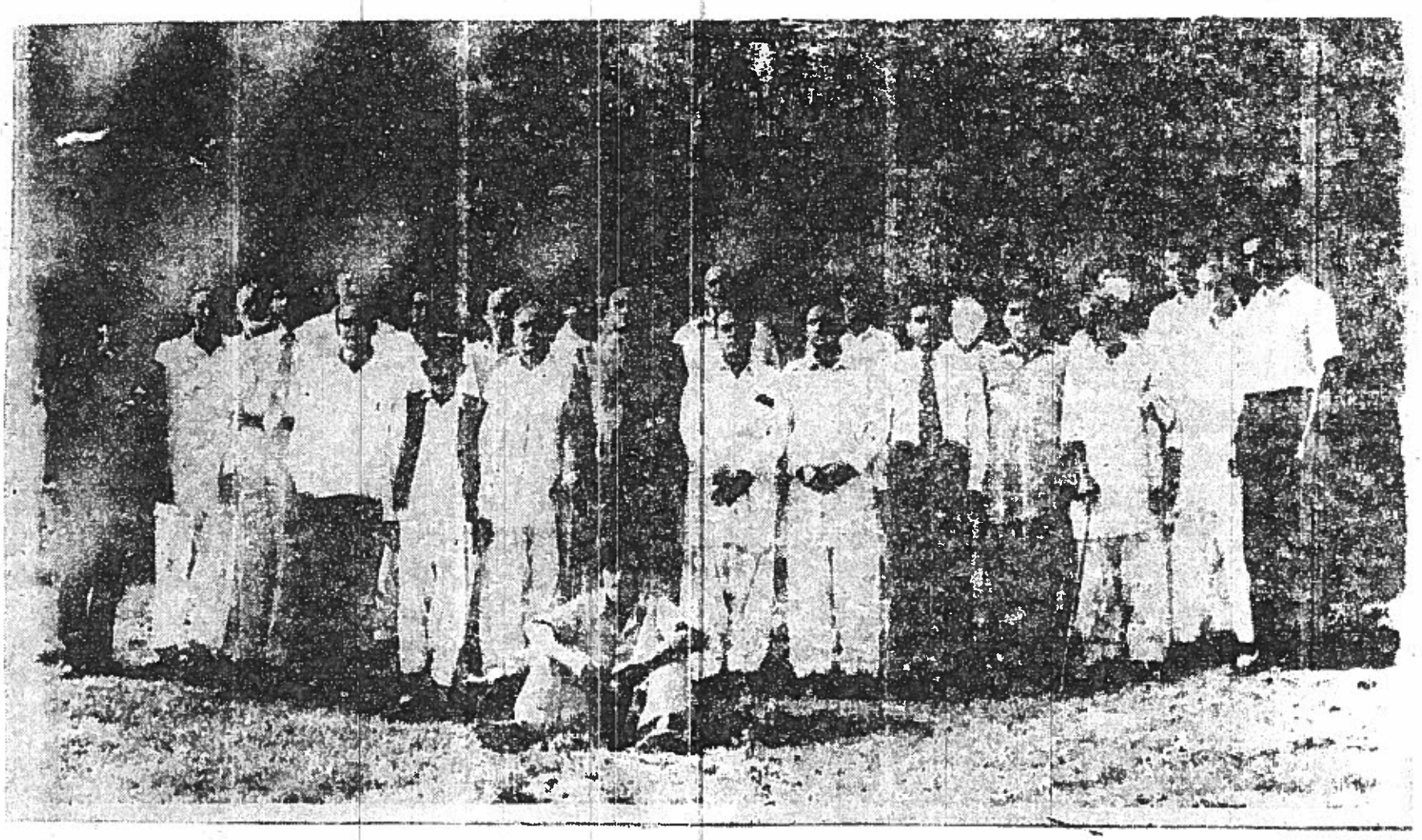

ترکانِ تیموری کا ایک نمائندہ وفد مصنف کے ہمراہ قلعہ گلی باغ کی عدالت کے سامنے

ہجرتِ کشمیر

یوں تو کشمیر میں ترکوں کی خاصی تعداد صدیوں سے آباد چلی آرہی ہے۔ ان کے مختلف خاندانوں کو میر، مغل، خواجہ اور سوغونچی وغیرہ جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے، لیکن یہاں ہمارا مقصد ان ترکوں کی نشاندہی کرنا ہے جن کا تعلق ولایت پکھلی کے پکھلی وال اور دہتوڑی ترکوں سے ہے اور جو ترکوں کی ناجنگی یا عہدِ عالمگیری کے آخری حصے کی بغاوت کے زمانے میں پکھلی اور دہتوڑ سے نکل کر کشمیر چلے گئے تھے۔

۱۷۱۳ء میں سید جلال بابا کے سواتی لشکر نے گلی باغ پہ اور اسی زمانے میں بمبہ قوم کے سلطان قاسم نے علاقہ مظفرآباد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد تنولی اور جدون علاقہ تناول اور دہتوڑ پر قابض ہو گئے تھے اور ترکوں کو منتشر ہونا پڑا تھا؛ چونکہ اس وقت تک کشمیر میں مغل صوبیدار اور دیگر افسر حکمرانی کر رہے تھے، اس لئے پنجاب اور پختون علاقے میں پناہ گزیں ہونے کی بجائے بعض ترکوں نے کشمیر میں ہجرت کر جانا زیادہ مفید خیال کیا۔ جو ترک کشمیر چلے گئے یا آزاد کشمیر کے بعض پہاڑی علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان میں دہتوڑی بھی تھے اور پکھلی وال بھی۔ اب تک انہیں انہی ناموں سے پکارا جاتا ہے اور ان کی زبان بھی ہندکو ہی ہے۔ کشمیر کے علاقے میں اب تک ان ترکوں کی بستیاں مندرجہ ذیل دیہات موجود ہیں:

۱۔ ٹریڈورہ تحصیل بارہ مولا

۲۔ نیلاسر تحصیل بارہ مولا

۳۔ مائیاں تحصیل بارہ مولا

۴۔ کرناہ تحصیل بارہ مولا

۵۔ کڈارا تحصیل سرینگر
۶۔ آپتھ ناڑ تحصیل سرینگر
۷۔ نونمئی تحصیل پہلگام
۸۔ دچھنیاں تحصیل بارہ مولا
۹۔ موراہ تحصیل اوڑی
۱۰۔ پرنگل تحصیل اوڑی
۱۱۔ شوائی تحصیل مظفرآباد
۱۲۔ چھانجل تحصیل مظفرآباد
۱۳۔ ڈوبہ تحصیل مظفرآباد
۱۴۔ گائی پورہ تحصیل مظفرآباد
۱۵۔ چھانجہ تحصیل مظفرآباد
۱۶۔ گڑھی دوپٹہ تحصیل مظفرآباد
۱۷۔ بٹنگی تحصیل مظفرآباد
۱۸۔ دراوہ تحصیل مظفرآباد
۱۹۔ سنواڑیاں آزاد کشمیر
۲۰۔ سیری۔ آزاد کشمیر
۲۱۔ لیپا۔ آزاد کشمیر

موجودہ ہزارہ اور آزاد کشمیر کے ترکوں کے بعض خاندان، حصولِ روزگار کے سلسلے میں ٹیکسلا، راولپنڈی اور کراچی مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ کتاب ہذا کی تکمیل کے بعد میں نے ہزارہ کے مشہور ترک خاندانوں کے معزز افراد کو سیاحتِ گلی باغ کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ یہ حضرات گزشتہ دو تصاویر میں راقم الحروف کے ہمراہ گلی باغ کے تاریخی مقام پر کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔ توبہ و استغفار اور دعائے مغفرت کے بعد قلعہ کی اسی عمارت میں بیٹھ کر ترکوں کی ایک غیر سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ امید ہے کہ یہ تنظیم مستقبل میں ان کی فلاح و بہبود کے لئے نمایاں کردار سر انجام دے گی۔

مصنف کا شجرہ نسب

مدار[illegible] گوہر خان بن نادر علی خان بن محمد شیر علی خان بن آزاد خان المعروف سلطان بے نام بن سلطان [illegible]ل خان بن سلطان فتح خان بن سلطان فاضل خان بن سلطان محمود خورد والی پکھلی۔

شجرہ نسب سلاطین پکھلی

سلطان محمود خورد بن سلطان شادمان خان بن نصیر الدین سلطان حسین خان بن سلطان محمود کلاں، بن سلطان غیاث الدین عبداللہ خان بن فقیر الدین دریا خان بن سلطان شہاب الدین بابر بن سلطان عمر مرزا بن سلطان ابوسعید بن سلطان محمد بن میراں شاہ بن صاحبقران امیر تیمور کورگان بن امیر طرا غائی بن امیر برکل بن النگیر بہادر بن ایجل نویاں بہادر بن قراچار نویاں بہادر بن سوغوچیجین بن ایرادمچی برلاس بن قاچولی بہادر بن تومنائی خان بن بایتینفر خان بن قاندو خان بن دوتمین خان بن بوقاقان بن بوزنجر بن الانقوا بن ساجوتہ بہادر بن یلدوز خان بن منگلی خواجہ بن تیمور تاش بن قیان بن ایلخان بن تنگیز خان بن منگلی خان بن یلدوز خان بن آیی خان بن کن خان بن اوغوز خان بن قرا خان بن مغل خان بن النجہ دوم بن کیوک بن دیپ باقوی بن النجہ اول بن ترک بن یافث بن نوح علیہ السلام بن شاک المعروف بن لمک بن متوسلح بن حنوک بن سیرہ بن مہلائیل بن قنیان بن انوش بن شیث علیہ السلام بن آدم علیہ السلام۔

گزشتہ اوراق میں بیان کئے گئے اکثر ترک خاندانوں کا شجرہ نسب ولایت پکھلی کے مشہور ترک حکمران سلطان محمود خورد یا اس کے باپ دادا میں سے کسی ایک کے ساتھ جا ملتا ہے۔ میں نے اپنے خاندانی شجرہ نسب کا مشہور کتب تاریخ میں بیان کئے گئے شجروں سے مقابلہ و موازنہ کیا ہے۔ ابوالفضل نے بڑی محنت اور احتیاط سے تیموریوں کا شجرہ نسب اکبر نامہ کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ یہ شجرہ نسب الغ بیگ مرزا اور رشید الدین کے بیان کردہ شجروں کے مطابق ہے، لیکن ابوالفضل کو غالباً الانقوا (۲۷) کے باپ کا نام نہ مل سکا اور اس کی بجائے اس نے "حضرت قدسی مآب عصمت جناب" کے الفاظ درج کر دیئے ہیں، جبکہ ہمارے خاندانی شجرہ نسب میں الانقوا کے باپ کا نام ساجوتھ بہادر لکھا ہوا ہے، مگر اس سے اوپر کے سلسلہ نمبر پر ابوالفضل نے جو بینہ بہادر کا نام بھی لکھا ہے جو ہمارے خاندانی شجرے میں موجود نہیں۔ بہر حال میں نے اس کتاب کے ساتھ اپنا وہی خاندانی شجرہ نسب منسلک کرنا مناسب سمجھا جو اپنے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ اس ایک غلطی کے علاوہ ولایت پکھلی کے سلاطین کے مندرجہ بالا شجرہ نسب اور تمام معتبر کتب تاریخ میں بیان کئے گئے آلِ تیمور کے شجروں میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے؛ البتہ ترکی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر بعض شجرہ نویسوں سے ہجوں کی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں، مثلاً حنوک (نمبر ۵۲ جسے بائبل نے حضرت ادریس علیہ السلام قرار دیا ہے) کا نام کچھ لوگوں نے "خنوخ" لکھ رکھا تھا اور اس کے بیٹے متوسلح کا نام متشلخ لکھ دیا تھا۔ قاچولی بہادر کا نام بعض جگہ قجولائی بہادر اور تومنائی خان کا نام تومنہ خان بھی لکھا ہوا ہے۔ بعض شجروں میں بوزنجر کے نام کے ساتھ قآن کے لفظ کا اضافہ موجود ہے اور بعض کے ساتھ نہیں۔ بعض شجرے ایسے بھی ہیں جو ترکی کے علاوہ مغولی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے لب و لہجہ میں خاصا فرق موجود ہے، اس لئے اُردو یا فارسی زبانوں میں شجروں کو نقل کرتے وقت بعض الفاظ کے حروف بدلتے رہے ہیں۔

آلِ تیمور کے ناموں کے اندراجات میں بھی کچھ لوگوں کو مغالطہ لگا ہے، مثلاً ابوسعید سلطان کے کل گیارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام عمر مرزا، دوسرے کا نام عمر شیخ مرزا اور تیسرے کا نام سلطان مرزا تھا۔ آلِ تیمور کے نام بسا اوقات ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اور ان کی یہی مماثلت بعض اوقات مغالطے کا سبب بنی۔ اسی وجہ سے کچھ لوگوں نے غلطی سے عمر شیخ مرزا اور عمر مرزا کو ایک ہی فرد سمجھ لیا اور اس طرح سلاطین پکھلی کو بھی عمر شیخ مرزا کی اولاد تصور کر لیا جو حقیقتاً غلط تھا۔ اتفاق سے عمر شیخ مرزا کے

بیٹے کا نام بابر تھا اور عمر مرزا کے بیٹے کا نام بھی بابر تھا، اس لئے یہ دو نام مزید مغالطے کا سبب بنے۔ بابر ابن عمر مرزا فی الحقیقت سلاطین پکھلی کا جدِ امجد تھا اور اس نے شہاب الدین کے لقب سے ولایتِ پکھلی پر حکمرانی کا آغاز کیا تھا، جبکہ بابر ابن عمر شیخ مرزا ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی تھا اور اس نے ظہیر الدین بابر کے لقب سے ہندوستان میں حکمرانی کا آغاز کیا تھا۔ ظہیر الدین بابر اپنی تحریروں میں عموماً اپنے ان چار چچاؤں کا ذکر کرتا ہے جو اس کے حقیقی چچا تھے اور جنہیں ابوسعید سلطان نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مفتوحہ ممالک میں سے بعض کو حکمرانی کا منصب عطا کر رکھا تھا، لیکن تاریخ فرشتہ اور دیگر قدیم کتب میں ابوسعید سلطان کے بیٹوں کی کل تعداد گیارہ لکھی ہوئی ہے جن میں سے ایک شہاب الدین بابر کا باپ عمر مرزا تھا۔ بعض شجرہ نویسوں سے یہ غلطی بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے سلاطینِ پکھلی کے بعض القابات اور ان کے اصل ناموں کو دو بھائی یا باپ بیٹا تصور کر لیا ہے، مثلاً غیاث الدین عبداللہ خان کو غیاث الدین اور عبداللہ خان دو بھائی سمجھ لیا گیا۔ اسی طرح شہاب الدین بابر کو دو بھائی یا باپ بیٹا تصور کر لیا گیا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں ولایتِ پکھلی کا سلطنتِ مغلیہ سے الحاق ہوا تھا۔ قبل ازیں سلاطین پکھلی یہاں آزاد حکمرانوں کی حیثیت سے حکمرانی کر رہے تھے؛ لہٰذا انہوں نے اپنے لئے غیاث الدین، شہاب الدین اور نصیر الدین جیسے القابات رکھے ہوئے تھے، لیکن سلطنتِ مغلیہ سے الحاق کے بعد یہ شاہی القابات ترک کر دیئے گئے۔

مندرجہ بالا شجرہ نسب کی صحت معلوم کرنے کے لئے میں نے محافظ خانہ مال میں ترکوں کے مشہور دیہات کی صورتِ دیہوں اور شجرہ نسب مالکان دیہات کا بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان تمام دیہات کا بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان تمام دیہات کا دورہ کیا جن میں ترکوں کے شجرے محفوظ تھے جیسا کہ تمہید میں عرض کر چکا ہوں یہ دیہات ایک دوسرے سے بہت دُور تھے اور ان میں مقیم ترکوں کا دوری کی وجہ سے ایک دوسرے سے کوئی ربط بھی باقی نہ رہا تھا، اس لئے یہ محال تھا کہ اس زمانے میں ان کے بزرگ باہم مل کر ایک مصنوعی شجرہ تصنیف کر ڈالتے۔ حالت یہ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی ان کے درمیان بہت تھوڑا رابطہ موجود ہے؛ چنانچہ محافظ خانہ مال سے حاصل کئے ہوئے شجروں کا ان خاندانی شجروں سے اور پھر ان سب کا کتب تاریخ میں بیان کئے گئے شجروں سے مقابلہ و موازنہ کرنے کے بعد میں نے پورے اعتماد کے ساتھ مندرجہ بالا شجرہ نسب درج کیا ہے اور مجھے اس کی صحت میں کوئی اشتباہ نہیں رہا۔

آج کل بالعموم پشتوں کا حساب ابن خلدون کے نظریے کے مطابق چار پشت فیصدی کے حساب سے لگایا جاتا ہے، لیکن یہ نظریہ ازمنۂ قدیم کے لوگوں کے لئے ٹھیک طور پر لاگو نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوا کرتی تھیں مشہور روایت اور حدیث نبوی کے ذریعے ہمیں یہ معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو برس عمر پائی تھی، اسی طرح مشہور روایت یہ بھی ہے کہ ترکوں کے جدّ امجد ترک اوغلان نے دو سو چالیس برس عمر پائی تھی؛ لہٰذا پرانے زمانے کے لوگوں کی عمروں کا اوسط چار پشت فیصدی کے حساب سے نکالنا درست نہیں۔ یہ حساب آخر الزمان کے لوگوں ہی کے لئے درست ثابت ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ قدیم انسانوں کی ہڈیوں کی سائنسی تحقیقات سے متاثر ہو کر اس شجرہ کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جدید سائنسی تحقیقات ابھی نامکمل ہیں، اس لئے ہم ان کے بھروسے پر فی الحال کسی تاریخی شجرہ نسب یا بائبل اور تلمود جیسی کتب میں بیان کئے گئے شجروں کو مسترد کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فہرست مآخذ

۱۔ کتاب الہند البیرونی

۲۔ طبقات ناصری مؤلفہ جزجانی

۳۔ طبقاتِ اکبری

۴۔ تاریخ فرشتہ اُردو ترجمہ نول کشور ۱۸۸۶ء

۵۔ منتخب التواریخ ملوک شاہ بدایونی ترجمہ محمود احمد فاروقی پبلشرز غلام علی اینڈ سنز لاہور

۶۔ توزکِ تیموری اُردو

۷۔ توزکِ بابری انگریزی ترجمہ لیفٹیننٹ کرنل ایف جی ٹالبوٹ، اُردو ترجمہ رشید اختر ندوی

۸۔ اکبرنامہ ابوالفضل

۹۔ آئین اکبری اُردو ترجمہ مولوی فدا علی صاحب جامعہ عثمانیہ دکن ۱۹۳۹ء

۱۰۔ سیر المتاخرین مطبع نول کشور لکھنؤ

۱۱۔ توزکِ جہانگیری اُردو ترجمہ سلیم واحد سلیم مجلس ترقی ادب لاہور

۱۲۔ شاہجہان نامہ محمد صالح کنبوہ مجلس ترقی ادب لاہور

۱۳۔ منتخب اللباب مصنفہ خافی خان نظام الملک اردو ترجمہ محمود احمد فاروقی

۱۴۔ مآثر الامرا جلد اول، دوم، سوم صمصام الدولہ شاہنواز خان اردو ترجمہ از پروفیسر محمد ایوب قادری اُردو بورڈ لاہور

۱۵۔ سلطنتِ مغلیہ کا مرکزی نظام اُردو بورڈ لاہور

۱۶۔ مآثر عالمگیری مصنفہ محمد ساقی مستعد خان وقائع نگار اورنگ زیب عالمگیر

۱۷۔ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ دانش گاہ پنجاب

۱۸۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخ اسلام ولیم ایل لینگز ترجمہ غلام رسول مہر

۱۹۔ تاریخ کشمیر محمد دین فوق ۱۹۱۰ء لاہور

۲۰۔ آئینۂ حقیقت نما از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی طبع نفیس اکیڈمی

۲۱۔ تاریخ ہزارہ مرتبہ کیپٹن ویس مہتمم بندوبست ۷۲-۱۸۷۰ء

۲۲۔ ہزارہ گزیٹیر ۸۴-۱۸۸۳ء پنجاب گورنمنٹ

۲۳۔ دی پٹھان مصنفہ سر اولف کیرو سابق گورنر سرحد Caroe

۲۴۔ یوسف زئی پٹھان مؤلفہ اللہ بخش یوسفی ناشران محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی اقبال کالونی تین ہٹی کراچی ۵

۲۵۔ آرکیولاجیکل سروے رپورٹس از جنرل کننگھم Cunningham

۲۶۔ دی پنجابی مسلمان مصنفہ لیفٹیننٹ کرنل وائکلی Wikely ٹوڈ

۲۷۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا از سمتھ Smith

۲۸۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا ایشوری پرشاد Ishwori Parashad

۲۹۔ تاریخ ہند از ایلیٹ Elliot

۳۰۔ تاریخ بخارا آرمینس ویمبرے پروفیسر پرتھ یونیورسٹی ترجمہ نفیس الدین مجلس ترقی ادب لاہور

۳۱۔ ترکستان ڈاؤن ٹو منگول انویژن بارتھولڈ، آر جے گب ۱۹۲۸ء R.J.-GIBB

۳۲۔ دی آرکیولاجیکل میوزیم اینڈ مانومینٹس آف اینشنٹ ٹیکسلا ۷ ایڈیشن ۱۹۷۰ء

۳۳۔ عالمگیر نامہ محمد کاظم مطبوعہ ۱۸۶۸ء

۳۴۔ افغانستان اے بریف سروے جے ڈی احمد ایم اے عزیز، ۲ اندرابی کابل، ۱۹۳۴ء

۳۵۔ ابن بطوطہ ٹریولز ان ایشیا اینڈ افریقہ انگریزی ترجمہ ایچ آر گب دی براڈوے ٹریولرز، لنڈن

۳۶۔ دی پنجاب انڈر دی مغلز مصنفہ محمد اکبر ایم اے رپن پریس لاہور

۳۷۔ رقعات عالمگیری اردو ترجمہ سید نجیب اشرف ندوی شمس بریلوی، مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

۳۸۔ کنگڈم آف کابل مصنفہ آنریبل ماؤنٹ سٹورٹ الفنسٹن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۷۲ء

۳۹۔ تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ ترجمان القرآن لاہور

۴۰۔ آکسفورڈ اٹلس